دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

جولائی 2020

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37-اردو بازار کراچی

امتحان لیتی ہے محبت

ایم الیاس

محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی، محبت صرف کی جاتی ہے چاہے دوسرا کرے نہ کرے۔ محبت ایک ہاتھ کی تالی ہوتی ہے اس میں نہ شکوے کی گنجائش ہوتی، نہ شکایت کی، نہ وفا کی شرط، نہ بے وفائی کی۔ محبت لین دین نہیں ہوتی۔ صرف دین دین ہوتی ہے۔ محبت ایک فطری جذبہ ہے جو قسمت والوں کو ملتا ہے۔ محبت دلوں کو گرماتی ہے۔ زندگی دیتی ہے۔ محبت کسی کو پالینے کا نام نہیں۔ محبت امتحان لیتی ہے۔
محبت میں جو قربانی دیتا ہے وہی عظیم کہلاتا ہے۔ دو دوستوں نے محبت کی خاطر ایثار کیا، محبت کا امتحان دیا۔ ان میں کون عظیم رہا یہ فیصلہ قارئین کو کرنا ہے۔

ایک ہی لڑکی سے محبت کرنے والے دو نوجوان کا ایثار

دوسری اور آخری قسط

"میں نے تو آپ کو ایک عام لڑکی سمجھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ایک نایاب، انمول اور قیمتی ہیرا ہیں ...... ایک ایسا ہیرا جسے مل جائے وہ دنیا کا خوش قسمت ترین شخص بن جائے اور اس کی چمک سے اس کی ساری زندگی منور رہے گی ...... معلوم نہیں وہ کون بد بخت تھا جس نے آپ کو اس ذلیل شخص کے ہاتھ فروخت کیا تھا...... جہنم میں جھونکنے کی کوشش کی تھی۔

"کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے آپ اسے کھا لینا...... باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔" میں نے کرسی کھینچ کر اس کے پاس رکھ دی۔ پھر ایک رکابی اس کی طرف بڑھائی۔ پھر میں بستر پر جا بیٹھی۔ کیوں کہ کمرے میں صرف اکلوتی کرسی تھی۔

اس نے میرے ہاتھ سے رکابی لے کر میری طرف متعجب نظروں سے دیکھا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"کیا آپ روٹی نہیں کھائیں گی؟ ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے؟"

"پہلے آپ کھا لیں اس کے بعد میں کھا لوں گی۔" میں مسکرا دی۔ "بھوک تو اتنی ہے لیکن اتنی زور دار نہیں کہ برداشت نہ ہو سکے۔"

سعود نے بستر کی چادر پر اخبار پھیلا کر اسے دستر خوان بچھا دیا اور اس پر کھانے کے برتن رکھ کر بولا۔

"اب آپ بھی آ جائیں ...... ہم دونوں مل کر روٹی کھائیں گے...... مجھے اکیلے کھاتے ہوئے اچھا تھوڑی معلوم ہوگا۔"

کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں نے برتن سمیٹے تاکہ انہیں دھو کر رکھ دوں۔ وہ کھانے کے دوران میرے ہاتھ کے کھانے کی دل کھول کر تعریف کرتا رہا تھا۔ اس نے برتن باورچی خانے تک پہنچانے میں میری مدد کی اور باورچی خانے میں پہنچ کر دنگ رہ گیا تھا۔ وہ حیرت سے دیکھتا رہا۔ چند ماہ تک جائزہ لینے کے بعد اس نے بے اختیار ہو کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ انہیں چومتے چومتے کسی خیال سے رک گیا۔

"اللہ...... آپ کو اور ان ہاتھوں کو نظر لگنے سے بچائے۔" اس نے یہ کہہ میرے ہاتھ چھوڑ دیے۔

میرا خیال اور انداز درست نکلا۔ اس کی تعریف کے کلمات نے مجھے لجا دیا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں کمرے میں پلنگ پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان کس قدر فاصلہ تھا لیکن جیسے دلوں میں کوئی فاصلہ نہ رہا تھا۔ اب مجھے اس اجنبی شخص سے کوئی ڈر اور خوف نہ رہا تھا۔ اس لیے کہ میں اسے اچھی طرح جان چکی تھی۔ میں نے اسے اپنی آپ بیتی سنائی۔ کوئی بات نہیں چھپائی۔ کیوں کہ چھپانے والی کوئی بات بھی نہیں تھی۔

اس نے بڑے غور اور دھیان سے میری کہانی سنی۔ چند لمحوں کے بعد کہا۔

"سچ پوچھیے تو ان کم بختوں نے آپ جیسے انمول، ہیرے کی بڑی ناقدری کی...... آپ کی قیمت پانچ لاکھ تو کیا پچاس لاکھ بھی کم ہے۔ آپ کی کوئی قیمت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی دے سکتا ہے۔" اس نے توقف کر کے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی اور پھر میرے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے کہنے لگا۔ "اگر آپ میری اس بات کا برا نہ مانیں تو ایک بات عرض کروں جو بڑی گستاخانہ ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو دل سے زبان پر آنے کے لیے بے چین ہے...... آپ کا حسن لاجواب ہے۔ مثالی ہے قدرت نے جس فیاضی سے آپ کو خوب سیرتی سے نوازا ہے آپ کو تو کسی گھر کی رانی ہونا چاہیے تھا۔"

"سعود صاحب......!" میں اک دم سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میری ہنسی رات کی خاموشی میں جل ترنگ کی طرح بج اٹھی تھی۔ "آپ مجھے زمین پر ہی رہنے دیں۔ آسمان پر نہ پہنچائیں۔ میری ماں بڑی حقیقت پسند عورت تھی۔ محلے اور پڑوس کی لڑکیاں اور عورتیں جب میرے حسن کی تعریف کرتی تھیں تو وہ مجھ سے کہتی تھیں کہ تم اپنی حیثیت مت بھولو، جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب نہ دیکھا کرو...... خواب فریب دیتے

ہیں...... دغاباز ہوتے ہیں ۔غریب کی حسین بیٹی جاڑے کی چاندنی ہوتی ہے ۔اوپر نہیں نیچے دیکھا کرو۔ میں اتنی بدنصیب ہوں کہ مجھے کہاں پناہ ملے گی میں خود نہیں جانتی ہوں۔"
سعود میرے قریب آ گیا۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو اس کے لہجے سے سنجیدگی تھی۔
"اگر میں ساری زندگی کے لیے آپ کا ہاتھ تھامنا چاہوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا......؟"
یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے مسعود کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑوانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ہاتھ کا لمس بڑا لطیف سا تھا...... مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ لمس میرے سرے بدن میں ایک گہرے جذبے کا سرور بن کر اترتا جا رہا ہے۔ میں نے اپنا سر کسی دلہن کی مانند جھکا لیا اور نظریں نیچی کر لیں۔ میری خاموشی میری رضامندی تھی۔ مسعود تو میرے لیے گھپ اندھیرے میں روشنی مشعل تھا۔ تھا بھلا میں اپنی زبان سے انکار کا لفظ کیسے نکال سکتی تھی۔ دل اندر سے کہہ رہا تھا...... قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔
"مجھے کوئی اعتراض نہیں ...... انکار نہیں ہے۔" میں نے حیا آلود ہوتے ہوئے بڑی آہستگی سے جواب دیا۔
"ویسے آپ جذباتی نہ بنیں۔ آپ نے میرے حسن سے متاثر ہو کر جو فیصلہ کیا ہے کل کہیں ایسا نہ ہو کہ کل آپ کو پچھتانا نہ پڑے...... آپ پھر ایک بار اچھی طرح سے سوچ لیں۔" میں نے رک رک کر غیر جذباتی لہجے میں کہا۔
"مجھے پچھتانا کیوں اور کس لیے پڑے گا؟" اس نے حیرت سے کہتے ہوئے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"اس لیے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں؟ آپ میرے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے ہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "آپ نے میری جن سنی سنائی باتوں پر یقین کیا وہ غلط بھی تو ہو سکتی ہیں۔"
"آپ کوئی بھی ہوں میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "البتہ آپ کو میرے بارے میں پوری طرح معلوم کرنے کا حق ہے کہ میں کون ہوں؟ کس قماش کا ہوں؟ میں نہیں چاہتا کہ ایک عورت کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر اس سے شادی کر لوں ...... کیوں کہ یہ بات جبر وزیادتی والی ہوگی ...... اگر کل ایسا الزام میری ذات پر عائد ہوا تو یہ بات میرے لیے بڑے شرم اور ذلت کی ہوگی ......اور آپ مجھے کبھی بھی نہیں بخشیں گی۔"
"آپ عورت کو نہیں جانتے اور شاید آپ کو نہیں معلوم کہ عورت اپنے سینے میں مرد کے لیے کتنا بڑا دل رکھتی ہے۔ اور کس انداز سے سوچتی ہے۔" توقف کر کے میں نے اپنا جھکا ہوا سر اور پلکوں کی چلمن اٹھا کے اسے منجمد نظروں سے دیکھا۔ "اس کی ذات سے جو مرد منسوب ہوتا ہے اور وہ جسے ایک بار قبول کر لیتی ہے اور اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ اگر وہ برا بھی ہوا تو اسے اپنے سر کا تاج سمجھ لیتی ہے اور اس کے پیر کی جوتی بن جاتی ہے۔ اور پھر آپ تو میرے محسن ہیں آپ نے میری عزت و آبرو ایک لٹیرے سے بچائی ہے اور پھر آپ ایک ایسی لڑکی کو سہارا دے رہے ہیں جس کے بارے میں آپ کچھ بھی تو نہیں جانتے ہیں؟"
"ہیرا...... ہیرا ہی ہوتا ہے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔ "اس کی خوبی اور اصلیت تو پہلی نظر میں معلوم ہو جاتی ہے۔ ہیرے کی ایسی آب و تاب صورت کے ظاہری حسن میں نہیں اس کی سیرت میں ہوتی ہے آپ کی سیرت کی آب وتاب نے میری آنکھیں چکا چوند کر دی ہیں۔ میں آپ کو اپنا کر دنیا کا خوش نصیب ترین شخص بن جاؤں گا۔"
"کل آپ کو اگر میرے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے جسے میں اصلی ہیرا سمجھا وہ نہ صرف نقلی ہیرا ہے۔ داغ دار ہے۔ تب آپ کیا کریں گے؟"
"مجھے آپ کے ماضی سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کیسا ہی گھناؤنا کیوں نہ ہو۔" مسعود نے کہا۔ "میں تو آپ کو محض آپ کی سیرت کی وجہ سے قبول کر رہا ہوں۔ جس عورت کا ماضی داغ دار ہو وہ ایسی سیرت کی مالک ہو ہی نہیں سکتی۔"

”آپ کتنے عظیم ہیں۔“ میں نے متاثر ہو کر جذباتی لہجے میں کہا۔ میں اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میں آپ کو اپنے بارے میں پوری سچائی سے بتا دینا چاہتا ہوں۔“ سعود کہنے لگا۔ ”تاکہ مجھے اپنانے سے پہلے آپ میرے ماضی اور میرے بارے میں پوری طرح واقف ہو جائیں۔ میں بھی اس دنیا میں آپ ہی کی طرح اکیلا ہوں...... نہ تو میرے ماں باپ ہیں اور نہ ہی بھائی بہن...... تھوڑے بہت رشتہ دار ہیں جو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میں ان لوگوں سے دور بھاگتا ہوں۔ ان کے اور میرے درمیان ایک فاصلہ ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے کبھی بھی میرے کٹھن وقت میں میرا ساتھ نہیں دیا بلکہ وہ میری حالت میں ہنستے، تمسخر اڑاتے اور مجھے ایسا دیکھتے تھے جیسے میں کوئی حقیر شخص ہوں۔ مجھے تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہی نہیں بلکہ ایک جنون تھا۔ میں نے انٹر تک تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک کپڑے کے کارخانے میں چار برس تک ملازمت کی۔ ایک معقول رقم پس انداز کی اور یہ گاڑی قسطوں پر خرید لی اور میں نے دن رات گاڑی چلا کر ساری اقساط ادا کر دی۔ اس طرح میں نے قرض کے بوجھ سے نجات حاصل کر لی۔ اب مجھ پر ایک روپیا قرض بھی نہیں ہے۔ اب میرے پاس ایک معقول رقم پس انداز ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی گھر ہے۔ جو مجھے ورثے میں ملا ہے۔ اگر میری زندگی میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو وہ ایک عورت کی ہے۔ میری زندگی جو خلا ہے اسے ایک عورت کی محبت اور رفاقت ہی پر کر سکتی ہے۔ کیا آپ ایسا کر سکتی ہیں کہ زندگی کے اس طویل سفر میں آپ میرا ہاتھ تھام لیں۔

”کیوں نہیں؟ کیوں نہیں؟“ میں نے اپنی پلکوں کی چلمن اٹھا کر اسے دیکھا اور اگلے لمحے اسے گرا لی۔ میں نے جواب دینے میں لمحہ بھر تامل کیا اور بولی۔ ”میرے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ آپ مجھے ان کٹھن حالات میں سہارا دے رہے ہیں میری زندگی اور خالی جھولی میں خوشیاں بھر رہے ہیں۔ میں اپنی خوش قسمتی پر جتنا نازاں ہوں کم ہے...... حیران بھی ہوں کہ صرف ایک گھنٹہ پہلے میں کتنی بدنصیب، بے سہارا اور بدبخت تھی کہ دنیا سے دل اچاٹ ہونے لگا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہوں۔“

”یہ خواب سے کہیں حسین حقیقت ہے۔“ سعود نے کہا۔ ”میں کل نکاح پڑھوا کر ایک نئی اور خوش گوار زندگی کا آغاز کر سکتا ہوں۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ کس لیے؟“ میں نے حیا آلود ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے آپ کی کسی بات سے انکار تو نہیں کیا؟ آپ جس دن، جس لمحہ اور جس گھڑی کہیں میں تیار ہوں۔“

”سعود نے میرا چہرہ نظروں میں جذب کرتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔“

”میں چاہتا ہوں کہ ہماری شادی بڑی دھوم دھام اور روایتی انداز سے ہو۔ یوں بھی ایک عورت کی خواہش ہوتی ہے اور اس کے بڑے دلی ارمان اس کی شادی باعزت طریقے سے ہو۔ وہ اس کے خواب دیکھتی رہتی ہے۔ کیا آپ اس طرح نہیں چاہتی ہیں۔“

میں اس کی بات کا کیا جواب دیتی صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

سعود نے جو کچھ کہا اس کا ایک ایک لفظ درست تھا۔ مگر میرے ذہن میں مختلف ان گنت خیالات کی یلغار ہو رہی تھی۔ یہ شادی دھوم دھام اور روایتی انداز سے کس طرح ہو سکتی ہے؟ سعود کا کون ہے؟ میرا کون ہے؟ وہ جو جس طرح شادی کا خواب دیکھ رہا ہے۔ اسے کس طرح پورا کر سکتا ہے۔ اس نے کہنے کو تو بڑی آسانی سے یہ بات کہہ دی۔ اس نے مختلف پہلوؤں کے بارے میں سوچا کیوں نہیں؟ ہم دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

آج کی رات تو اس گھر میں آپ جیسے تیسے کاٹ لیں۔ کل صبح ہوتے ہی آپ کو فرخ باجی کے ہاں پہنچا دوں گا۔ فرخ باجی اس محلے میں رہتی ہیں...... وہ میرے عزیز ترین دوست عدنان کی والدہ ہیں۔ وہ ایک شفیق عورت ہیں۔ محلے میں انہیں سبھی

فرخ باجی کہتے ہیں اور بڑا احترام اور عزت کرتے ہیں۔ آپ شادی ہونے تک اس گھر میں رہیں گی۔ شادی کی تیاریاں بھی اسی گھر میں ہوں گی آپ کے اخراجات میرے ذمے ہوں گے اور آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے بغیر کسی جھجک اور تکلف کے مانگ سکتی ہیں اس لیے کہ ہمارے درمیان اب کسی قسم کی کوئی غیریت نہیں رہی اور میں آپ کو ہر ماہ ایک ہزار روپے جیب خرچ دیا کروں گا۔"

"لیکن میں ہر ماہ ایک ہزار روپے جیب خرچ لے کر کیا کروں گی؟" میں ہنس کر بولی۔ "مجھے کون سا باہر نکلنا خرچ کرنا ہے۔"

"اپنی پسند اور خواہش کی چیز خرید لیا کریں...... فرخ باجی شاپنگ پر لے جایا کریں تو شاید کب اس کی ضرورت محسوس ہو۔"

"شادی کے بعد آپ ہزار نہیں دو تین ہزار روپے بھی دے دیں تو لے لوں گی بلکہ پانچ چھ ہزار بھی مانگ لیا کروں گی۔" میں نے سرخ ہو کر شوخی سے کہا۔ "آپ جب کہ تمام اخراجات برداشت کر رہے ہیں تو یہی میرے لیے بہت ہیں۔ میں ابھی سے آپ کو زیر بار کرنا نہیں چاہتی۔ اللہ آپ کی کمائی میں خیر و برکت دے۔ آمین یوں بھی میری ماں نے مجھے کفایت شعاری کی تربیت دی ہوئی ہے۔ وہ کہتی تھیں کہ یہ بھی ایک ہنر ہے۔ جس سے گھریلو زندگی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ کبھی تنگی محسوس نہیں ہوا کرے گی۔"

"آمین ثم آمین۔" سعود نے مجھے شوخ نظروں سے دیکھا۔ "بیوی ہو تو ایسی...... ابھی سے آپ کو ہمارا کتنا خیال ہے۔ شادی ہونے اور دس بارہ بچوں کے بعد بھی ہمارا بجٹ متاثر نہیں ہوا کرے گا؟ ان شاء اللہ......"

"دس بارہ بچے......؟" میرے منہ سے غیر ارادی نکل گیا۔ میں شرم و حیا سے سرخ ہو کر گٹھڑی بن گئی۔

"جی ہاں...... اس کے بغیر گھر میں رونق کہاں ہو گی......؟" وہ ہنس پڑا۔ "گھر ایسا بھرا بھرا اور بچوں سے اتنا پیارا لگے گا کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔"

کچھ دیر بعد میں اس کمرے میں اکیلی تھی۔ سعود باہر چارپائی پر لیٹا ہوا تھا جو صحن میں پڑی تھی۔ میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا۔ لیکن میں نے چٹخنی نہیں لگائی۔ کیوں کہ میں اس مرد کی فطرت اور مزاج سے اتنے عرصے خوب واقف ہو چکی تھی جیسے میں اس کے ساتھ برسوں گزارتی آ رہی ہوں۔ اس پر مجھے اپنے آپ سے زیادہ اعتماد اور بھروسا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے درندہ صفت انسان بن چکا تھا۔ ایک مرد کے لیے کچھ مشکل نہ ہوتا کہ تنہائی میں ایک مجبور، بے بس اور کمزور عورت کو تنہائی میں پورا پورا فائدہ اٹھالے۔ یوں بھی وہ ایک عام قسم کا مرد نہیں تھا۔ نہ صرف وجیہہ، دراز قد بلکہ کسرتی بدن کا مالک تھا۔ میں اس کی کسی حرکت، قبیح فعل اور خواہش سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر میں چیخ و پکار کر کے محلے والوں اور پڑوسیوں کو اکٹھا کرتی تو وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ بدکار عورت ہے جو میرے ساتھ رات بسر اور بڑی رقم مانگ رہی تھی میں نے انکار کیا تو ایک ہنگامہ کھڑا کر رہی ہے۔ لوگ اس کی بات کا یقین کر لیتے کیوں کہ وہ برسوں سے اس محلے میں رہ رہا تھا اس کے کردار اور چال چلن سے بخوبی واقف تھے۔ گو رات بہت زیادہ بیت چکی تھی۔ میں سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نہ صرف نڈھال ہو رہی تھی اور بہت تھکی ہوئی تھی۔ میں بستر پر پڑے پڑے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ڈھلتی دنوں کا چاند تھا جو بہت دیر سے نکلا تھا اور کھڑکی کی سلاخوں سے جھانک رہا تھا۔ اس کی زرد زرد روشنی میں میرا وجود نہا رہا تھا۔ انگ انگ نمایاں تھا۔ آج میں کیسے طوفان کی زد میں رہی۔ ایک مٹی کا دیا تھا۔ طوفان کے تھپیڑے اس مٹی کے دیے کو بجھانے کی کوشش کر رہے تھے جب آنٹی نے مجھے دلہن بنایا اور میرے یہاں تک پہنچنے کے واقعات فلم کے سنسنی خیز مناظر کی طرح نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے پھر میں نے سعود کے بارے میں سوچا کیا سعود کی ذات میری زندگی کے خلا کو پر کر دے گا؟ کیا ایک اچھا شوہر ثابت ہو گا؟ کیا مسعود واقعی ایک اچھا مخلص اور ایک

نیک انسان ثابت ہوگا؟ میں نے اس کے انتخاب میں کوئی غلطی اور بھول تو نہیں کی؟ میں نے ساری زندگی جواس کا ہاتھ تھامنے کا وعدہ کیا کہیں یہ فیصلہ ایسا جذباتی تو نہیں ہے کہ مجھے بعد میں پچھتانا پڑے گا؟ پھر میرے پاس آنسوؤں کا خزانہ رہ جائے گا۔ پھر میں نے اپنے دل کو تسلی دی۔ سمجھایا کہ آخر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں کیا کرتی؟ کہاں جاتی؟ کوئی اور صورت اور راستہ بھی تو نہ تھا۔ اگر مسعود یوں اچانک اور غیر متوقع دخل اندازی نہ کرتا اب تک میرا سب کچھ لٹ چکا ہوتا۔ میں دوکوڑی کی ہو کر رہ جاتی۔ وہ درندہ مجھے حیوان سمجھ کر جانے کیا کیا فعل اور حرکتیں کرتا رہتا؟

دن بھر کے واقعات پر میں بڑے کرب اور اذیت سے غور کر رہی تھی جو کسی سنسنی خیز ناول کے مناظر کی طرح میری زندگی میں پیش آئے تھے۔ یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا مگر یہ خواب نہ تھا بلکہ ایک تلخ اور بھیانک حقیقت تھی۔ قدرت نے مجھے ایک بہت بڑی مصیبت کے دلدل سے نکال کر انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ یہ اس کا کرم اور احسان تھا۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کی شکر گزار تھی۔ میں اس کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ ادا ہی نہ ہو۔

معلوم نہیں کب میری آنکھ لگی تھی۔ علی الصباح میری آنکھ کھلی تو چڑیوں کی چہکار سنائی جو فضا میں گونجتی بڑی سہانی اور بھلی دے رہی تھی۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ خاصی دیر تھی۔ فجر کی نماز کا وقت تھا۔ میں نے جلدی سے وضو کیا تاکہ نماز کا وقت نہ نکل جائے۔ پھر بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہو گئی۔ اس نے مجھ پر جو کرم کیا تھا اسے یاد کر کے میرا دل بھر آیا تو میری آنکھیں آنسوؤں کے سیلاب کو روک نہ سکیں میرے دل کو طمانیت اور روح کو ایک عجیب سا سکون مل رہا تھا جو مجھے ہر نماز میں ملتا تھا۔ میں اپنی ماں کی موت پر بھی اتنا نہیں روئی جتنا اس وقت روئی تھی۔

جب اللہ کے حضور خوب رو چکی تو دل کی ساری بھڑاس نکل گئی۔ میرا وجود بہت پرسکون ہو گیا اور میرے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہوتے گئے۔

اب دل و دماغ پر کوئی بوجھ نہیں رہا۔ نماز سے جو دل کو تقویت ملتی ہے وہ کسی اور امر سے ممکن نہیں ہے۔

مسعود تو گہری نیند سو رہا تھا۔ باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے اس کی چارپائی کے قریب سے گزری تو غیر ارادی طور پر ایک لمحے کے لیے ایسے رک گئی جیسے میرے پیر میں زنجیریں ڈال دی گئی ہوں۔ اس کی پیشانی اور سر کے بالوں پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نماز پڑھ کے سویا ہو۔ مسعود کے چہرے پر گہری طمانیت اور معصومیت چھائی ہوئی تھی۔ میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کے لیے بے شمار دعائیں نکل رہی تھیں۔ پھر میرے دل کے نہاں خانوں میں اس کے لیے پیار کا امرت ابھر گیا تھا۔ میں اسے بغور دل تھام کے دیکھتی رہی۔ شاید اور دیر تک دیکھتی رہی۔ من چاہ رہا تھا کہ اسے صدیوں تک محبت بھری نظروں سے دیکھتی رہوں پھر لمحے کے لیے جی میں آیا کہ اس کے چہرے پر جھک جاؤں۔ اپنے بوسے اس کے چہرے، ہونٹوں اور پیشانی پر ثبت کرتی رہوں۔

گہری نیند میں سوتے ہوئے اس کے سراپا میں ایک ارتعاش ہوا تو میں فوراً باورچی خانے کی طرف لپک گئی کہ اس نے بے دار ہو کر مجھے کھڑے دیکھ لیا تو جانے کیا سوچے؟ کیوں دن کا اجالا بھی ہونے لگا تھا وہ کسی لمحے بھی اچانک بیدار ہو سکتا تھا۔

باورچی خانے میں گھس کر میں نے ناشتے کی تیاری شروع کر دی۔ دو پراٹھے کا آٹا گوندھ کر رکھ دیا۔ اس لیے کہ ڈبل روٹی بھی موجود تھی جو رات مسعود لیتا آیا تھا۔ میں نے چولھے پر چائے کا پانی چڑھایا اور باہر آ کر مسعود کو آواز دے کر جگایا۔ وہ اک دم سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا مجھے دیکھ کر مسکرا دیا تو میں نے اسے سلام کیا۔ اگلے لمحے وہ بستر سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔

''اوہ...... آپ جاگ گئیں اور صبح بھی ہو گئی۔'' اس نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ میں آپ سے پہلے جاگ جاؤں گا۔ میں فجر کے وقت جاگ جاتا ہوں۔ نماز پڑھ کے تلاوت کرتا ہوں۔ پھر سوتا نہیں ہوں۔ رات تہجد پڑھ کر نماز

فجر تک جاگتا رہا تھا اس لیے گہری نیند سو گیا۔ اگر آپ بیدار نہیں کرتیں شاید دو پہر تک سوتا رہتا۔"
اس نے توقف کیا تو اس کے لبوں پر یک دل آویز مسکراہٹ ابھر آئی تو اس نے میرا چہرہ اپنی نظروں کی گرفت میں لے کر بولا۔
"کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ رات میں بہت دیر سے کیوں سویا؟ مجھے دیر تک نیند کیوں نہیں آئی؟"
میں نے نفی کے انداز میں سر ہلا دیا۔ میں جان گئی تھی میری فکر اور پریشانی نے اس کی نیند اڑا دی۔ خاموش رہی۔ وہ اک دم سے ہنس پڑا۔
"اس لیے کہ آپ نے مجھے رات بھر سونے نہیں دیا تھا۔ رات بھر میں آپ کے تصور میں کھویا آپ سے باتیں کرتا رہا تھا جناب......!"
میں شرم سے سما گئی۔ میری زندگی میں پہلی بار کسی مرد کے پیار میں ڈوبے الفاظ نے میرے کانوں میں رس گھولا تھا۔ وہ میرے قریب آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اس میں شوخی ابھر آئی ہے۔ اس کا موڈ بڑا خوش گوار ہو رہا تھا۔ اس نے ایک انگلی سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی تو میرا چہرہ اس کی نظروں میں سما گیا۔ میرے لبوں پر کسی دلہن کی آواز کی سی لرزش سی تھی۔ جو سہاگ رات اپنے پیا سے باتیں کرتے وقت ہوتی ہے۔ پھر وہ دوسرے لمحے سنجیدہ سا ہو گیا۔
"دردانہ......!" اس نے مجھے اس لمحہ آپ لکیے بجائے تم کے تخاطب سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں نے تمہیں بنانے میں بڑا وقت صرف کیا ہے۔ پھر تمہیں آب کوثر میں نہلایا ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے اپنی زندگی میں تو کیا خواب میں تم جیسی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔ بلاشبہ تم سینکڑوں، ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک ہو۔"
میں چند لمحے تو حیا سے گھٹڑی بنی کھڑی رہی۔ ان تعریفی الفاظ مجھے سرتاپا سرخ کر دیا تھا۔ پھر میں بہ دقت تمام بول پائی لیکن لہجہ شوخ ہو گیا۔
"شاعری کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔ اگر ناشتا کرنا ہے تو جلدی سے تیار ہو لیں۔"
وہ مسکراتا ہوا غسل خانے کی طرف بڑھا تو میں باورچی خانے میں گھس گئی۔ میں نے پہلے پراٹھے بنائے۔ باقی انڈوں کا آملیٹ بنایا۔ رات کی بچی ہوئی دال گرم کی۔ توے پر تیل تھا تو تین چار سلائس سینک لیے۔ پھر چائے بنائی۔ ان سب کو ٹرے میں سجا رہی تھی تو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی میری پشت پر کھڑا میری حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہا ہے۔ سعود کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔
میں نے ان ڈستے خیالات سے متوحش ہو کر پلٹ کر دیکھا۔ وہ سعود ہی تھا۔ وہ مجھ سے دو قدم پیچھے کھڑا تھا۔ دہلیز پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اگر وہ میرے قریب پشت پر کھڑا ہوتا تو اس کی سانس میری گردن کو گرما دیتی۔ اس کی مسکراہٹ مجھ پر نچھاور ہو رہی تھی۔
میں نے شرما کر ٹرے دونوں ہاتھوں میں اٹھالی اور دروازے کی طرف بڑھی تو وہ تو اپنی جگہ اسی طرح کھڑا رہا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے راستہ نہیں دیا تو میں سمجھی کہ شاید وہ من مانیاں کرے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
"پہلے تو میں یہ کہتا اور سمجھتا تھا کہ عورت کے حسن کا ایک ہی روپ ہوتا ہے۔ وہ زرق برق لباس پہن کر محفلوں میں خوب صورت اور دل کش لگتی ہے......مگر آج معلوم ہوا کہ عورت کے کئی ان گنت روپ ہوتے ہیں۔ آپ کام کرتے ہوئے بھی کسی قدر حسین دکھائی دے رہی ہیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اسی طرح کھڑا ہو کر آپ کو کام کرتا ہوا دیکھتا رہوں۔ اس طرح کہ صدیاں گزر جائیں۔ کاش! میں شاعر ہوتا اپنے ان جذبات کو شاعری میں ڈھال کر آپ کے سامنے پیش کر سکتا؟"
"لگتا ہے کہ آپ کو بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔ "اس لیے آپ کو شاعری کی سوجھ رہی ہے۔" پھر ہم دونوں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ ناشتے کے دوران سعود نے کہا۔
"ناشتے سے فراغت پانے کے بعد میں آپ کو فرخ باجی کے ہاں لے جاؤں گا۔ انہیں ہر بات سچ سچ بتا دیتا ہے۔ ان سے کوئی بات چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں......وہ بڑی مخلص ہی نہیں بلکہ نیک دل اور سیدھی

سادی عورت ہیں۔ایسی نرم مزاج کی محبت کرنے والی ہیں کہ وہ آپ کو اپنی سگی ماں کی طرح لگیں گی۔ وہ اپنی ساری ماتا آپ پر نچھاور کردیں گی۔"

"میں خود بھی یہی چاہتی کہ ایسی شفیق طبیعت کی مالک عورت سے کوئی بات بھی نہ چھپاؤں۔" میں بولی۔ "آپ نے مجھے سچ بولنے کی تاکید کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا کردیا۔ میرے دل میں جو خلش پھانس بن کر گڑھی ہوئی تھی وہ نکل گئی۔"

میں نے توقف کر کے چائے بنائی۔ چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے جھجکتے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو ایک زحمت دینا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے دو تین سوتی جوڑے لادیں۔ یہ لباس تو مجھے رات سے کاٹ رہا ہے۔"

"اس میں بھلا زحمت کی کیا بات ہوئی؟" وہ مسکرایا۔ "وہ مسکرایا۔ "پہلے آپ کو فرخ باجی کے ہاں چھوڑ دوں گا۔ پھر بازار جا کر دو تین جوڑے خرید کر لا دوں گا۔"

"اس لباس اور اس حالت میں میں فرخ باجی کے ہاتھ نہیں جاؤں گی؟" اس نے مجھے حیرت اور سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں بولی دن کا وقت ہے گلی اور محلے کے لوگ مجھے دیکھیں گے؟ انہیں شک ہو جائے گا۔ سارے محلے میں چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی اور ہم بدنام ہو جائیں گے...... کیا ایسا نہیں ہوگا؟"

"آپ محلے داروں کی فکر اور پروانہ کریں...... یہ لوگ بہت اچھے ہیں اور پھر میرے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ میں نے آج تک کسی کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ ان لوگوں کی نظروں میں میرا کردار بہت اچھا اور پاکیزہ رہا ہے۔"

"آپ کی بات اپنی جگہ سو فیصد درست ہے لیکن ذرا یہ بھی تو سوچیں کہ یہ معاملہ ایک عورت اور مرد کا ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ ان کی ذہنیت سے آپ مجھ سے زیادہ واقف ہوں گے؟ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"آپ کو دنیا والوں کے بارے میں بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔" وہ مجھے دلاسا دینے لگا۔ "آپ فکر مند اور قطعی پریشان نہ ہوں۔ آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ میں ابھی بازار جا کر کپڑے خرید کر لاتا ہوں۔"

اس نے میرے سراپا پر ایک نظر ڈالی جیسے سائز اور ناپ کا اندازہ کر رہا ہو۔

"میں آپ سے ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں۔" میں نے قدرے تذبذب سے کہا۔

"ایک کیا دس باتیں کہیں...... تامل اور تذبذب سے کام نہ لیں۔" وہ بولا۔

"کہیں زمان نے آپ کے خلاف پولیس میں رپورٹ تو درج نہیں کرادی ہو؟" میں نے اپنا خوف ظاہر کیا۔

"کون زمان......؟" سعود نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے زمان کے بارے میں بتاتی وہ اک دم سے چونکا اور اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"وہ مردود جو آپ کا نام نہاد شوہر بنا تھا اور آپ کو ایک طرح سے اغوا کر کے لے جانا چاہتا تھا؟"

"جی ہاں۔" میں نے سر ہلایا۔ "وہ کمینہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہیں ہوگا؟ اس نے سب سے پہلے یقیناً پولیس اسٹیشن کا رخ کیا ہوگا؟ آپ کے خلاف بڑی سخت اور جھوٹی رپورٹ درج کرائی ہوگی۔"

"آپ اس خبیث کی چنداں فکر نہ کریں اور نہ ہراساں اور خائف ہوں۔" مسعود مجھے تسلی دینے لگے۔ "وہ آپ کا تو کیا میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ آخر وہ پولیس کے پاس کیا منہ لے کر جائے گا؟ اگر اس نے ہم دونوں کے خلاف رپورٹ درج بھی کرائی تو اسے الٹا ذلت و پریشانی اٹھانی پڑے گی...... اس لیے کہ آپ ایک عاقل و بالغ اور خود مختار لڑکی ہیں۔ آپ کا اس کے صرف ایک بیان اسے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں برسوں کے لیے دھکیل سکتا ہے۔ اس کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ اس طرح انکل اور آنٹی بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے...... ان

میں۔۔۔کوئی بھی پولیس کے پاس جانے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اگر کسی وجہ سے یہ حماقت کی تو اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوگا۔ انہیں لینے کے دینے پڑجائیں گے۔"

سعود نے میرے دل کو جو ڈھارس تھی اس نے میرے دل سے ان جانے خوف کو نکال پھینکا جو کسی پھنکارتے زہریلے سانپ کی طرح ڈس رہا تھا۔ میرے سر سے چٹان کا سا بوجھ اتر گیا تھا۔ زمان کے خیال نے میرے وجود کو دہلایا ہوا تھا کہ کہیں کوئی بڑی مصیبت نہ کھڑی ہوجائے۔

سعود نے بازار جاتے وقت مجھ سے کہا۔ "میں باہر سے تالا لگا کر جارہا ہوں۔"

"اس لیے کہ کہیں میں آپ کو چھوڑ کے بھاگ نہ جاؤں۔" میں نے شوخی سے کہا۔ "آپ بے فکر رہیں۔ اب یہ پنچھی اڑنے سے رہا۔ اس لیے کہ آپ نے اس کے پر کاٹ دیے ہیں۔ پھر محبت کے پنجرے میں قید کردیا ہے۔ محبت کا پنچھی تو اڑنے سے رہا۔"

"اس لیے نہیں کہ آپ بھاگ جائیں گی بلکہ اس لیے دروازے پر تالا نہ دیکھ کر کوئی بھی ملاقاتی دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔" مسعود نے کہا۔ "اس طرح آپ کو پریشانی ہوسکتی ہے۔ جب میں گھر میں رہتا ہوں تو کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی کام سے مجھ سے ملنے آتا رہتا ہے۔"

سعود کے کہنے پر میں نے اندر سے باہر کے دروازے کی چٹخنی لگادی۔ پھر سعود باہر کے دروازے تالا لگا کر چلا گیا۔ پھر میں نے جلدی جلدی برتن دھوئے، باورچی خانے، صحن اور کمرے کی صفائی کی سوچا کہ اب نہالینا چاہیے۔ اس لیے کہ کل شام سرخ ریشمی ساڑی پہنی ہوئی تھی اس سے بدن پر ہی نہیں بلکہ ذہن پر بوجھ محسوس ہورہا تھا۔ میں پسینہ پسینہ ہوگئی تھی۔ میں غسل خانے میں گھس گئی اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ جب کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ایک تو سعود کی دو ایک گھنٹے سے پہلے واپسی نہیں ہوسکتی تھی اور پھر میں نے باہر کا دروازہ چٹخنی سے بند کیا ہوا تھا۔ میں جب تک نہ کھولوں سعود اندر آ نہیں سکتا تھا۔ میں آزادی سے نہانا چاہتی تھی۔ میں نے لباس اور زیر جامے کھونٹی سے لگادیے۔ میں ٹھنڈے پانی سے خوب اچھی طرح سکون واطمینان سے نہائی۔ آزادی سے نہانے میں فرحت اور لذت پوشیدہ ہوتی ہے۔ دیر تک نہانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ غسل خانہ خاصا کشادہ تھا۔ اس میں ایک شاور بھی تھا اور ایک دیوار پر تیس انچ کا ایک آئینہ نصب تھا واش بیسن کے اوپر......شیونگ کا سامان بلیڈ اور شیمپو اور صابن کی بڑی ٹکیہ بھی تھی۔ نہانے کے بعد مجھے یہی کپڑے پہننے پڑے تھے۔ میں نے صحن میں کھڑے ہوکر بالوں کو خوب اور دیر تک جھاڑا۔ اس لیے کہ میرے بال بڑے لمبے تھے اور کولھوں سے نیچے تک لہراتے تھے۔ انہیں تولیا سے خشک کرنے میں خاصی دیر لگی تھی۔ اگر دھوپ تیز نہ ہوئی ہوتی تو جانے کتنی دیر اور لگتی۔ کمرے میں آکر بالوں میں کنگھی کررہی تھی کہ گلی میں مسعود کی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے لپک کر چٹخنی گرادی۔ پھر کمرے میں آ گئی۔ میرے اندازے کے مطابق مسعود نے پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مسعود کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی دہلیز ہی پر ٹھٹک کے رک گیا تھا جیسے اس نے کوئی حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات دیکھ لی ہو۔

"کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟ آپ مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہیں؟ کیا میں کوئی؟"

"میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اور محسوس کررہا ہوں سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ اسے کن الفاظ میں بیان کروں۔" اس نے میری بات کاٹی اور سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں آپ میں ایک نیا انوکھا روپ دیکھ رہا ہوں۔ یہ کون سا میک اپ......؟"

"یہ میک اپ نہیں ہے۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے ہاں میک اپ کی لوازمات ہی نہیں

ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی نہا کر نکلی ہوں۔'' یوں بھی میں نے ساری زندگی میک اپ کبھی نہیں کیا۔ ایک لپ اسٹک تک نہیں لگائی۔''

''آئندہ سے آپ میک اپ بالکل بھی نہ کریں۔'' اس نے اٹیچی کیس بستر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ کس لیے......؟'' میری زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی اور یقین نہ آیا، کیوں کہ مرد لوگ اپنی بیویوں کو میک اپ کی حالت میں لے کر نکلتے اور خوش ہوتے تھے کہ ان کی بیویاں حسین لگ رہی ہیں۔

''اس لیے کہ میک اپ عورت کے حسن کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے اصل حسن کو غارت کر دیتا ہے۔'' وہ کہنے لگا۔ ''قدرت نے عورت کو جو حسن ودیعت کیا ہے وہ کسی میک اپ کا محتاج نہیں ہے۔ آپ دلہن کے میک اپ قطعی اچھی نہیں لگی تھیں اور نہ ہی میں متاثر ہوا تھا جتنی میک اپ کے بغیر اب لگ رہی ہیں۔ میں کتنی دلہنوں کو میک اپ کے لیے بیوٹی پارلر لے گیا جب وہ میک اپ کر کے نکلیں تو انہیں ان کے گھر والوں نے بھی نہیں پہچانا ہوگا۔ کیوں کہ وہ بندریا اور چڑیلیں لگ رہی تھیں۔''

میں ایک دم سے کھلکھلا کر ہنس پڑی ہنسی تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل ہنسی روک کر کہا۔

''بیوٹی پارلر والیوں نے سن لیا تو وہ آپ کے خلاف ہتک عزت کا دعوا کر دیں گی......کیوں کہ اگر آپ کی اس بات پر عمل درآمد ہو گیا تو ان بیوٹی پارلرز والیاں جو بھینسوں کی طرح چربی دار ہو رہی ہیں۔ فاقے کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔''

''میں ایک بات بتاؤں۔'' سعود کہنے لگا۔ ''پلیز! آپ میری بات کا برا نہ مانیں اللہ نے سچ ہی فرمایا ہے کہ عورت ناقص العقل ہے۔ یہ بیوٹی پارلر والی مالکنیں لڑکیوں، دلہنوں اور عورتوں کو بے وقوف بنا کے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہیں۔ یہ لٹیری ہیں۔ ڈکیت ہیں۔ یہ آج کروڑ پتی بن گئی ہیں۔ لڑکیاں، دلہنیں اور عورتیں صرف چند گھنٹوں کے لیے ہزاروں کی رقم پھونک آتی ہیں۔ اس میک اپ کا کوئی اس لیے حاصل نہیں ہوتا ہے کہ وہ نالیوں سے سیوریج لائن میں چلا جاتا ہے۔''

''میک اپ یعنی آرائش حسن عورت کا حق ہے۔'' میں نے تکرار کی۔ ''آپ اعتراض کیوں کر رہے ہیں؟''

''صرف اس لیے کہ شوہر کے لیے۔'' سعود نے جواب دیا۔ ''جب ایک لڑکی شادی شدہ عورت بن سنور کے نکلتی ہے تو مردوں کی بھوکی ندیدی نگاہیں کسی بھیڑیے کی طرح گھورتی ہیں۔ اس میں مردوں کا نہیں بلکہ لڑکیوں عورتوں کا قصور ہوتا ہے جو جسموں کی نمائش کرتی ہیں......اگر سرراہ کوئی مرد ان کی سج دھج اور جسمانی کشش کی تعریف کر دے اور کوئی جملہ کہہ دے تو کیا عورتیں برداشت کر پائیں گی؟''

میں لاجواب سی ہو کر رہ گئی۔ یہ کوئی غلط بات نہ تھی۔ سعود نے مجھے خاموش پا کر کہا۔

''دراصل ہمارے معاشرے میں بہت سارے کام لاحاصل ہوتے ہیں۔ ان پر پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ ان میں میک اپ بھی ہے۔ کسی ضرورت مند نے سو روپے بھی مانگ لیے تو دس بہانے کر کے معذرت کر لیتے ہیں۔ اس طرح شادی بیاہ میں اگر چھ سات لاکھ کا کھانا ہو تو دو تین لاکھ کا ضائع ہو جاتا ہے۔ معاف کیجیے۔ میں بھی کیا بحث لے بیٹھا۔ آپ کپڑے دیکھ لیں۔''

میں نے اٹیچی کھول کر دیکھی۔ اس میں کئی جوڑے تھے۔ دو ریشمی اور چار سوتی جوڑے...... مسعود نے میرے لیے جو سوٹ خریدے تھے اس سے اس کے اعلا اور نفیس ذوق کا اندازہ ہوتا تھا۔ بلاشبہ یہ تمام جوڑے قیمتی اور عمدہ تھے۔ بالکل میرے ناپ کے تھے۔ میں نے جامنی رنگ کا ایک سوتی جوڑا اٹھایا اور غسل خانے میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد پہن کر نکلی۔ اس جوڑے کے پہنتے ہی ایسا لگا جیسے جسم سے

منوں بوجھ اتر گیا۔ میں دھان پان سی ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک دم فرحت اور بڑے سکون کا احساس ہوا۔ یہ عروسی جوڑا تو میرے بدن میں نیزے کی طرح چبھ رہا تھا۔

سعود نے فرخ باجی کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں تھا۔ وہ بڑی نیک دل اور شفیق خاتون تھیں۔ واقعی ان میں بڑی سادگی تھی لیکن دور اندیش، زمانہ شناس اور درد آشنا بھی تھیں۔ وہ میری دردناک کہانی سن کر بے حد متاثر ہوئیں اور جذباتی سی ہو گئیں۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگایا۔ چوما اور بولیں۔

"بیٹی! یہ کہانی ساری دنیا کو سنانے کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ دنیا بڑی خراب ہے۔ وہ بہ ظاہر ہم ہمدردی کا اظہار کریں لیکن دل میں تمسخر اور استہزاء کریں گی۔ تمہاری اس کہانی سے دس کہانیوں کو جنم دیں گی۔ نجانے کیا کیا تہمتیں لگیں گی۔ کیوں کہ تم ایک عورت ہو۔ میں دنیا والوں کو بتاؤں گی کہ تم میری ایک دور کی رشتہ دار بہن کی بیٹی ہو۔ ماں کی وفات کی بعد میرے پاس آ گئی ہے۔ اس لیے اس کا اس دنیا میں کوئی رشتہ دار اور سہارا نہیں ہے۔"

فرخ باجی نے مجھے جو پیار دیا تھا میں اس کے بارے میں خواب وخیال میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ ان کے پیار اور چاہت کی کوئی حد نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے ہی مجھے جنم دیا۔ شاید اس پیار کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اپنی کوئی بیٹی نہ تھی۔ جیسے وہ ساری زندگی بیٹی کے پیار کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ ترس رہی تھیں۔ ان کے اس پیار اور اور ممتا نے میری ماں کے پیار کو جیسے بھلا دیا تھا۔ میں یہاں آ کر اس قدر خوش تھی کہ بتا نہیں سکتی تھی۔ ایسی ماں اور ممتا بھلا مجھے کہاں مل سکتی تھی۔

فرخ باجی کا بیٹا عدنان شریف النفس تھا۔ وہ اپنی ماں پر گیا تھا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم تھا۔ سعود کا ہم عمر تھا اور زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں رہتا تھا۔ اسے ٹی وی دیکھنے سے زیادہ مطالعے کا شوق تھا۔ وہ کبھی بھی بلاوجہ میرے سامنے نہیں آیا۔ جب بھی وہ کسی وجہ سے باہر آیا اس کی نظریں نیچی رہتی تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ اس نے کبھی مجھے نظر بھر کے دیکھا ہو۔ کوئی اور ہوتا تو وہ مجھے نظر بھر کے ضرور دیکھتا۔ بے تکلف ہونے کی کوشش ضرور کرتا۔ کیوں کہ میں اس قدر حسین اور پرکشش تھی کہ کوئی مجھے بار بار دیکھے بغیر نہ رہ سکتا۔ اس پر ہمیشہ ایک سنجیدگی اور بردباری طاری رہتی تھی۔ اس کی شرافت کا اظہار اس کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا۔

میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ میں چاہتی تھی کہ عدنان مجھ سے ایک بھائی کی طرح پیش آئے۔ بات کرے اور میں اسے ایک اچھی سی بہن بن کر دکھاؤں۔ شاید وہ بھی ایک چاہنے والی بہن کی کمی کو محسوس کرتا ہوگا۔ لیکن اس خلا کو پر نہ کر سکی۔ اس نے اجنبیت کی ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔ اس نے مجھ سے کبھی بات نہیں کی اور نہ ہی اجنبیت کی دیوار گرائی۔

سعود رات کے وقت روز ہی مجھ سے ملنے، دیکھنے اور بات کرنے آتا تھا۔ کیونکہ اسے مجھ سے ملے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ وہ مجھ سے تنہائی میں سرگوشی میں کہتا کہ ...... دردانہ! یہ آپ نے مجھ پر کیسا جادو کر دیا ہے کہ سارے دن کی جدائی بھی برداشت نہیں ہو پاتی...... آپ ہر وقت چشم تصور میں رہتی ہیں...... میں شوخی سے کہتی کہ جناب! گاڑی چلاتے وقت ذرا خیال رکھا کریں۔ ناخوستہ کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔ اس کراچی شہر میں آئے دن ان ٹریفک کے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔

سعود اب رات کا کھانا بھی یہیں کھانے لگا تھا۔ وہ اپنے رات کے کھانے اور میرے کھانے کے لیے پندرہ سو روپے دینے لگا تھا اور پھر وہ روز ہی پھل اور مٹھائیاں وغیرہ بھی لاتا رہتا تھا۔ آخر اس نے ایک روز فرخ باجی سے میری شادی کی تاریخ دو مہینے بعد مقرر کرا دی۔ فرخ باجی نے دو مہینے کا وقت تیاری کے لیے مانگا تھا۔ سعود نے دس ہزار کی رقم کپڑوں کی خریداری کے لیے دی فرخ باجی نے اس کے

دوسرے دن ہی مجھے اور پڑوس کی ایک عورت کو ساتھ لیا۔ ہم تینوں نے بازار جا کر خریداری کی۔ میں اس روز کے بعد آج پہلی بار باہر نکلی تھی۔ دل میں ایک خوف سا دامن گیر تھا کہیں آنٹی سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں برقع میں تھی۔ وہ مجھے کیسے پہچانتی۔

ادھر فرخ باجی نے سعود پر مجھ سے ملنے اور بات کرنے پر پابندی لگا دی تھی مگر مسعود چھ سات دنوں میں آ کر کسی نہ کسی بہانے میری ایک جھلک دیکھ کر چلا جاتا۔

دن بڑے خوش گوار اور پرمسرت گزر رہے تھے۔ محلے اور پڑوس کی لڑکیوں اور عورتوں کی مدد سے شادی کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں۔ میں محلے والوں کی جیسے خاندان کی فرد بن گئی تھی۔ یہ سب دیکھ کر میں بہت خوش ہوتی تھی۔ میری سحت قابل رشک تک اچھی ہوگئی تھی۔ جب کبھی میں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر ناقدانہ نظروں سے خود کو دیکھتی تھی تو لگتا تھا کہ میں اور پرکشش ہوگئی ہوں اور میرے جسم میں گداز سا پیدا ہوگیا ہے جس سے میرے انگ انگ کسی پکے پھل کا سا رسیلا پن آ گیا ہے۔

شادی سے کوئی بیس دن پہلے سعود پشاور چلا گیا تھا تا کہ باڑہ سے سامان خرید کر لا سکے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ مجھے اچھے غیر ملکی سامان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہر قسم کا سامان مل جاتا ہے۔ ملکی مصنوعات آخر ملک میں ہر کوئی استعمال کرتا ہے اور کر رہا ہے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ جو نہیں ہونا تھا۔ آخر وہ ہو کر رہا اور ہو کر رہتا ہے۔ ایک ہفتہ قبل خبر ملی کہ سعود کو منشیات کراچی لانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی مجھ پر کوئی بجلی سی آ گری۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ سعود ہر گز ایسا نہیں ہے۔ سعود کے بارے میں عدنان کا یہ کہنا تھا کہ اسمگلروں نے گرفتاری سے بچنے کے لیے مسعود کو پھنسا دیا۔ سعود کے بارے میں عدنان کا کہنا تھا کہ وہ مسعود کو جتنا جانتا ہے کوئی اور نہیں جانتا...... سعود کی زندگی ہمیشہ صاف وشفاف آئینے کی طرح رہی ہے۔ آج تک اس پر کوئی خراش تک نہیں پڑی۔ وہ بلاشبہ ایک نیک اور مثالی انسان ہے۔

واقعہ بھی یہی تھا جیسا کہ سعود نے عدالت میں مقدمے کی کارروائی کے موقع پر بتایا تھا کہ پشاور سے کراچی واپسی کے دوران کچھ مسافروں سے اس کی دوستی ہوگئی۔ جب وہ سو رہا تھا تب اس کے سوٹ کیس میں ہیروئن اور چرس چھپا دی گئی تھی۔ جب پولیس نے کراچی ریلوے اسٹیشن پر کسی مخبر کی اطلاع پر ان اسمگلروں کی تلاشی لی گئی تو ان کے سامان میں سعود کا سامان بھی تھا۔ جب سعود کے سامان کی تلاشی لی گئی تو اس سے ہیروئن اور چرس برآمد ہوئی۔ لہٰذا مسعود کو گرفتار کر لیا گیا۔ مسعود نے اپنی بہت صفائی پیش کی تھی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی اور عدالت نے مسعود کو اس جرم کی پاداش میں پانچ سال قید با مشقت کی سزا سنائی تھی۔ اس لیے کہ اس کے خلاف جو ثبوت تھے وہ اس قدر ٹھوس تھے کہ انہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ عدالت تو ثبوت پر ہی فیصلہ سناتی ہے۔

میری زندگی میں ایک ایسا طوفان آیا تھا جس نے میرے وجود کو نہ صرف تہس نہس بلکہ تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا تھا۔ اور پھر اس طوفان نے مجھے ایک ایسے گھپ اندھیرے میں دھکیل دیا تھا کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں انتہائی بلندی سے پستی میں آ گری تھی۔ میری زندگی ویران اور اجاڑ ہو کر رہ گئی تھی۔ سعود میری زندگی میں پہلا مرد تھا جس سے میں نے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ چاہا تھا۔ وہ میرے لیے سب کچھ تھا۔ اس کی محبت اور تصویر میرے دل کے نہاں خانے میں نقش ہو چکی تھی۔ میں اپنی زندگی کے اس اندھیرے اور ادھورے پن کو دور نہیں کر سکتی تھی۔ جو خلا پیدا ہوگیا تھا اسے پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں کئی دنوں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ میری نیندیں اڑ کے رہ گئی تھیں۔ کسی پل چین نہیں آتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں جاؤں! کیا کروں؟ جدھر دیکھتی اس سمت اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا جو

کسی زہریلے، پھنکارتے خوف ناک ناگ کی طرح لگتا تھا۔

عدنان اور فرخ باجی پر کب تک بوجھ بنی رہوں۔ دو ایک دن کی بات ہوتی تو رو دھو کر صبر کر لیتی اور پھر فرخ باجی دل، شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ بھی تھیں جو اپنی بیماریوں سے گزر رہی تھیں۔ لڑ رہی تھیں...... سعود کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا انہوں نے اس صدمے کا اثر دل پر لے لیا تھا۔ پھر بھی ایک روز فرخ باجی نے مجھے اپنے پاس بٹھا کے کیا تھا۔

''بیٹی......! سعود میرے لیے عدنان کی طرح ہے۔ اس نے میری بہت خدمت کی اور کڑے حالات میں جو مدد کی تھی میں اس کے اس احسان کو کبھی بھلا نہیں سکتی۔ نامساعد حالات میں اس نے اس طرح ساتھ دیا جب کہ رشتہ داروں اور سگوں نے بھی ساتھ نہیں دیا تھا آخر تم رو رو کر اپنا حال برا کیوں کر رہی ہو؟ خدانا خواستہ وہ مر تو نہیں گیا اور نہ ہی اسے پھانسی ہونے والی ہے اسے پانچ برس کی سزا قید بامشقت ہوئی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بامشقت سے میعاد پوری ہونے سے پہلے رہائی ہو جاتی ہے۔ یہ پانچ برس کا عرصہ پلک جھپکتے گزر جائے گا۔ صبر کرو میری بیٹی صبر کرو۔''

ان کی محبت بھری اور ہمدردانہ باتیں سن کر دل بھر آیا۔ میں بے اختیار ان کے سینے سے لگ کر سسک پڑی۔

''ماں جی......! یہ پانچ برس میرے لیے کسی صدی سے کم نہیں ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ پہاڑ جیسے پانچ برس کیسے کٹیں گے۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتی ہوں۔ میرے لیے ایک دن بھی کاٹنا ایک برس کی طرح لگتا ہے۔''

شاید میں منحوس تھی۔ کوئی دس دنوں بعد فرخ باجی ایک رات کسی کو تکلیف اور بتائے بغیر چل بسیں۔ رات وہ بالکل ٹھیک ٹھاک سوئی تھیں۔ صبح پتا چلا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہیں۔ سوئم کے بعد میں اور عدنان گھر میں رہ گئے تھے۔ تین دنوں تک ایک بڑی بی جو پڑوسن تھیں وہ ساتھ رہی تھیں۔ فرخ باجی کی موت کا یقین نہیں آتا تھا۔

میں فرخ باجی کے کمرے میں سوگوار سی بیٹھی تھی۔ میرے اور عدنان کے درمیان ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ معلوم نہیں عدنان کیا سوچ رہے تھے مگر میں یہ سوچ رہی تھی کہ فرخ باجی جو زندگی کے دلدل میں میرے لیے تنکے کا سہارا تھیں میں ان سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکی ہوں۔ اب کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ میں شازیہ خالہ کے ہاں بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے کہ آنٹی میری تلاش میں ہوں گی؟ پھر میرا کسی عیاش اور بدکار سے سودا کر دیں گی۔ یہ پہاڑ سے دن اور قیامت کی سی راتیں کہاں گزار دوں؟ کیسے گزاروں؟ عدنان کے ساتھ اس گھر میں اکیلی رہ نہیں سکتی تھی۔ چاہے لاکھ ہم ایک پاکیزہ سی زندگی گزاریں؟ ایک دوسرے کو نہ چھوئیں؟ پھر بھی محلے والے ہم پر انگلیاں اٹھائیں گے؟ مشکوک نظروں سے دیکھیں گے؟

''دردانہ......!'' عدنان کی لرزیدہ سی آواز نے اچانک سکوت کے طلسم کو توڑا تو میں خیالات کے گرداب سے نکل آئی۔

''جی......!'' میں نے اپنی جھکی جھکی نظریں اٹھا کے ان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

''اب آپ نے کیا سوچا ہے......؟'' عدنان بولے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ آج کسی فیصلے اور نتیجے پر پہنچ جائیں۔''

''مجھے کیا سوچنا ہے عدنان صاحب؟'' میں نے پھر اپنا سر اٹھا کے دیکھا تو عدنان کا سر جھکا ہوا تھا اور ان کی نگاہیں فرش پر مرکوز تھیں۔

''آپ جو بھی فیصلہ کریں گے وہ مجھے منظور ہے۔ میں ایک منحوس لڑکی ہوں۔ جو پہلے اپنی ماں کو کھا گئی...... پھر سعود صاحب کی زندگی اجاڑ دی۔ اب آپ کو آپ کی ماں سے جدا کر دیا۔ یہ سب کچھ میری اپنی وجہ سے ہوا ہے۔''

”نہیں......نہیں۔“ عدنان نے اک دم سے اپنا سر اوپر اٹھا کے مجھے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں سے اداسی جھانک رہی تھی۔ وہ حسرت و یاس کی تصویر دکھائی دینے لگے۔ وہ چند لمحوں کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔ ”مشیت ایزدی میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔ میری والدہ کی زندگی اتنے ہی دنوں کی تھی......کوئی کسی کی موت کا باعث نہیں ہوتا.....کیوں کہ موت کا ایک دن معین ہے۔ کوئی نہ تو ایک لمحہ پہلے کر سکتا ہے اور نہ ہی بعد میں......سعود جس طرح گردش میں آئے شاید اس میں خدا کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہو گی۔ اس کی مصلحت کو ہم سمجھ نہیں سکتے ہیں۔ آپ اس خیال کو دل سے نکال دیں کہ آپ منحوس ہیں۔ بالکل بھی منحوس نہیں ہیں یہ آپ کا وہم ہے۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ اتنی اچھی ہیں کہ آج اس معاشرے میں آپ جیسی لڑکیاں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ قدرت نے آپ کو صورت اور سیرت سے خوب نوازا ہے جس پر اس کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ آپ جذباتی ہو کر اپنے آپ کو دوش نہ دیں اور آئندہ اپنے آپ کو منحوس نہ کہیں۔“

”عدنان صاحب! آپ یہ کیوں نہیں سوچتے ہیں کہ میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے جو مجھے سہارا دے سکے۔“

”آپ کو کہیں جانے اور دربدر کی خاک چھاننے اور ٹھوکریں کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ عدنان کہنے لگا۔ ”آپ میرے عزیز دوست کی امانت ہیں۔ وقت پڑنے پر میں آپ کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔ اس امانت کی حفاظت میرا فرض ہے۔ میرا ایک مخلصانہ مشورہ ہے۔ آپ کے پڑوس میں جو بڑی بی ہیں ان کے ہاں رہیں۔ آپ کی کفالت میرے ذمے ہے۔ انشاء اللہ پانچ برس جلد ہی گزر جائیں گے۔ وقت گزرتا جاتا ہے۔ کتنا وقت لگتا ہے۔ آپ ایسا کریں کہ کسی سلائی کڑھائی کے سینٹر میں داخلہ لے لیں۔ وہاں اس کا کورس کر لیں۔ اس طرح اپنے آپ کو آپ مصروف رکھ سکیں گے۔ اس طرح وقت کیا دن ہفتے اور مہینے بھی اور برسوں بھی آسانی سے کٹ جائیں گے۔“

عدنان نے مجھے جو مشورہ دیا وہ بڑا مخلصانہ اور دوستانہ تھا۔ میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ سعود کی سزا اور اپنی ماں رحلت کے بعد وہ میرے حسن و شباب اور بھری جوانی اور کشش کے اسیر ہو کر شادی کی پیش کش کر دیں گے۔ میں نے اس کے لیے ذہنی طور پر خود کو آمادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اس کے لیے یہی ایک راستہ تھا اور کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ دیکھے بھالے بھی تھے۔ وہ خوب صورت، وجیہ اور دراز قد بھی تھے۔ تصوراتی محبوب لگتے تھے۔ مجھے ان کی فطرت کا اندازہ تھا کہ وہ بڑے بے غرض ہیں۔ ایک مخلص اور عظیم ترین انسان تھے جس کی پرستش کی جائے۔ وہ دوستی نبھانے اور دوست کی خاطر بہت کچھ کرنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ سعود کس قدر خوش نصیب تھا کہ اسے عدنان جیسا بے لوث اور عظیم دوست ملا تھا۔

پھر میں نے سلائی کڑھائی کے ایک سینٹر میں داخلہ لے لیا تاکہ اس کا کورس کر سکوں۔ یہ اسکول کوئی دو میل کی مسافت پر تھا۔ وہاں آنے جانے کے لیے مجھے بس میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ پانچ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھ پر مصیبتیں نازل ہونے لگیں۔ معلوم نہیں محلے میں اس بات کا علم کیسے ہو گیا تھا کہ سعود مجھے کہیں سے لے کر آیا تھا۔ شاید فرخ باجی نے اپنی زندگی میں کسی کو بتا دیا ہوگا۔ اس کے پیٹ میں درد ہوا تو اس نے یہ بات پھیلا دی۔ عورت کے لیے کسی بات کو راز میں رکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

پھر جیسے ایک طوفان سا آ گیا۔ ہزار منہ ہزار باتیں......کس کس کی زبان پکڑیں لگام دیں صفائی پیش کریں۔ پھر میرے لیے محلے کے اوباش اور آوارہ لڑکوں کے رشتے آنے لگے۔ ان مردوں کے بھی جن کے دو دو بیویاں تھیں اور بے اولاد تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر ریشہ خطمی ہو گئے۔ ہر کسی نے مجھے رستے کا مال سمجھ لیا تھا۔ پھر مجھ سے چھیڑ خانی اور فقرے کسے جانے لگے۔ دل مسوس کر رہ جاتی۔ ایک روز دودھ کی

دکان کے مالک نے جس کی دو بیویاں اور سات بچے تھے میرے لیے اپنا رشتہ بھیجا تھا۔ میں یہ سب کچھ بڑے صبر و ضبط اور تحمل سے برداشت کی جاتی رہی تھی۔ مگر ایک رات ایسا ہوا کہ میں نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

بڑی بی اپنی بہو بیٹے اور دو پوتوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ بڑی بی کا بیٹا جاوید کسی کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اس کی بیوی نور جہاں ایک اچھی عورت تھی۔ بڑی مخلص اور محبت کرنے والی نیک دل عورت تھی۔ اس لیے وہ میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ مجھے کوئی کام کرنے نہیں دیتی۔ مجھے اپنی چھوٹی بہن کی طرح سمجھتی تھی۔ اس کا سلوک ایسا تھا کہ میں اس کی گرویدہ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ انٹر پاس تھی۔ جب اس کا شوہر ایک اجڈ، جاہل اور تیز مزاج شخص تھا۔ غربت کی وجہ سے اس کے ماں باپ جاوید سے اس کی شادی کر دی۔ وہ نہ تو اس کا کوئی جوڑ تھا اور نہ کسی بھی لحاظ سے لائق تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا تھا۔ میں نور جہاں کے منع کرنے کے باوجود اس کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتی رہتی تھی۔ میں نے اس گھر میں قدم رکھنے کے بعد اس کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ نور جہاں کو میں نے بتایا تھا کہ شام ہوتے ہی شوہر کے آنے سے پہلے اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر، کنگھی چوٹی اور ہلکا سا میک اپ کر کے، صاف ستھرے کپڑے پہن کر شوہر کا اپنے کمرے میں والہانہ اور جذباتی انداز سے استقبال کرنا چاہیے۔ گھر پورا خوش گوار ہوتا چلا گیا۔ گھر آئینے کی طرح چمکنے لگا۔ میری وجہ سے اس کا پھوہڑ پن دور ہو کر اس میں سلیقہ آتا گیا۔ مجھے سلائی کٹائی تو پہلے سے آتی تھی۔ ماں نے مجھے سکھلائی ہوئی تھی۔ لہٰذا میں نے نور جہاں اور اس کے بچوں کے کپڑوں کی سلائی کر دی۔ قدرے تنگ و چست لباس سے نور جہاں کے تناسب بے حجاب لگتے تھے اور اس کی جسمانی کشش سے وہ ہیجان خیز دکھائی دینے لگی۔ چوں کہ اس کا جسم چھریرا اور متناسب تھا لہٰذا وہ دو بچوں کی ماں نہیں کنواری لڑکی دکھائی دیتی تھی۔

اس روز نور جہاں صبح ہی سے اپنے میکے چلی گئی تھی۔ میں دن اور رات گھر کے کام کاج سے فراغت پا کر بستر پر لیٹی تو سعود کے چشم تصور میں کھو گئی۔ میں نے اس لمحہ سوچا کہ سعود بھی جیل کی کوٹھری میں رات بستر پر دراز میرے تصور میں یقیناً کھو جاتا ہوگا۔ وہ لمحات ناقابل فراموش اور یادگار تھے۔ بھلائے نہیں جاسکتے تھے۔

معلوم نہیں اس کیفیت میں کتنا وقت گزر گیا۔ کمرے میں زیرو پاور کا دودھیا بلب روشن تھا۔ دوپٹا سرہانے رکھی کرسی پر میں نے ڈال دیا۔ عورت بغیر دوپٹے کے بے نیام تلوار دکھائی دیتی تھی۔ میں سعود سے تصور میں ہم آغوش تھی کہ اچانک ایک ہلکی سی آواز سنی تو چونک کر اس شیریں اور سنسنی خیز تصور سے نکل آئی۔ کیوں کہ یہ آہٹ میرے کمرے میں گونجی تھی۔ میں نے اس سمت دیکھا۔ میرے کمرے کا دروازہ بے آواز اور غیر محسوس انداز سے کھل رہا ہے۔ آج چوں کہ میں بہت تھکی ہوئی تھی اس لیے اندر سے دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ دوسرے لمحے میں نے جاوید کو دیکھا۔ وہ چوروں کی طرح کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ پھر اس نے اندر داخل ہو کر اندر سے چٹخنی لگا لی۔ ان جانے خوف کی ایک سرد لہر میرے ریڑھ کی ہڈی میں خنجر کی نوک کی طرح اتر گئی۔ میں بستر سے سرعت سے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ میں چوں کہ بغیر دوپٹے کی تھی اس لیے محسوس کیا کہ اس کے سامنے عریاں حالت میں کھڑی ہوئی ہوں۔ دودھیا ملگجی روشنی نے میرے جسمانی فراز اور نشیب کو اور اجاگر کر دیا تھا۔

''بھائی جان! آپ؟'' میری زبان سے خوف زدہ لہجے میں نکلا۔ ''خیریت تو ہے؟ باجی تو میکے گئی ہوئی ہیں۔''

جواب دینے کے بجائے وہ میرے قریب آیا تو میں دہشت زدہ سی ہو کر دیوار سے چپک گئی۔ میرا بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے اسے پھٹی پھٹی نظروں

سے دیکھا۔ میرے بدن میں لہو خشک ہو چکا تھا۔ دل تھا کہ اچھل کے حلق میں آ گیا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں؟ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ناگ ہے۔ اس کی گرسنہ نگاہیں میرے گریبان میں دھنسی جا رہی تھیں۔ میں بڑی ہراساں اور حد درجہ خائف ہو رہی تھی کہ اگر اس نے دبوچ کر قابو میں کر کے بے بس کر دیا تو میں نہ چیخ سکوں گی۔ شور مچا سکوں گی۔ الٹا مجھ پر یہ الزام تھوپ دیا جائے گا میں نے نور جہاں کی غیر موجودگی میں اسے کمرے میں بلا لیا ہے۔ جب بھی نور جہاں میکے چلی جاتی ہے تو میں اس کے ساتھ رنگ رلیاں اور جشن منائی رہتی ہوں...... اب کسی وجہ سے شور مچا دیا ہے۔

جاوید نے میرے چہرے پر خوف اور آنکھوں میں دہشت دیکھی تو اس نے مجھے آغوش میں لیا اور نہ ہی چوما۔

''دردانہ......! گھبراؤ نہیں پریشان نہ ہو۔ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ آرام سے پلنگ پر بیٹھو۔'' اس نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا تا کہ اس کی ماں آواز نہ سن لیں۔ وہ بڑا محتاط ہو رہا تھا۔

''اگر آپ کو ضروری باتیں ہی کرنی ہیں تو دن میں بھی کر سکتے ہیں؟'' میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''دن میں کہاں موقع ملتا ہے...... اور پھر نور جہاں تو سائے کی طرح لگی رہتی ہے۔ آج اس کی غیر موجودگی سے موقع ملا تو سوچا کہ کیوں نہ فائدہ اٹھا لوں۔'' وہ ہنس کر بولا تو کسی خبیث کی طرح نظر آیا۔

دل میں تو آیا اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دوں اور تھوک دوں۔ لرزیدہ سی آواز میں کہا یہ جو کچھ بھی کہنا ہے وہ جلدی سے کہہ دیں اور میرے کمرے سے فوراً نکل جائیں۔ اماں آ گئیں تو برا ہوگا۔ وہ کیا سمجھیں گی، سوچیں گی۔ میں ایک غیر شادی شدہ لڑکی ہوں اور آپ ان کے بیٹے ہیں۔

''وہ جو سمجھیں اور سوچیں۔ میری بلا سے۔ تم نے تو مجھ پر جادو کر دیا ہے دردانہ جانی......!'' وہ میری کلائی تھام کے اور دوسرے ہاتھ سے میری کمر کو بازو کے حلقے میں لے کر بولا۔ ''میں نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ تم سے شادی کر لوں...... کیا تم مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو؟ میں کیا بانکا جوان مرد ہوں۔ تمہیں ایسا خوش رکھوں گا کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔''

میں نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا لی اور اس کا ہاتھ کمر سے اس طرح جھٹک دیا جیسے وہ کن کھجورا ہو۔ میں سن سی ہو گئی تھی۔ دماغ چکرا گیا۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''آخر آپ کو مجھ سے شادی کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کی بیوی نور جہاں موجود ہے۔ جوان ہے۔ حسین اور پرکشش بھی ہے۔ دو بچے بھی ہیں۔''

''میں اس پھوہڑ اور بدسلیقہ عورت سے تنگ آ چکا ہوں۔ رات کے وقت وہ مجھے قریب آنے نہیں دیتی ہے۔ میرے جذبات کو پامال کر دیتی ہے۔ بے رغبتی سے پیش آتی ہے۔ میں اپنے ازدواجی حقوق پورے کرنا چاہتا ہوں تو خود کو ایک مردہ لاش کی طرح پیش کر دیتی ہے۔ میں مرد ذات ہوں۔ برف کا تودہ نہیں...... اس لیے کہ میں چاہتا ہوں کہ تم سے شادی کر لوں۔ تم مجھ سے شادی کر لو گی تو تمہاری زندگی سدھر جائے گی۔ آخر تم بغیر مرد کے زندگی کیسے گزارو گی؟ تمہاری یہ بھری جوانی اور پرشباب گداز بدن کے خزانے مٹانے کے لیے ہیں۔ میرا ہاتھ تھام لو۔''

مگر بھائی جان! یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں سعود کی امانت ہوں۔ اس کے انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہوں۔ ذرا سوچیے تو سہی بھلا ایسی صورت میں آپ سے کیسے شادی کر لوں۔ کر سکتی ہوں۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

''تم ایک ایسے شخص سے شادی کرو گی جو ایک منشیات فروش اور اسمگلر ہے۔ جب وہ جیل سے رہا ہو کر نکلے گا تو ایک نمبری بدمعاش ہوگا۔ جیل میں شراب اور شباب بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ جو لڑکیاں

عورتیں جرم پیشہ ہوتی ہیں اور سزا کاٹ رہی ہوتی ہیں وہ دھندا بھی کرتی ہیں۔ سعود ان سے منہ کالا کر رہا ہوگا۔ وہ تم سے شادی کرکے جی بھرنے کے بعد تمہیں کس کے ہاتھ بیچ دے گا یا پھر تمہیں جسم فروشی پر مجبور کردے گا۔ اعلیٰ ترین رہائشی علاقوں میں قحبہ خانے کی آنٹی کے ہاں بٹھا دے گا۔ اس لیے کہ تم بہت حسین ہو اور جنسی طور پر اس قدر پرکشش تمہاری منہ مانگی قیمت مل جائے گی۔ اس کے علاوہ تمہارا جسم چھریرا اور ایسا متناسب ہے کہ تم چودہ پندرہ برس کی کنواری دوشیزہ لگتی ہو۔ اس کے علاوہ خلیج ملک میں تو ہر شیخ تمہاری منہ مانگی قیمت دے دے گا۔ وہ وہاں تمہیں لے جاکر اپنی بہن سگی کہہ کر فروخت کردے گا۔ شیوخ کنواریوں کی منہ مانگی قیمت دیتے ہیں۔

وہ ایک ہی سانس میں بکواس کرگیا۔ میں سمجھ گئی کہ جاوید کسی برے ارادے سے میرے کمرے میں گھس آیا ہے۔ اگر میں شادی سے انکار کرتی ہوں تو وہ مجھے ہر قیمت پر بے عزت کرکے رہے گا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانیت ناچ رہی تھی۔ اس طرح مجھے روز نشانہ بناتا رہے گا۔ شاید نور جہاں کو طلاق بھی دے سکتا ہے۔ کوئی عجب نہیں اس سے باتیں کرتے وقت میرا ذہن بڑی تیزی سے اس سے بچاؤ کی تدبیر سوچ رہا تھا کہ سانپ بھی مرجائے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ جب ہی ایک خیال میرے ذہن میں کوندا بن کر نکلا۔ گھی سیدھی انگلی سے نہیں تو ٹیڑھی انگلی سے نکالا جاتا ہے۔ ایک حسین عورت کا کسی مرد کو فریب دینا بڑا آسان ہوتا ہے۔ اسے بے وقوف بنانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ میں نے دفعتاً اس پر دعوتی مسکراہٹوں کا جال پھینکا اور اسے خود سپردگی کی نگاہوں سے دیکھا۔

''جاوید بھائی جان......!'' آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے سعود کی اصلیت کے بارے میں اس قدر تفصیل اور وضاحت سے بتا دیا ورنہ میں اب تک تو یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ ایک معصوم، نیک اور بے گناہ شخص ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وہ کس قماش کا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں نے ہر کسی سے سن اور اخبار میں پڑھا تھا کہ جب مجرم سزا پوری کرکے نکلتے ہیں یعنی سزا کی معیاد پوری کرکے وہ چھٹے بدمعاش ہوتے ہیں۔ مجرم پیشہ بن جاتے ہیں۔ اچھا آپ یہ تو بتائیں کہ آپ سے شادی کرنے کی صورت میں میرا کیا مقام ہوگا؟ آپ مجھ سے شادی کرنے کے بعد کہاں رکھیں گے؟ ایک میان میں دو تلواریں کیسے رہ سکیں گی؟ دو سوکنیں رہ تو سکتی ہیں کہ گھر بڑا ہو اور کمرے بھی ہوں۔ کیا نور جہاں آپا اور بچے بھی ساتھ رہیں گے؟'' جاوید کا چہرہ یک لخت خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما تو میں نے کوئی تعرض نہیں کیا لیکن ایک ہرنی کی طرح ہشیار اور چوکنا تھی کہ اگر اس نے میرے چہرے پر جھکنے اور آغوش میں لینے کی کوشش کی کسی تدبیر سے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دوں گی۔ وہ میری بات سن کر اس قدر سرشار اور دیوانہ ہو رہا تھا کہ جیسے اس نے خود کو جذباتی ہونے نہیں دیا وہ کہنے لگا۔

''میرے چاند......کیا میں اس خوشی میں تمہیں چوم لوں تاکہ میرے دل کو اور سرور و کیف ملتا رہے۔''

اس نے مجھے آغوش میں سمیٹنا چاہا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''اب اس وقت نہیں......کہیں ایسا نہ ہو کہ اماں آجائیں۔ وہ کس قدر سخت مزاج کے ہیں۔ کہیں مجھ پر بدکاری کا الزام نہ دھر دیں۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔'' اس نے تامل کرکے کہا۔ ''میں تو ابھی نور جہاں اور بچوں کو فوری طور پر الگ کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ مجھے اس کا حق مہر بھی دینا ہوگا جو چالیس ہزار روپے کا ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم کہاں رہنا پسند کرو گی؟''

''مجھے رہائش کے بارے میں کل تک سوچنے کی مہلت دے دیں۔'' میں نے غیر محسوس انداز سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ ''لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''کیا شرط ہے تمہاری؟'' وہ شرط کی بات سن کر میرے چہرے پر جھکتا جھکتا رک گیا۔ پھر خوش ہو کر

بولا۔ ''میری جان! صرف ایک شرط بس ارے میری جان! میں تمہاری دس شرطیں بھی پوری کرنے کے لیے تیار ہوں۔''
''آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ شادی کے بعد ایک دن کے لیے بھی اپنے آپ کو مجھ سے جدا نہیں کریں گے؟'' میں نے اسے خود سپردگی کی نظروں سے دیکھا۔
''میری جان! جان آرزو! ہاں، ہاں میں ایک دن کے لیے بھی تمہیں اپنے سے جدا نہیں کروں گا۔'' وہ احمق خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ''تم سے ایک گھڑی کیا ایک دن بھی جدا نہیں رہوں گا۔ اچھی طرح سوچ لو کہ تم کہاں رہنا چاہتی ہو؟''
وہ خوشی کے جذبات کے اندھے جنون میں مبتلا ہو کر بہکنا چاہتا تھا۔ میں اپنے گرد حصار کرتے ہوئے بازوؤں میں کسمسا کر نکل کے قدرے دور ہو کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس کے تیور بھانپ لیے تھے میں نے کہا۔
''اب جب کہ میں آپ کی ہمیشہ کے لیے ہونے والی ہوں تو ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ جہاں آپ نے اتنے دن صبر کیا وہاں تین چار دن اور صبر کر لیں۔ میں کہاں بھاگی جا رہی ہوں۔ آپ کے گھر میں اور آپ کی نظروں کے سامنے تو ہوں۔ آپ کے دل سے قریب ہوں۔''
وہ احمق حیرت اور خوشی سے کسی بندر کی طرح دو فٹ اچھل پڑا۔
''تو کیا تم مجھ سے واقعی تین چار دن کے اندر شادی کرنے کے لیے تیار ہو؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ میری جان تمنا دردانہ...... کہیں میں کوئی سندر سا سپنا تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔'' وہ اپنے بدن کی چٹکیاں لینے لگا۔
''اگر آپ کو مجھ سے شادی کرنا ہو گی تو دو چار دن ہی میں کرنی ہو گی۔ اس لیے کہ میں آپ کو کیسے بتاؤں میں خود آپ کے قرب اور ہم آغوشی کے لیے مہینوں سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہوں۔ میں آپ سے دل کی بات کہتے ہوئے اس لیے ڈرتی تھی کہ معلوم نہیں آپ کیا سوچیں؟ میرے بارے میں کہ میں کوئی اچھی عورت نہیں ہوں۔ فاحشہ ہوں بدکار ہوں جو ایک شادی شدہ شخص پر ڈورے ڈال رہی ہوں۔ میری نگاہوں کی زبان نے کئی مرتبہ آپ کو محبت کے پیغام دیے۔ لیکن آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر میں مایوس اور دل برداشتہ ہو کر بیٹھ گئی۔''
''وہ میرے چاند......!'' اس گدھے نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''میں کیا الو کا پٹھا ہوں۔ تو آپ کی نگاہوں کی زبان کو سمجھ نہ سکا۔''
''آج میں آپ کو ایک ایسی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں جس سے میرے سوا کوئی واقف نہیں ہے؟ نہ ہی ہو سکتا ہے۔'' میں نے سرگوشی میں بڑے پراسرار انداز سے اس طرح سے کہا جیسے کسی بہت ہی اہم راز کا انکشاف کر رہی ہوں۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اس کی آزمائش کر لوں تا کہ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ ہو جائے۔ ''مجھے سعود سے رتی برابر محبت بھی نہیں ہے۔ اس سے اس قدر شدید نفرت ہے کہ میں بتا نہیں سکتی اور اس کا نام تک سننا گوارا بھی نہیں ہے۔''
''سعود سے نفرت کیوں اور کس لیے نہیں ہے؟'' اس نے سنجیدہ ہو کر دریافت کیا۔ ''تم تو اس سے شادی کر رہی تھیں؟''
''اس لیے کہ وہ مجھے زبردستی اور سبز باغ دکھا کر بھگا کر لایا تھا اور بلیک میل کر رہا تھا؟''
''بلیک میل؟'' اس کے چہرے پر استعجاب بر آیا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں۔''
میں خوب آلودہ ہو چکی ہوں۔ کیا ایسی صورت میں بھی آپ مجھے قبول کرنے تیار ہیں؟''
''تو گویا آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی۔'' وہ ایک ہلکا سا بھونڈا قہقہہ پا کر ہنسا اور وہ چند اس طرح خوش ہو گیا جیسے کوئی بچہ بہت ساری ٹافیاں مل جانے پر خوش ہو جاتا ہے۔'' میں کون سا ذات شریف

ہوں۔ میں بھی پاپی ہوں۔

''آج سے ٹھیک چار دن بعد جمعہ ہے۔ جمعہ کے روز بعد نماز عصر کے بعد ہم دونوں کی شادی ہوگی۔''

مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اس آسانی اور اتنی میری باتوں کے میں ہی آجائے گا۔ وہ خوشی سے پاگل ہو کر رات کے اس لمحے میں تنہائی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن خوف خدا سے ڈرا کر ایک گال پر بوسہ دے کر اسے کمرے سے باہر نکالا۔ وہ کمینہ تو مجھے آلودہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ پھر وہ عفریت جیسے ہی کمرے سے نکلی میں نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ پھر میں بستر پر کسی کٹی پتنگ کی طرح گر کر تکیے میں منہ دیے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر ایک خیال آیا تو اندھیرے میں امید کی ایک کرن دکھائی دی۔ پھر میں سکون اور اطمینان سے سوگئی۔ جاوید علی الصباح کارخانے چلا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں اس کے جانے تک کمرے سے نہیں نکلی۔

میں بغیر کسی تاخیر کے عدنان کے گھر پہنچی۔ اس کے دروازے پر دستک دی۔ عدنان مجھے سویرے سویرے دیکھ کر بڑے حیران اور پریشان ہوئے۔ میری سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اور پریشان ہوئے۔ میں اس لمحے ہراساں بھی تھی جس سے میرے چہرے سے اندازہ بھی ہوتا تھا۔ ان پانچ مہینوں میں انہوں نے ایک بار بھی آ کر مجھے دیکھا نہیں تھا لیکن البتہ خالہ بی سے مل کر میری خیریت معلوم کر لیتے تھے اور ہر ماہ کی پہلی تاریخ میرے اخراجات کی رقم ان کے یا نور جہاں آپا کے ہاتھ دروازے پر رکھ کے چلے جاتے تھے۔

انہوں نے کسی قدر جھجک اور قدرے تذبذب کے بعد گلی دیکھ کر مجھے اندر آنے کی اجازت دی۔ اتفاق سے گلی میں کوئی نہ تھا۔ وہ ویران اور سنسان پڑی تھی۔ میں اندر داخل ہوئی تو انہوں نے باہر کا دروازہ قدرے کھلا ہی رکھا تھا۔ پھر وہ اندر سے کرسیاں لا کر صحن میں رکھیں۔ پھر انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''خیریت تو ہے دردانہ صاحبہ ......! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ یہ آپ کی کیا حالت ہو رہی ہے؟''

''جی...... خیریت ہی تو نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھ پر اچانک ایک نئی افتاد آن پڑی ہے۔ میری آبرو خطرے میں پڑ گئی ہے۔''

پھر میں نے پوری تفصیل سے رات کا واقعہ من وعن انہیں سنایا۔ اس واقعے کو سنتے ہی ان کی حالت عجیب سی ہوگئی۔ غصے سے ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور آنکھیں انگارہ بن گئیں۔ میں نے انہیں پہلی بار انہیں نفرت اور غصے کے عالم میں دیکھا۔ میرے بدن میں خون برف کی طرح یخ ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس وقت کارخانے جا کر جاوید کو قتل کر دیں گے۔

''آپ نے بڑی روح فرسا خبر سنائی۔'' وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے افسردگی سے بولے۔ ''میں بڑا نادم ہوں کہ میں نے آپ کو ایک ایسے گھر میں بھیج دیا جہاں آپ کی عزت و آبرو کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے کہ آپ کو کہاں لے جا کر رکھوں۔ آپ کی کہاں حفاظت ہو سکتی ہے۔ اب تو مجھے ہر گھر میں ایک بھیڑیا دکھائی دے رہا ہے۔''

وہ خاصی دیر تک سوچ و بچار میں ڈوبے رہے۔ فکرمند اور پریشان...... پھر انہوں نے سکوت کو توڑا۔

''اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ مگر آپ اس بات کو ناپسند کریں گی۔''

''مجھے ہر وہ صورت منظور ہے جو میری عزت و آبرو کی حفاظت کر سکے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں صرف اور صرف ہر قیمت پر اپنی عزت و آبرو کا تحفظ چاہتی ہوں۔ آپ بتایئے تو سہی۔ پس و پیش نہ کریں۔ میری کیا مجال کہ میں ناپسند اور انکار کر

دوں۔ مجھے آپ پر کتنا بھروسا ہے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔“
وہ چند لمحوں تک تذبذب میں مبتلا رہے اور قدرے جھجکتے ہوئے رک رک کر بولے۔
”وہ صورت یہ ہے کہ آپ آج ہی مجھ سے نکاح کرلیں۔ شادی کے فوراً بعد میں آپ کو دوسرے محلے میں لے جاؤں گا۔ وہاں میرا ایک مکان خالی ہے۔ جو کرایہ دار نے اتفاق سے کل ہی خالی کیا ہے۔ جاوید وہاں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اسے اس مکان کے بارے میں نہیں معلوم ہے۔ اگر اس نے وہاں آکر کوئی بدتمیزی کی تو پڑوسی اس کی درگت بنادیں گے۔“
میں دنگ رہ گئی۔ تو گویا عدنان کی نیت میں بھی فتور آگیا ہے۔ ان کا بھی اصل چہرہ سامنے آگیا ہے۔ میں نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ تو کیا آپ اس طرح اپنے عزیز دوست کی امانت میں خیانت نہیں کریں گے؟“
”جی نہیں۔“ انہوں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں آپ سے شادی ضرور کروں گا لیکن آپ کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ اس طرح میری حفاظت میں رہیں گی۔ پھر آپ پر انگلی نہیں اٹھ سکے گی۔ میں یہ صرف اور صرف آپ تحفظ کے لیے کروں گا۔ اس میں کوئی اور جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ پلیز! آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔“
میں نے خجل ہوکر اس عظیم شخص کو دیکھا۔ میرے چہرے پر ندامت کی سرخی پھیل گئی۔ ان کی تدبیر سے میرے دل میں بدگمانی سی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ مجھے گنگ پاکر کہنے لگے۔
”دردانہ......! اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں رہ جاتی۔ جب سعود جی سے رہائی پاکر آئیں گے تب میں آپ کو طلاق دے دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ حفاظت کی اس سے بہتر صورت کوئی اور نہیں ہے۔ اگر اس سے بہتر صورت کوئی اور ہے تو مجھے بتائیں۔ میں اس کے لیے ہر طرح سے تیار ہوں۔“
”جی نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے کوئی اور صورت دکھائی نہیں دیتی۔ میں اتفاق کرتی ہوں۔“
”اب اگر گھر جا کر بڑی بی کو تمام صورت حال سے آگاہ کردیں۔ کوئی بات نہیں چھپائیں۔ ان کو بتانا ہی بہتر ہے۔ چوں کہ وہ ایک عورت ہیں اور ماں ہونے کے ناتے یہ نہیں چاہیں گی کہ ان کی پیاری بہو کی زندگی اجڑ جائے۔ میں ٹھیک دو بجے قاضی صاحب اور محلے کے چند بزرگوں کو ساتھ لے کر پہنچ رہا ہوں۔ اور ہاں اگر آپ مطمئن نہ ہوں اور اعتماد نہ ہو تو آخری لمحے تک شادی سے انکار کرسکتی ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض اور شکایت نہ ہوگی۔ شادی کرنا نہ کرنا آپ کا شرعی اور قانونی حق ہے۔“
”میں ہر طرح سے اس شادی کے لیے تیار ہوں۔ میں انکار اور اعتراض کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ میں نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔
جب میں گھر پہنچی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اتنی دیر اس لیے ہوئی تھی کہ میں نے عدنان کے لیے ناشتا تیار کیا تو انہوں نے بھی مجھے شریک کرلیا تھا۔ نور جہاں بہن بچوں سمیت آچکی تھی۔ میں نے اس کی اور بڑی بی کی موجودگی میں رات کا واقعہ من و عن سنا دیا۔ وہ غریب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔
”میں شروع ہی سے اپنے شوہر نامدار کے تیور دیکھ رہی تھی مگر میں نے یہ سوچ کر دل کو فریب دیا کہ یہ میرا واہمہ ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی میرے شک سے تم متاثر اور پریشان ہو...... ویسے بھی تم دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی تھیں اور سعود بھائی کی امانت تھیں۔ مجھے تم پر بڑا اعتماد تھا کہ تم میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گی۔ جب تم نے مجھے ایک بہن کا سا بھرپور پیار دیا تو میرے دل کا میل آپ ہی آپ دھلتا گیا۔ مگر بہن......! آج تم نے یہ کیسی بات بتائی کہ میرے کانوں میں گرم گرم سیسہ پگھل کر ٹپک رہا ہے۔“

"نوروآپا......! گھبراؤ نہیں۔" میں نے بڑے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں آج نماز ظہر کے بعد عدنان صاحب سے شادی کر کے ان کے گھر جا رہی ہوں۔ جاوید بھائی جان کے آنے سے پہلے پہلے...... آپ کا گھر سلامت رہے گا۔ بچوں کے سر پر باپ کا سایہ بھی ہوگا۔"

"یہ تم بہت بڑی نیکی کر رہی ہو دردانہ بیٹی!" بڑی بی نے میری بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

"میرے بیٹے نے میرا سر شرم سے جھکا دیا۔ یہ مرد ذات کسی درندہ صفت سے کم نہیں ہوتے ہیں۔ ماشاءاللہ میری بہو کتنی خوب صورت اور پیاری ہے۔ پھر اس کمینے نے یہ کیا حرکت کی؟"

"آپ جاوید بھائی جان سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کریں۔ انجان رہیں تا کہ ازدواجی زندگی خوش گوار رہے۔" میں بولی۔

دو بجے میں دلہن بن کر عدنان کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ نور جہاں نے بڑی محبت اور چاؤ سے مجھے دلہن بنایا۔ میں نے وہی عروسی جوڑا پہنا جو آنٹی نے دیا ہوا تھا۔ عدنان قاضی صاحب اور کچھ لوگوں کے ساتھ پہنچ گئے تھے۔ بڑی سادگی اور باوقار طریقے سے میرا نکاح پڑھا دیا گیا۔ بڑی بی اور نور جہاں نے مہمانوں کی پرتکلف خاطر تواضع کی۔ اس نکاح سے بڑی بی اور نور جہاں کا دل بہت مسرور ہو گیا تھا۔

کوئی ساڑھے تین بجے عدنان مجھے ایک ٹیکسی میں اس گھر لے گئے جو بہت دور تھا۔ بڑی بی اور نور جہاں نے مجھے ایک ماں اور بہن کی طرح روایتی انداز سے رخصت کیا تھا۔ میں ٹیکسی میں عدنان کے پہلو میں بیٹھی سوچ رہی تھی اب جب جاوید شام کو گھر پہنچے گا اور میری اچانک اور غیر متوقع شادی کی خبر سنے گا تو اس پر کیسی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ وہ صدمے سے زیادہ حیرت زدہ ہو جائے گا۔

عدنان کا یہ گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ بڑا خوب صورت گھر تھا۔ اس میں ایک بڑا سا آنگن تھا۔ ایک دروازہ گلی کی طرف اور دوسرا دروازہ عقبی گلی میں کھلتا تھا۔ اس مکان میں سامان کی بے ترتیبی اور بکھرا ہوا دیکھ کر ایسا لگا کہ عدنان نے عجلت میں یہ سارا سامان یہاں پہنچایا ہے۔ میں نے عروسی جوڑا اتار کر سوتی لباس پہن لیا۔ سارا سامان دو کمروں میں رکھا تھا۔ اس سامان کو ترتیب سے رکھنے اور ٹھیک کرنے میں، میں نے عدنان کی مدد کی۔ وہ مجھے بار بار منع کر رہے تھے۔ مگر میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ دن کے ڈوبنے تک کام سے فارغ ہوئے۔ اس دوران میں میں نے دو مرتبہ چائے بنا کر پلائی۔ شام کو میں نے کھانا پکایا۔ ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ پھر میں نے برتن سمیٹ کے انہیں دھویا۔

کام سے فراغت پا کر میں اپنے کمرے میں پہنچی تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ میں عدنان کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ رات ایک بجے تک وہ کمرے میں نہیں آئے تو میں باہر نکلی تا کہ ان کے کمرے میں جھانک کر دیکھوں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ عدنان آنگن میں چارپائی پر لیٹے چاند کو بڑی محویت سے تک رہے تھے۔ انہیں میری آمد کا علم نہ ہو سکا۔ میں چوروں کی طرح دبے پاؤں ان کی چارپاؤں پر پائنتی بیٹھ گئی۔ چارپائی چرمرائی تو انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور اک دم سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے۔

دردانہ......! آپ کیوں آتی ہیں؟"

میرا چہرہ حیا آلود ہو گیا۔ میں نے نظریں نیچے کر کے ہستگی سے کہا۔

"آپ میرے شوہر ہیں اور میں آپ کی بیوی۔ قدرت کو جو منظور تھا وہ ہمیں قبول کر لینا چاہیے؟ میں نے نہ صرف بڑی بی بلکہ فوراً آپا کو بھی تمام باتیں بتا دی تھیں۔ بڑی بی نے کہا تھا کہ اب عدنان تمہارے مجازی خدا ہیں۔ اب تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کی ہو چکی ہو۔ اگر تم اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے اس سے الگ رہیں تو پھر بہت بڑے گناہ مرتکب ہو گی۔ اب تمہارا شوہر تمہارے لیے سب کچھ ہے۔ سعود تمہارے لیے غیر ہے۔ اس کی راہ تکنا اور اس

کے بارے میں سوچنا بھی گناہ عظیم ہے۔'' میں ایک ہی سانس میں بولتی گئی۔

عدنان کے چہرے پر شدید کرب کے تاثرات پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

''بڑی بی نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ اپنی جگہ درست ہے۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرسکتا مگر میں نے تم سے ایک عہد کیا تھا۔ عہد کا پاس مجھ پر فرض ہے۔ بد عہدی سے بڑا گناہ کوئی نہیں ہے...... لہٰذا اب ہم جو زندگی گزاریں گے وہ بہ ظاہر میاں بیوی کی ہوگی۔ دنیا والوں کو اس عہد کے بارے میں بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ورنہ دنیا والے ہمارا جینا حرام کر دیں گے۔ اللہ نے چاہا تو اس امتحان اور آزمائش میں ثابت قدم رہوں گا۔ ہر نماز میں دعا کرو کہ وہ دن جلد آجائے کہ میں اس ذمے داری سے سبک دوش ہو جاؤں۔''

''پانچ برسوں کا یہ طویل اور اذیت ناک عرصہ ہم کس طرح سے گزار سکیں گے؟ کہنا تو بہت آسان ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ صرف میرے لیے تو نہیں آپ کے لیے بھی تو کڑا امتحان ہوگا نا......؟'' میں نے پوچھا۔

''سعود کو قید با مشقت کی سزا ہوئی ہے۔ اگر وہ جیل میں ٹھیک رہا اور نیک چلنی کا ثبوت دیا تو شاید دو تین برس ہی میں رہا ہو جائے۔ وکیل نے اسے بتا دیا تھا کہ جلد رہائی کے لیے اسے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان سب باتوں پر عمل کر کے جلد سے جلد رہا ہونے کی کوشش کرے گا۔'' عدنان نے جواب دیا۔

☆☆☆

تین برس کا عرصہ کیسے گزر گیا مجھے سوچ سوچ کر حیرت ہوتی تھی۔ ہم دونوں نے تین برس کا عرصہ اجنبی مسافروں کی طرح کاٹا تھا۔ اس کڑے امتحان میں پورے اترے تھے۔ ثابت قدم رہے تھے۔ کبھی بھٹکے نہیں تھے اور نہ ہی اس کا کبھی بھولے سے بھی خیال آیا تھا۔ ایک دوست کے لیے محبت اور ایسے ایثار کی مثال میں نے کہیں نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی سنی ہوگی۔

ایک روز عدنان اپنے کمرے میں تھے اور میں پچھلے دروازے سے پڑوس میں کوئی چیز لینے گئی۔ واپس آئی تو میں نے کمرے سے باتیں کرنے کی آواز سنی۔ عدنان کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کمرے کے قریب پہنچ کر جھری سے اندر جھانکا۔ میں حیرت اور خوشی سے اچھل پڑی۔ نظروں کو یقین نہیں آیا۔ ایسا لگا کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ سعود رہا ہو کر آ گیا تھا۔ مسعود جو میری پہلی محبت تھا۔ میری ویران زندگی میں داخل ہونے والا پہلا مرد...... جس کے لیے میں جی رہی تھی۔ ایک کڑی آزمائش سے گزر رہی تھی۔ میرا جی چاہ کہ میں اندر جاؤں اور سعود کے سینے پر سر رکھ دوں...... مگر میں عدنان کی موجودگی میں حیا کی سرحدوں کو پار نہیں کرسکتی تھی۔ مسعود، عدنان سے نفرت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''عدنان! تم نے دوستی کا حق خوب ادا کیا۔ میری دردانہ سے شادی کر لی۔ کیا تمہاری دوستی کا یہی دعوا تھا؟''

''یہ سچ ہے کہ میں نے دردانہ سے شادی کر لی۔'' عدنان نے جواب دیا۔ ''یہ شادی میں نے اس لیے کر لی کہ دنیا نے دردانہ کو رستے کا مال سمجھ لیا۔ اس کی عزت و آبرو کے دشمن ہوگئے تھے۔ وہ عورت تھی۔ آخر وہ حالات سے کب تک کس طرح اکیلی لڑ سکتی تھی۔ یقین کرو کہ میں نے تحفظ دینے کے لیے اس سے شادی کی۔ تم اس بات کو سچ جانو کہ وہ آج تک تمہاری امانت ہے۔ میں نے اسے ہاتھ لگانا تو درکنار اسے کبھی بھی نظر بھر کے نہیں دیکھا۔ مجھے تمہارا انتظار تھا۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں اسے طلاق دے کر تمہاری امانت لوٹانا چاہتا ہوں۔''

''کیا کہا......؟'' سعود پر سکتہ سا چھا گیا۔ ''یہ کس طرح سے ممکن ہوسکتا ہے کہ تم دونوں ایک ہی گھر میں تین برس سے رہ رہے ہو اور تم اسے آج تک چھوا نہیں ہے؟ نہیں یہ ناممکن سی بات ہے۔ کہیں تم مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہو؟''

''جس طرح بھی چاہو اپنی تسلی کر لو...... کر سکتے ہو۔'' عدنان نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''تم دردانہ سے پوچھ لو اور اس کا بھی طبی معائنہ کروا لو...... میں

نے ہمیشہ ہر حال میں ہر وقت تمہاری امانت کی حفاظت کی ہے۔ دردانہ اس وقت کسی کام سے پڑوس میں گئی ہوئی ہے۔ وہ آتی ہوگی۔ اس کے آتے ہی میں اسے طلاق دے دوں گا۔ اس طرح میں آزاد ہو جاؤں گا اور اپنے فرض سے بھی سبک دوش۔"

"نہیں دوست! نہیں۔" سعود نے آگے بڑھ کر جذبات سے مغلوب ہو کر عدنان کو گلے سے لگایا "دردانہ تمہاری ہے اور اب تمہاری ہی رہے گی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں آج بھی ایسے عظیم اور مخلص دوست موجود ہیں۔ تم نے میرے لیے جو ایثار کیا ہے۔ اس کا کوئی پھل تو ملنا چاہیے۔ تم اس امتحان میں ہر طرح سے کامیاب رہے ہو۔ میں دردانہ کو تمہیں بخشتا ہوں۔ اس لیے کہ دردانہ آخر ایک عورت ہے۔ وہ کوئی کھلونا نہیں ہے جس سے ہم کھیلتے رہیں۔ میں ساری زندگی تم دونوں کے لیے دعا گو رہوں گا۔"

"مگر سعود......!" عدنان مضطرب ہو کر بولے۔ "دردانہ تم سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اس نے ایک ایک دن تمہارے انتظار میں کسی صدی کی طرح کاٹا ہے۔ تم اس کی پہلی محبت ہو...... اس پر ایسا ظلم تو نہ کرو۔"

"نہیں دوست......! نہیں۔" سعود نے کہا۔ "میں ہمیشہ اسے یاد رکھوں گا۔ کیوں کہ میں نے اس سے ہمیشہ شدید محبت کی ہے۔ محبت کا یہ مطلب تو نہیں کہ کسی کا بسا بسایا گھر اجاڑ دیا جائے۔ اب اس پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ اس پر تین برس سے ہوتا آ رہا ہے۔

کاش......! جیل جاتے وقت میں اس سے کہہ دیتا کہ وہ تم سے شادی کر کے گھر بسا لے۔" اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ "سنو دوست! میں جیل جا کر بری صحبتوں کا شکار ہو گیا۔ میں دردانہ کے کیا اس معاشرے کے قابل بھی نہیں رہا۔ نشے کی لت نے مجھے تباہ کر دیا۔ جاوید نے مجھے لکھا تھا کہ تم دردانہ سے شادی کے بغیر بھی گل چھرے اڑا رہے ہو۔ میں آخری جرم بھی اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں رہا ہے۔ نشے کی لت نے مجھے دیمک بن کر چاٹ لیا ہے۔ تم دردانہ سے کہہ دینا کہ میں جیل کے اندر مر گیا ہوں۔ نشے نے مجھے نگل لیا ہے۔ اس طرح اس کے دل کو قرار آ جائے گا۔ یوں اسے تم سے اچھا شوہر نہیں ملے گا۔ اچھا اب میں جیل واپس جا رہا ہوں تاکہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر سکوں۔" خدا حافظ۔

سعود رکا نہیں...... وہ بجلی کی سی سرعت سے باہر نکل گیا۔ عدنان اسے روکتے رہ گئے! میں کمرے میں داخل ہوئی تو عدنان نے مجھے چونک کر دیکھا۔ اس نے میرے بشرے سے سب کچھ جیسے پڑھ لیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"تم نے ہم دونوں کی گفتگو سن لی تھی......؟"

"ہاں......" میں نے جواب دیا۔

گو ہم تین برس جدا رہے تھے۔ مگر اب تین منٹ کی جدائی بھی شاق ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے دل میں سعود نہیں عدنان بسے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

کوئی چھ ماہ بعد میں ایک بازار سے خریداری کرنے کے بعد سڑک کے کنارے رکشا کے انتظار میں کھڑی تھی۔ دفعتاً میری نگاہ ایک ٹیکسی پر پڑی تو سینہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اس ٹیکسی کے اسٹیرنگ پر مسعود بیٹھا ہوا تھا۔ ایک صحت مند اور خوب صورت مرد کے روپ میں...... مجھے یہ بات سمجھتے ہوئے دیر نہیں لگی کہ سعود نے اس روز جو کچھ بھی کہا تھا وہ سراسر غلط تھا۔ جو وہ اپنی محبت کو ایک دوست کی محبت پر قربان کرنا چاہتا تھا۔ سو وہ قربانی دے کر چلا گیا۔

سعود تو کسی اور سمت دیکھ رہا تھا۔ میں بے اختیار سی ہو کر اس کی سمت بڑھی تھی کہ وہ میری پہلی محبت ہے۔ مگر میں یہ سوچ کر رک گئی کہ اب میں کسی اور کی بیوی ہوں۔ محبت ہوں۔ سعود اب میرے لیے نامحرم ہے ہم دونوں کے راستے اور منزلیں الگ الگ ہیں۔ مگر میں کبھی کبھی ضرور سوچتی ہوں کہ ان دونوں میں سے کس نے دوستی کا حق ادا کیا؟ ایثار کیا؟

☆☆

حوصلہ

ایم اے راحت

ہمارے معاشرے میں اس طرح کے بے شمار واقعات بکھرے ہوئے ہیں کہ کس نے دولت حاصل کرنے کے لیے کسی کو بے وقوف بنایا یا پھر کسی کو دھوکے میں رکھ کر اس کی دولت پر ہاتھ صاف کردیا۔ زیر نظر کہانی بھی ایسے ہی افراد سے متعلق ہے۔ ایک معصوم اور خوف زدہ لڑکی کا قصہ جو اپنی بہن کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔ جب اس کی تلاش ختم ہوئی تو سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔

بے راہ روی کی شکار ایک لڑکی کا المیہ

غوث بیگ نے ایک بار پھر گہری نگاہوں سے اس لڑکی کو دیکھا، ایک لمحے میں احساس ہو گیا کہ لڑکی مفرور ہے۔ وہ کئی بار اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ ایک بار پھر اس نے اسے مخاطب کیا۔

''تم شاید نئی بستی جارہی ہو اور جہاں تک میرا اندازہ ہے، کچھ پریشان ہو؟''

''اوں، ہاں......'' لڑکی نے مختصر سا جواب دیا اور ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''ایک کپ چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' بیگ نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ لڑکی نے اس مرتبہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ یہ کس قماش کا آدمی ہے جو اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کررہا ہے۔

''میں اجنبیوں سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتی لیکن آپ مجھے کچھ معقول قسم کے آدمی نظر آتے ہیں، اس لیے اس پیش کش کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔''

''میں واقعی معقول آدمی ہوں۔'' غوث بیگ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، لڑکی نے بھی اس کا مطلب سمجھتے ہوئے سیٹ چھوڑ دی۔

ڈائننگ کار تک پہنچنے کے لیے انہیں تین ڈبے پار کرنا پڑے، بیشتر افراد اونگھ رہے تھے اور جو جاگ رہے تھے، ان کی نگاہیں بار بار اس لڑکی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جس کے چہرے پر اس وقت بلا کی معصومیت تھی۔ ڈائننگ کار میں پہنچ کر ایک میز کے گرد کرسیاں سنبھالتے ہوئے بیگ نے بیرے کو چائے اور سینڈوچز لانے کا آرڈر دیا۔

مطلوبہ چیزیں چند منٹ بعد ہی ان کی میز پر سرو کردی گئیں۔

غوث بیگ نے چائے کا ایک کپ اور سینڈوچز کی پلیٹ لڑکی کی طرف کھسکاتے ہوئے دوسرا کپ اٹھالیا۔ لڑکی نے کن انکھیوں سے غوث بیگ کی طرف دیکھا اور ایک سینڈوچ اٹھالیا۔ غوث بیگ کا یہ اندازہ بھی بالکل درست نکلا کہ وہ لڑکی بھوکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پلیٹ میں رکھے ہوئے چاروں سینڈوچز اس کے منہ میں غائب ہو گئے اور اب وہ چائے کی ہلکی ہلکی

چسکیاں لے رہی تھی۔

”اور منگواؤں، میرا مطلب ہے سینڈوچ یا کوئی اور چیز؟ تم نے یقیناً آج دوپہر کا کھانا نہیں کھایا ہوگا؟“ غوث بیگ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”شکریہ، آپ کا یہ اندازہ درست ہے کہ میں نے آج دوپہر کا کھانا نہیں کھایا۔ میں لنچ سے تقریباً دو گھنٹے پہلے ہوسٹل سے نکل آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کھانا نئی بستی پہنچ کر ہی کھاؤں گی، لیکن ٹرین تقریباً دو گھنٹے کی تاخیر سے آئی ہے۔“

”میرا ایک اندازہ یہ ہے کہ تم کچھ پریشان ہو۔ نئی بستی کسی خاص وجہ سے جا رہی ہو؟“

”یہ پریشانی تو کئی دنوں سے ہے۔ اس مرتبہ جیب خرچ کی رقم بھی نہیں آئی، میرے پاس اب صرف اتنے روپے رہ گئے تھے کہ میں یہ کرایہ خرچ کرکے نئی بستی جا سکتی۔ اس لیے میں نے مزید انتظار کرنے کے بجائے خود جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ناصرہ کی طرف سے پریشان ہوں...... لیکن خیر یہ میرا دردِ سر ہے۔ میں آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہتی جبکہ میں آپ سے متعارف بھی نہیں ہوں۔“

”تعارف میں کیا دیر لگتی ہے۔“ غوث بیگ نے مسکرا کر کہا۔ ”میرا نام غوث ہے...... تم نے کہیں نہ کہیں میرا نام ضرور سنا یا پڑھا ہوگا۔ پرائیوٹ سراغ رساں ہوں۔“

”ارے بھئی؟“ وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوگئی، اس کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی اور لہجے میں کاٹ آگئی۔

”تو تم میری نگرانی کر رہے ہو؟ تمہیں سیف نے میرے پیچھے لگایا ہوگا۔ یہ عنایات شاید اس وجہ سے تھیں کہ تم مجھ سے کچھ اگلوانا چاہتے ہو؟“

”یہ درست ہے کہ میں تم سے کچھ اگلوانا چاہتا ہوں لیکن یہ سیف کون ہے؟“ غوث بیگ کے

ہونٹوں کی مسکراہٹ برقرار رہی۔
''کیا یہ غلط ہے کہ سیف شاہ نے تمہیں میری نگرانی پر نہیں لگایا؟'' لڑکی بدستور اسے گھور رہی تھی۔
''کچھ بھی غلط نہیں ہے۔ سیف شاہ ہی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے تمہیں نشہ آور سینڈوچز کھلائے۔ ڈائننگ کار کا تمام عملہ میرا زر خرید ہے۔ اب ٹرین کسی ویرانے میں رکے گی، جہاں ایک ہیلی کاپٹر منتظر ہوگا۔ میں تمہیں ہیلی کاپٹر میں ڈال کر کسی نامعلوم جگہ کی طرف لے جاؤں گا۔''
''پلیز خدا کے لیے مذاق مت کیجیے؟'' لڑکی نے بے بسی سے سر جھٹکا۔ ''اس نے ناصرہ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔ ناصرہ میری بڑی بہن ہے۔ سیف شاہ ہم سے شدید نفرت کرتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔''
''سنو لڑکی! غوث نے اس کی چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح ہم کہیں بھی نہیں پہنچ پائیں گے، تم یقیناً کچھ بتانا چاہتی ہو اور میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ تم نے جو نام لیے ہیں، میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا۔ میں تو ابھی تک تمہارے نام سے بھی واقف نہیں ہو سکا ہوں۔''
''آئی ایم سوری...... میرا نام ندرت ہے۔ میڈیکل کی سال دوم کی طالبہ ہوں۔ دراصل ناصرہ کی وجہ سے اس میں قدر پریشان ہوں۔ گزشتہ کئی ہفتے سے اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اس مرتبہ جب ماہانہ جیب خرچ کا منی آرڈر بھی نہیں آیا تو میری پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن اس کے گھر نثار پور فون بھی کرتی رہی ہوں لیکن کوئی جواب نہیں ملتا۔ بالآخر میں نے سیف شاہ سے فون پر رابطہ قائم کیا تو اس نے بتایا کہ طلاق کا معاملہ طے ہونے کے بعد سے اس کی ناصرہ سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں یہ بتاتی چلوں کہ سیف شاہ ناصرہ کا شوہر تھا۔ جس نے اسے ہمیشہ کرب اور اذیت میں مبتلا رکھا۔ طلاق کا فیصلہ ہونے کے بعد پہلے سے طے شدہ شرائط کے مطابق ناصرہ کو اس کی آدھی جائیداد ملنا چاہیے لیکن سیف شاہ نے یہاں بھی اسے فریب دیا اور اپنے آپ کو دیوالیہ ظاہر کر کے اسے محض ایک مکان پر ٹرخا دیا۔ حالانکہ اس کا شمار اب بھی کروڑ پتیوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے سیف انٹرپرائز کا نام تو سنا ہوگا۔ یہ اسی کی کمپنی کا نام ہے۔''
''اوہ سیف شاہ! میں نے صرف اس کا نام سنا ہے، کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وہ تو اچھی شہرت کا مالک نہیں ہے۔ تمہاری بہن نے اس سے شادی کیسے کرلی؟''
''یہ بات میں اب تک نہیں سمجھ سکی لیکن اتنا جانتی ہوں کہ ناصرہ مجھے مستقبل کا تحفظ فراہم کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اپنی تعلیم پوری کرلوں لیکن شادی کے دوسرے ہی روز سیف شاہ نے جو رویہ اختیار کیا۔ اس سے اسے شدید نفرت ہوگئی۔''
''اور اب تمہارا کیا خیال ہے کہ ناصرہ کی گمشدگی میں سیف شاہ کا ہاتھ ہے؟''
''ہاں گزشتہ روز جب میں نے اس سے فون پر بات کی تو اس کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔ سیف شاہ ایسا شخص ہے کہ اس سے کسی بھی برے کام کی توقع کی جاسکتی ہے۔''
''کیا یہ ممکن نہیں کہ تمہاری بہن خود کہیں چلی گئی ہو؟''
''آپ ناصرہ کو نہیں جانتے، اس لیے کہہ رہے ہیں۔ وہ میری خیریت معلوم کرنے کے لیے ہفتے میں ایک مرتبہ مجھے فون ضرور کیا کرتی تھی۔ رقم بھی ہر مہینے باقاعدگی سے بھیجا کرتی تھی، وہ مجھے اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی۔''
''تو گویا اب تم ناصرہ کی تلاش میں جا رہی ہو؟ مگر تم تو نئی بستی جا رہی ہو؟''
''ہاں جب ٹرین پر سوار ہوئی تھی تو خیال تھا کہ پہلے نئی بستی جاؤں لیکن اب سوچ رہی ہوں کہ نثار پور اتر جاؤں۔ ڈیڈی کی موت کے بعد ناصرہ کا گھر ہی میری پناہ گاہ رہا ہے۔ اگر ناصرہ کو کچھ ہوگیا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے ندرت کی آنکھیں نم ہوگئیں، وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔
''کچھ دیر پہلے میں نے جو سخت اور غیر اخلاقی رویہ اختیار کیا تھا۔ اس کے لیے میں معافی چاہتی ہوں۔''

''اس بات کو بھول جاؤ، میں بھی نثار پور جا رہا ہوں۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک گیراج میں میری کار موجود ہے۔ تمہیں تمہارے گھر پر ڈراپ کردوں گا۔'' غوث بیگ نے کہا۔ ندرت کی آنکھوں میں شکر گزاری کے تاثرات ابھر آئے۔

جب وہ نثار پور اسٹیشن پر اترے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ گیراج زیادہ دور نہیں تھا، جہاں غوث کی کار موجود تھی۔ اس نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا اور اوپر سے گھومتا ہوا اسٹیئرنگ کے سامنے آ بیٹھا۔ ندرت بھی دبک کر بیٹھ گئی۔ غوث اس کے بتائے ہوئے راستوں پر گاڑی چلاتا رہا۔ بالآخر وہ شہر کے آخری سرے پر اس علاقے میں پہنچے، جہاں رہائشی مکان ایک دوسرے سے فاصلے پر بنے ہوئے تھے، ندرت کے اشارے پر اس نے گاڑی ایک ڈھلوان سڑک پر موڑ کر روک لی، سامنے ہی سرخ اینٹوں کا وہ مکان نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں کار سے اتر کر چند لمحے مکان کے خالی پورچ کو دیکھتے رہے۔ پھر غوث بیگ نے آگے بڑھ کر کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ مکان کے اندر، دور کہیں مدھم سی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔

لیکن جوابی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ غوث نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ دروازہ مقفل تھا۔ وہ مکان کے پہلو والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی بند تھا۔ غوث ندرت کی طرف مڑا جو بیگ کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے اس سے تقریباً چپکی کھڑی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ گھر پر کوئی نہیں ہے۔'' غوث اندھیرے میں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے بھی یہ ہی شبہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا، اب کیا کروں؟''

ندرت کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

''کیا آپ کسی طرح تالا کھول سکتے ہیں۔''

''اگر نقب زنی کے الزام میں دھر لیا گیا تو......؟''

''یہ مکان میری بہن کی ملکیت ہے اور میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔'' ندرت نے جواب دیا۔

غوث بیگ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ جس میں اسٹیل کا مڑا تڑا ایک تار بھی موجود تھا۔ اس تار کی مدد سے تالا کھولنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی، اندر داخل ہوتے ہی اس نے ٹٹول کر بتی جلائی، یہ ایک کشادہ اور صاف ستھرا کچن تھا۔ چیزیں اگرچہ سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں لیکن ہر چیز پر گرد کی ہلکی سی تہ نظر آ رہی تھی۔ ڈبے میں پڑی ہوئی ڈبل روٹی پر پھپھوندی لگ چکی تھی۔ فریج میں کئی انچ موٹی برف جمی ہوئی تھی۔ فریج کے فریزر میں گوشت کا ایک ٹکڑا بھی موجود تھا، جو برف کی تہہ میں چھپا ہوا تھا۔ نچلے خانے میں دودھ کی بوتل نظر آ رہی تھی۔ جس میں اگرچہ آدھے کے قریب دودھ موجود تھا لیکن جم چکا تھا۔

''میرا خیال ہے، تمہاری بہن تقریباً ایک ہفتے سے اس گھر میں داخل نہیں ہوئی، کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اس کے کپڑوں کی الماری چیک کرلی جائے؟'' غوث بیگ بولا۔ ''اگر وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے تو یقیناً کچھ کپڑے بھی ساتھ لے گئی ہوگی۔''

ندرت کچھ دیر الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اسے اشارہ کرتی ہوئی شان دار فرنیچر سے آراستہ نشست گاہ سے گزر کر ناصرہ کی خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔ خوب صورت اور آرام دہ ندرت تو کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھ گئی اور غوث ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں میں جھانکنے لگا۔ بظاہر کوئی کام کی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

لیکن سب سے نیچے والی دراز میں تہہ شدہ رومال کے نیچے سٹی بینک ڈپازٹ بک اور چیک بک مل گئی، ڈپازٹ بک کی آخری سلپ میں چودہ مارچ کی تاریخ میں ناصرہ کے اکاؤنٹ میں تین کروڑ روپے جمع کرائے گئے تھے۔ چیک بک بھی ناصرہ کے نام کی تھی، اس کی اکاؤنٹ فائل بتا رہی تھی کہ تین لاکھ رقم جمع کرانے کے تین روز بعد رقم نکلوانے کا سلسلہ

شروع ہو گیا۔ سترہ مارچ کو بیس لاکھ، بیس مارچ کو ایک لاکھ اور بائیس مارچ کو تین لاکھ نواسی ہزار روپے نکلوائے گئے تھے۔ اس طرح اکاؤنٹ میں صرف آٹھ لاکھ کی رقم رہ گئی تھی۔

''ناصرہ کے چند جوڑے الماری سے غائب ہیں۔'' ندرت کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ ''یہ جوڑے میں اکثر و بیشتر اسے پہنے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔''

''تب پھر وہ یقیناً کہیں اپنی مرضی سے گئی ہے۔'' غوث بیگ نے جواب دیا۔ حالانکہ یہ بات اسے خود شبے میں مبتلا کر رہی تھی کہ اتنی بڑی رقم نقد پرس میں ڈال کر کوئی بھی عورت اکیلی کہیں نہیں جاسکتی۔ اس نے رقم کے بارے میں ندرت کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھتے ہوئے چیک بک خاموشی سے اپنی جیب میں ڈال لی۔

''مجھے بتائے بغیر ناصرہ ایسا نہیں کرسکتی۔'' ندرت الماری بند کرتے ہوئے بولی۔

''ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتی ہیں، وہ مجھے اطلاع دیے بغیر اس طرح کہیں نہیں جاسکتی، اگر از خود کہیں گئی بھی ہوتی تو بعد میں مجھے ضرور اطلاع دے دیتی۔''

''کیا اس کے پاس کوئی گاڑی بھی ہے؟'' غوث نے پوچھا۔

''ہاں گرے رنگ کی ایک گاڑی ہے، پچھلے سال کا ماڈل......''

''اگر تمہیں کسی پر شبہ ہے تو پولیس رپورٹ کیوں نہیں کردیتیں؟''

''نہیں، ناصرہ اس بات کو پسند نہیں کرے گی لیکن اس کے برعکس میں کسی اور سے مدد کی درخواست کرنے کی سوچ رہی ہوں۔'' ندرت نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں، غوث کو اس کے مطلب سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر مدھم لہجے میں بولی۔

''پلیز انکار نہ کریں، میں اگرچہ فی الوقت آپ کی فیس ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں لیکن آپ چاہیں تو مجھے اس کرب سے نجات دلا سکتے ہیں۔ سیف شاہ میری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں لیکن میرا کیس سننے کے بعد آپ اس پوزیشن میں ہوں گے کہ اس سے باز پرس کرسکیں۔''

''فیس کو تو خیر تم بھول جاؤ لیکن تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ ناصرہ کی گم شدگی میں سیف کا ہی ہاتھ ہے؟''

''اس سے کچھ بعید نہیں، طلاق کے فیصلے کے وقت وکیل کے دفتر میں اس نے ناصرہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ اپنی ایک ایک پائی وصول کرلے گا۔ یہ مجھے ناصرہ ہی نے بتایا تھا شادی کے بعد وہ کئی مرتبہ ناصرہ کو پیٹ بھی چکا تھا۔''

''طلاق کے بعد ناصرہ کو کیا ملا تھا؟''

''تیس لاکھ کی رقم نقد، مکان اور ایک وہ کار جو ناصرہ کے استعمال میں تھی۔ اگر طلاق کا فیصلہ عدالت کے کمرے میں ہوتا تو وہ سیف سے بہت کچھ لے سکتی تھی مگر سیف نے اس کے وکیل کو آمادہ کرلیا تھا کہ وہ عدالت سے باہر ہی فیصلہ کرنے کو تیار ہے۔ ناصرہ اس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے وکیل کا مشورہ مان لیا اور اسی پر اکتفا کیا جو اسے مل رہا تھا لیکن سیف یہ سب کچھ اس سے واپس لینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔'' ندرت کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

''ٹھیک ہے، پتا بتاؤ۔ سیف کہاں مل سکتا ہے؟'' غوث بیگ نے کہا اور ندرت سسکیوں میں اسے پتا بتانے لگی۔

☆☆☆

وہ کاٹیج نما مکان شاہ بلوط کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ چاروں طرف وسیع و عریض لان تھا۔ جس کے گرد تقریباً چھ فٹ اونچی دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ غوث بیگ نے گاڑی گیٹ کے باہر ہی روک دی اور نیچے اتر کر مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ جو گیٹ سے تقریباً سو گز کی دوری پر واقع تھا۔ کھلی ہوئی سڑکوں سے

واپس آنے والی روشنی ٹیرس کے کچھ حصے کو روشن کر رہی تھی۔ جب کہ باقی حصہ تاریک تھا۔ روشنی اور تاریکی کے سنگم پر ایزی چیئر پر ایک عورت دراز تھی۔ اس کی چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے اور وہ آنکھیں بند کیے نہ جانے کس سوچ میں غرق تھا۔

اس خوب صورت چہرے کو دیکھ کر کسی چینی گڑیا کا خیال ذہن میں ابھرتا تھا۔ غوث بیگ کے قدموں کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر اونچی آواز میں بولی۔

''کون ہے؟''

''کیا مسٹر سیف شاہ گھر پر موجود ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔'' غوث بیگ اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

''وہ باتھ روم میں ہیں۔ اگر کوئی کام ہو تو مجھ سے کہہ دو، میں اس ریچھ کی سیکریٹری ہوں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔ غوث کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ نشے میں تھی۔ اس کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی کھڑکی کی طرف سے ایک بھاری آواز ابھری۔

''کون ہے؟''

غوث نے آواز کی سمت دیکھا۔ اگر وہ سیف تھا تو لڑکی نے اس کے بارے میں غلط نہیں کہا تھا۔ چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا قد، بھاری بھرکم جسم، جو گردن تک سیاہ بالوں میں ڈھکا ہوا تھا اور کھوپڑی کے عین وسط میں چھوٹا سا چٹیل میدان نظر آ رہا تھا۔ ریچھ سے مشابہت رکھنے والا وہ شخص سیف ہی تھا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا غوث بیگ کو گھورتا رہا اور پھر غائب ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے ٹیرس پر نمودار ہوا تو بیگ کو اس کی پھرتی کی داد دینا پڑی۔

اس جیسے بھاری بھرکم شخص سے اس پھرتی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ یقیناً باتھ روم سے نکلا تھا اور صرف نیکر پہنے ہوئے تھا۔ بالوں سے ڈھکے ہوئے جسم سے پانی ٹپک ٹپک کر فرش پر جمع ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں پکڑا ہوا تولیہ کندھے پر ڈال لیا اور غوث بیگ کو گھورتے ہوئی بولا۔

''کون ہو اور کس سے ملنا چاہتے ہو؟''

''تم ہی سے ملنا چاہتا ہوں۔ مسٹر سیف شاہ!'' غوث بیگ اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ ''میرا نام غوث بیگ ہے، تم مجھ سے یقیناً متعارف ہو گے۔ غیر معروف نہیں ہوں۔ میں تمہاری بیوی کی گمشدگی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میری کوئی بیوی نہیں ہے اور نہ ہی فی الحال شادی کا کوئی ارادہ ہے۔ ایک تجربے سے گزرنے کے بعد دوبارہ اس حماقت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' سیف شاہ نے جواب دیا، اس کا لہجہ تلخ تھا۔

''میں تمہاری سابقہ بیوی کی بات کر رہا ہوں، مسٹر سیف شاہ!'' بیگ نے کہا۔

''ناصرہ!'' سیف شاہ کی آنکھوں میں مکارانہ سی چمک ابھر آئی۔

''کیا ہوا ہے اسے؟''

''یہی معلوم کرنے کے لیے تو یہاں آیا ہوں۔''

''اوہ...... تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ میں اس کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ کیا تم ندرت سے مل کر آ رہے ہو؟ اگر ایسا ہے تو اس کی بات پر یقین کر لینا حماقت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اپنی بہن کی طرح وہ بھی مجھ سے نفرت کرتی ہے، مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے ناصرہ جیسی لڑکی سے شادی کی تھی۔ یہ دونوں بہنیں انتہائی خطرناک ہیں، وہ مجھے کنگال کر دینا چاہتی تھیں۔ غنیمت ہے کہ پچاس لاکھ کی رقم میں جان چھوٹ گئی، ورنہ وہ نجانے کس حالت میں پہنچا دیتیں۔''

''میرا خیال ہے طلاق کا فیصلہ ہونے پر آپ نے ناصرہ کو صرف تیس لاکھ کی رقم ادا کی تھی۔'' غوث بیگ بولا۔

''تیس لاکھ روپے نقد دیے تھے۔ مکان اور کار کی قیمت لگاؤ تو یہ رقم پچاس لاکھ ہی بنے گی۔'' سیف

نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔
غوث بیگ کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔ اس مکان کی قیمت بھی اس کے اندازے میں پندرہ سولہ لاکھ سے کم نہیں تھی۔

''یہ مکان تم نے طلاق کے بعد خریدا ہوگا۔ گویا اب بھی تم خاصے دولت مند آدمی ہو؟'' وہ بولا۔

''میں دن رات محنت کر کے دولت کماتا ہوں۔ تین سال پہلے جب ناصرہ سے میری شادی ہوئی تو اس کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے تین سال تک مجھے سولی پر لٹکائے رکھا اور اب وہ کہیں عیش کر رہی ہوگی۔ ناصرہ شاید ذہنی عارضے میں مبتلا تھی۔''

''میں نے سنا ہے کہ تم نے یہ سب کچھ اس سے واپس لینے کی دھمکی دی تھی؟''

''اس کا مطلب ہے تم واقعی ندرت سے مل چکے ہو۔'' سیف شاہ نے اسے گھورا۔

''یہ درست ہے کہ میں نے اس قسم کے کچھ الفاظ کہے تھے لیکن میرا ان پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ غصے میں آدمی نجانے کیا اول فول بکنے لگتا ہے۔ اس وقت بھی اپنے حواس میں نہیں تھا۔'' اس نے خاموش ہو کر لڑکی کی طرف دیکھا جو کرسی سے اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اندر جا رہی تھی۔ وہ جیسے ہی دروازے سے غائب ہوئی، سیف شاہ نے غوث بیگ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''تم ناصرہ کی گمشدگی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ کہاں ہے؟ اسے کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا۔''

''وہ لاپتا ہے اور اس کے ساتھ تیس لاکھ روپے کی رقم بھی غائب ہے۔'' غوث نے اس سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض دس بیس روپے کی خاطر قتل کر دیتے ہیں۔''

''کیا اس نے رقم بینک میں جمع نہیں کرائی تھی؟ اسے اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اتنی بڑی رقم ساتھ لے کر چل دے گی۔''

''اس نے یہ رقم بینک میں جمع کروا دی تھی لیک
اس کے بعد مختلف وقفوں سے یہ رقم نکلوالی تھی۔ تم
اسے ڈرافٹ کب دیا تھا؟'' غوث نے پوچھا۔

''بارہ یا تیرہ مارچ کو...... گیارہ تاریخ کو طلا
کے آخری فیصلے پر دستخط ہوئے ہیں، ڈرافٹ اس کے حوالے کرنے کے بعد سے اب تک میری اس سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ میری سیکریٹری دردا
اس سے مل چکی ہے، اسے میں نے اپنے چند ضرور
کپڑوں اور بعض ضروری چیزیں لینے کے لیے گھ
بھیجا تھا۔ دردانہ کے بیان کے مطابق وہ بہت خوش نظ
آ رہی تھی، اس دوران ناصرہ نے غالباً کسی اور شخص سے تعلقات استوار کر لیے تھے۔ کیونکہ دردانہ کے کہنے کے مطابق وہاں ایک مرد بھی موجود تھا۔ ممکن ہے اس شخص کے تعلقات ناصرہ سے بہت پہلے سے رہے ہوں اور طلاق کے بعد انہیں کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا ہو۔''

''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟''

''نہیں اور نہ ہی اس کے بارے میں جاننے کی ضرورت سمجھتا ہوں۔''

''کیا تمہارے پاس ناصرہ کی کوئی تصویر موجود ہے؟''

''چند تصویریں تھیں، جنہیں میں نے ضائع کر دیا۔ اگر تم اس کا حلیہ جاننا چاہتے ہو تو ندرت کو دیکھ لو، ناصرہ اس سے تین چار سال بڑی تھی۔ اس کے علاوہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ندرت کے پاس اس کی کوئی نہ کوئی تصویر ضرور ہوگی اور ہاں اسے یہ بھی کہہ دینا کہ آئندہ کسی جاسوس کو میرے پیچھے لگانے کی کوشش نہ کرے، ورنہ اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ میں ایک باعزت آدمی ہوں اور اس قسم کی باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔''

غوث جواب دینے کے بجائے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سے ایک آدمی اندر داخل ہو کر ان ہی کی طرف آ رہا تھا۔ وہ مقامی تھانے کا ایک کانسٹیبل تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے سلام کیا اور پھر

سیف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''اس مداخلت کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل احمد پور کا پولیس آفیسر گرے رنگ کی گاڑی کے بارے میں کچھ معلوم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کار کا رجسٹریشن آپ کے نام ہے سیف صاحب!'' کانسٹیبل نے کار کا لائسنس نمبر بھی بتا دیا۔
''یہ کار میری تھی لیکن اب اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ میری سابقہ بیوی ناصرہ کی ملکیت ہے غالباً وہ رجسٹریشن تبدیل کرانا بھول گئی ہے۔''
''آپ کی سابقہ بیوی رجسٹریشن کرانا ہی نہیں بلکہ اس کار کو بھی بھول گئی ہیں۔ چونکہ یہ کار گزشتہ ایک ہفتے سے جھیل کی قریب کھڑی تھی۔ جسے بالآخر صبح پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا ہے۔ کیا آپ ناصرہ بی بی کا پتا بتا سکتے ہیں؟''
''مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کہاں ہوگی۔ میں نے تو کئی دنوں سے اسے دیکھا بھی نہیں۔'' سیف شاہ نے جواب دیا۔
''آپ کا مطلب ہے کہ وہ لاپتا ہو چکی ہیں۔'' کانسٹیبل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''میں نے کب کہا...... لیکن تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' سیف شاہ نے اسے گھورا۔
''مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے مسٹر سیف کہ احمد پور پولیس اسٹیشن سے ملنے والی رپورٹ کے مطابق کار کی اگلی سیٹ پر خاصی مقدار میں خون بکھرا ہوا پایا گیا ہے۔ ابھی تک یہ طے نہیں کیا جاسکا کہ یہ کسی انسان ہی خون ہے۔ یا کسی جانور کا لیکن بہر حاصل صورت حال خاصی مشتبہ اور تشویش ناک ہے۔''
''مائی گاڈ۔'' سیف شاہ کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ ''تمہارے آنے سے پہلے ہم کچھ ایسی ہی باتیں کررہے تھے۔'' پھر اس نے غوث بیگ کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا اور ندرت کا شبہ درست ہی تھا۔''
''کیسا شبہ سیف صاحب!'' کانسٹیبل نے سیف کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔

''میں اور غوث بیگ ناصرہ ہی کے بارے میں باتیں کرر ہے تھے۔ غوث بیگ ایک پرائیوٹ سراغ رساں ہیں اور ناصرہ کی تلاش کے سلسلے میں، میں ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔'' سیف نے جس طرح پینترا بدلا تھا، غوث کو اس پر شدید حیرت ہوئی لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی سیف اس کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔
''ہاں تو مسٹر غوث بیگ! آپ نے کتنی رقم ایڈوانس مانگی تھی؟ پچیس ہزار ٹھیک ہے۔ میں ناصرہ کو ہر قیمت پر تلاش کرانا چاہتا ہوں۔ میں اس کے لیے بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کے لیے تیار ہوں۔''
''ٹھیک ہے، فی الحال پچیس ہزار ہی دے دیجیے۔ حساب بعد میں ہوتا رہے گا۔'' غوث نے جواب دیا۔ سیف اگرچہ بہت چالاک بننے کی کوشش کررہا تھا لیکن غوث بیگ نے بھی طے کرلیا کہ اگر ممکن ہوا تو اسی کے خرچ پر اسے پھانسی کے تختے پر نہیں تو سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ پولیس کانسٹیبل اپنے مطلب کی کچھ باتیں اس سے معلوم کرکے رخصت ہوگیا۔ غوث کچھ دیر تک سیف شاہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا۔
''کچھ دیر پہلے تم نے بتایا تھا کہ ناصرہ کسی قسم کے ذہنی عارضے میں مبتلا تھی۔ کیا تم اس کی وضاحت کرسکتے ہو؟''
''وہ نفسیاتی مریضہ تھی۔ اس کے مرض کی وضاحت تو کوئی ماہر نفسیات ہی کرسکے گا۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ کبھی کبھی اس پر مایوسی کا دورہ پڑتا تھا۔ ایسے موقع پر وہ اکثر اپنے آپ کو فتح کرلینے کی باتیں کیا کرتی تھی۔'' سیف نے جواب دیا۔ اس مرتبہ اس کے لہجے میں بےزاری کا عنصر نمایاں تھا۔ اسی دوران دردانہ دوبارہ وہاں آگئی۔
''وہ آدمی کون تھا۔ جسے تم نے اس دن ناصرہ کی گھر دیکھا تھا؟'' غوث بیگ دردانہ کی طرف متوجہ

ہوگیا۔

''میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا مگر ناصرہ اسے حیدر کے نام سے مخاطب کررہی تھی۔ وہ طویل القامت اور صحت مند آدمی تھا۔ چوڑے شانے، گھنگھریالے بال، سیاہ آنکھیں، باریک مونچھیں۔ میرے خیال میں اگر وہ فلمی دنیا کا رخ کرے تو ہیرو ن بن سکتا تھا۔'' دردانہ نے اس شخص کا حلیہ بتاتے ہوئے کہا۔

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ ان دونوں کے تعلقات خاص نوعیت کے تھے؟'' غوث بیگ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''وہ جس طرح گھر کے اندر آزادانہ طور پر گھوم رہا تھا، اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا۔ میرے ہوتے ہوئے اس نے کچن میں جاکر چائے بھی خود ہی بنائی تھی۔''

''کیا تم حیدر نامی شخص کے بارے میں کچھ جانتے ہو مسٹر سیف!'' غوث بیگ اب سیف شاہ کی طرف گھوم گیا۔

''بالکل نہیں، میں نے یہ نام ہی پہلی مرتبہ سنا ہے۔''

''آخری مرتبہ احمد پور کب گئے تھے؟''

''میں کئی مہینوں سے اس طرف نہیں جاسکا۔'' سیف نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ درست ہے۔'' دردانہ بیچ میں بول پڑی۔ ''کم از کم ناصرہ کو طلاق دینے کے بعد سیف کہیں نہیں گیا۔ میں سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہی ہوں۔'' پھر وہ سیف کی طرف مڑ گئی۔ ''تمہیں شاید وقت کا اندازہ نہیں رہا سیف! بھوک سے میری جان نکل رہی ہے۔ چلو جلدی سے کپڑے پہن لو، آج ہم مون سون میں ڈنر کریں گے۔''

دردانہ جس طرح سیف کو مخاطب کر رہی تھی، اس سے غوث بیگ کو یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دشوار پیش نہیں آئی کہ وہ سیکریٹری کے علاوہ بھی بہت کچھ تھی، وہ ان دونوں کو ٹیرس ہی میں چھوڑ کر رخصت ہوگیا۔

جب وہ شہر کی دوسری طرف پہنچا تو اس علاقے کی سڑکیں سنسان ہوچکی تھیں۔ ندرت کے مکان کی تمام بتیاں روشن تھیں۔ کار سے اتر کر اس نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ چند سیکنڈ بعد ہی برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا اور ندرت کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟''

جواب میں غوث نے اپنا نام بتایا تو وہ دروازہ کھل گیا۔ ندرت اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

''شکر ہے آپ آگئے، میں پریشان ہورہی تھی۔''

''کوئی خاص بات؟'' غوث بیگ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایک آدمی مکان کی نگرانی کررہا تھا۔ میں تاریکی کے باعث اس کی صورت تو نہیں دیکھ سکی۔ لیکن وہ بہت دیر تک ایک سیاہ رنگ کی کار میں بیٹھا مکان کو دیکھتا رہا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ پردے سے جھانک کر دیکھا تھا، ابھی دو منٹ پہلے ہی وہ یہاں سے گیا ہے۔'' ندرت نے بتایا۔

''ہوسکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔''

''غلط فہمی...... نہیں...... وہ ٹارچ کی روشنی میں مکان کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔''

''ممکن ہے وہ کوئی ایڈریس تلاش کررہا ہو اور ٹارچ کی روشنی اس نے مکان کا نمبر دیکھنے کے لیے ڈالی ہو۔''

''نہیں...... وہ مکان ہی کی نگرانی کررہا تھا۔ نجانے مجھے یہ احساس کیوں ہورہا ہے کہ ناصرہ کی گمشدگی سے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔'' وہ دیوار سے ٹیک لگا کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ چہرے سے انجانا سا خوف عیاں تھا۔

''اب سوال یہ ہے کہ تم یہاں اکیلی رہ سکتی ہو یا نہیں؟'' غوث بیگ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

''میں ابھی سیف سے مل کر آرہا ہوں۔ اسی

دوران ایک کانسٹیبل بھی وہاں آ گیا تھا۔ جس کی اطلاع کے مطابق تمہاری بہن کی کار احمد پور کی جھیل کے قریب کھڑی پائی گئی ہے۔'' اس نے کار کی سیٹ کے خون آلو ہونے والی بات جان بوجھ کر گول کر دی تھی۔

''اوہ، مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ سیف شاہ نے اسے قتل کر دیا ہوگا۔'' ندرت کی آواز بھرا گئی اور وہ باقاعدہ سسکنے لگی۔

''میرے خیال میں تمہاری بہن زندہ ہے۔ میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے احمد پور جارہا ہوں۔'' غوث بیگ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ یقین کیجیے، میں وہاں آپ کے لیے پریشانی کا باعث نہیں بنوں گی۔ ناصرہ کی شادی سے پہلے ہم کچھ عرصہ احمد پور میں رہ چکے ہیں۔ انوار صاحب ہمارے پڑوسی ہوا کرتے تھے۔ ان کی بیگم بہت نیک دل اور ہمدرد خاتون ہیں، میں ان کے ہاں رہ لوں گی۔'' ندرت نے کہا۔ اس کے لہجے میں اصرار تھا۔

غوث بیگ چند لمحے گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہتھیار ڈال دیے، ندرت کو ساتھ لے جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے ندرت کا سفر بیگ اٹھالیا، جو جوں کا توں رکھا تھا۔ باہر نکل کر اس نے دروازے کو تالا لگایا اور کار کی طرف چلنے لگا۔ ندرت اس کے ساتھ چپکی ہوئی چل رہی تھی۔

کار میں بھی وہ اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی۔ غوث بیگ انجن اسٹارٹ کر کے کار کو بیک کرنا ہی چاہتا تھا کہ ایک کار ڈرائیو وے میں داخل ہو کر اس طرح رک گئی کہ راستہ بند ہو گیا۔ غوث بیگ انجن بند کر کے نیچے اترا، وہ سیاہ رنگ کی ایک لمبی سی ڈاج کار تھی جس کی چھت پر بھی ایک چھوٹی سی سرچ لائٹ نصب تھی۔

''یہی وہ کار ہے جس میں بیٹھا ہوا آدمی مکان کی نگرانی کر رہا تھا۔'' ندرت ہکلائی۔ ڈاج کی سرچ لائٹ روشن ہو گئی۔ غوث بیگ کی آنکھیں چندھیا گئیں، اس کا ہاتھ تیزی سے جیب کی طرف بڑھا۔ لیکن اسے مایوس لوٹنا پڑا۔ پستول تو اس کے سوٹ کیس میں رکھا ہوا تھا جو کار کی ڈگی میں بند تھا۔ وہ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے کار کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک ہی پستول والا ایک ہاتھ روشنی میں آ گیا۔ غوث بیگ چند سیکنڈ بعد لمبے تڑنگے آدمی کو دیکھنے کے قابل ہو سکا جو ڈاج سے اتر کر اس پر پستول تانے کھڑا تھا۔ وہ نیلے سرخ سوٹ میں ملبوس تھا۔

''اطہر کہاں ہے؟'' اس کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی۔

اطہر...... یہ کون ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ نام سنا ہے۔'' غوث بیگ نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''حیدر اطہر! تم حقیقتاً اسے جانتے ہو اور جھوٹ بول کر اپنی جان نہیں چھڑا سکتے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔ پستول کی نال اب غوث بیگ کے سینے کو چھو رہی تھی۔ غوث بیگ کے دل میں اس شخص کو اس حرکت کا مزا چکھانے کی خواہش مچلی لیکن معمولی سی حرکت اس وقت اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

''تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر! میں حیدر اطہر کو نہیں جانتا۔''

''بکواس۔'' وہ شخص دہاڑا۔ ''مکان یہی ہے اور کار میں بیٹھی ہوئی یہ لڑکی اسے تو میں ہزاروں میں پہچان سکتا ہوں۔ نیچے آ جاؤ لڑکی۔''

''نہیں، میں باہر نہیں آؤں گی۔'' ندرت کی مردہ سی آواز سنائی دی۔

''کار سے اتر آؤ لڑکی! ورنہ تمہارے اس عاشق کی کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔'' اس شخص کے چہرے پر درندگی سی چھا گئی، اس نے ایک قدم ہٹ کر پستول کا رخ غوث بیگ کے سر کی طرف کر دیا۔

ندرت دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی، اس کا بدن

خوف کی شدت سے ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ وہ غوث بیگ کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔ غوث بیگ نے کن انکھیوں سے ندرت کی طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی اجنبی پر جھپٹ پڑا۔ اس نے اجنبی کے پستول والے ہاتھ پر گرفت جمانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور پوری قوت سے پستول والے ہاتھ سے اس کی گردن پر ضرب رسید کردی۔ پستول کا دستہ غوث کے کان پر لگا اور اس کی آنکھوں کے گرد تارے ناچ گئے اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنی کار سے ٹکرایا۔ اس کے کان کی پچھلی طرف کی کھال پھٹ گئی تھی، جس سے خون بہہ رہا تھا۔

ندرت کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اس جیسی لڑکی سے کسی مداخلت کی توقع نہیں تھی لیکن اس نے نہایت جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئی اجنبی پر چھلانگ لگادی۔ اجنبی اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور ندرت اپنی ہی جھونک میں منہ کے بل پختہ روش پر گری۔ اجنبی نے ایک بار پھر غوث بیگ کو پستول کی زد میں لے لیا اور ندرت کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"اٹھ جاؤ لڑکی! اس مرتبہ ایسی کوئی حرکت تم دونوں میں سے کسی ایک کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔ ویسے کیا تم یہ بتانا پسند کروگی کہ بیک وقت تم نے کتنے عاشق پال رکھے ہیں؟"

"یہ میرا عاشق نہیں ہے۔ تم کون ہو اور ناصرہ کہاں ہے؟" ندرت چیخی۔

"یہ بھی خوب رہی۔" اجنبی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔ "یعنی تم خود ناصرہ ہو اور پوچھ رہی ہو کہ ناصرہ کہاں ہے؟ سوال یہ ہے کہ حیدر اطہر کہاں ہے؟"

"میں کسی حیدر کو نہیں جانتی۔" ندرت کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"تم یقیناً جانتی ہو ناصرہ بیگم! میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر تم مجھے اس کے بارے میں بتادو تو یقین کرو، تم دونوں میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"تم بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو مسٹر!" ندرت بولی۔ "میں ناصرہ نہیں ہوں۔ میں اس کی چھوٹی بہن ندرت ہوں۔"

"بکومت۔ اپنا چہرہ روشنی کی طرف کرلو تاکہ میں تمہیں اچھی طرح دیکھ سکوں۔" اجنبی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ندرت اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس طرح کھڑی ہوگئی کہ اس کا چہرہ پوری طرح روشنی میں آ گیا۔

اجنبی چند لمحے اس طرف دیکھتا رہا پھر پستول الٹے ہاتھ میں منتقل کر کے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تصویر نکال لی۔ کبھی وہ تصویر کو دیکھتا اور کبھی ندرت کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا وہ ان دونوں میں کسی قسم کا موازنہ کررہا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار ابھر آئے، وہ ایک بار پھر ندرت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ تصویر والی لڑکی کے مقابلے میں تم نہ صرف کم عمر نظر آرہی ہو۔ بلکہ قدرے دبلی بھی ہو۔ کیا یہ تمہاری بہن ہے؟" اس نے تصویر ندرت کی طرف بڑھادی۔

"ہاں، یہ ناصرہ ہے۔ میری بہن۔" ندرت نے تصویر ہاتھ میں لیتے ہوئے جواب دیا۔ غوث بیگ کی آنکھیں بھی تصویر کی اٹھ گئیں۔ تصویر میں دو چہرے تھے۔ لڑکی کا چہرہ اس حد تک ندرت سے مشابہ تھا کہ آسانی سے دھوکا کھایا جاسکتا تھا لیکن غور سے دیکھنے پر عمر کا فرق محسوس کیا جاسکتا تھا۔ وہ ندرت سے تقریباً چار سال بڑی تھی، دوسرا چہرہ ایک آدمی کا تھا۔ دراز قد خوبرو اور پتلی مونچھیں، لڑکی مرد کا ہاتھ تھامے اس پر تقریباً جھکی کھڑی تھی۔ یہ تصویر غالباً کسی اسٹوڈیو میں کھنچوائی گئی تھی کیونکہ لڑکی کے دائیں طرف خوب صورت اسٹینڈ پر ایک گلدان بھی نظر آرہا تھا۔

”یہ آدمی کون ہے؟“ غوث نے پوچھا۔
”حیدر اطہر...... جس کی مجھے تلاش ہے۔“
اجنبی نے ندرت کے ہاتھ سے تصویر جھپٹ لی۔
”یہ تصویر میں نے اسٹوڈیو سے بڑی مشکل سے حاصل کی ہے۔ کچھ عرصہ قبل یہ لڑکی حسین آباد آئی ہوئی تھی اور ان دونوں کو اکثر اکٹھے دیکھا گیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے ہوٹل کے کلرک کو رشوت دے کر اس کا پتا حاصل کر سکا ہوں۔“
”ناصرہ سے تم کیا چاہتے ہو؟“
”کچھ بھی نہیں، اس لڑکی سے میرا کوئی مطالبہ نہیں۔ مجھے تو حیدر کی تلاش ہے جس کے بارے میں صرف یہ ہی بتا سکتی ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ اب تم یہ پوچھو گے کہ مجھے حیدر کی تلاش کیوں ہے؟ وہ میرا ملازم تھا جو اطلاع دیے بغیر کئی ہفتوں سے غائب ہے۔“ اجنبی نے کہتے ہوئے پستول کی نال ندرت کی طرف گھمادی۔ ”لڑکی! کیا تم بتا سکتی ہو کہ تمہاری بہن کہاں ہے؟“
”مجھے نہیں معلوم...... اگر جانتی بھی ہوتی تو تمہیں اس کا پتا کبھی نہ بتاتی۔“ ندرت نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔
”میری بات کا جواب دو لڑکی...... ورنہ میں گھی ٹیڑھی انگلیوں سے بھی نکالنا جانتا ہوں۔“ اجنبی غرایا۔
”بات یہ ہے مسٹر کہ ناصرہ کئی روز سے لاپتا ہے۔ آج پولیس سے اطلاع ملی ہے کہ اس کی کار احمد پور جھیل کے کنارے کھڑی پائی گئی ہے، جس کی اگلی سیٹ پر خون کے دھبے بھی پائے گئے ہیں۔“ غوث بیگ نے کہا۔
”میں تم سے نہیں اس لڑکی سے پوچھ رہا ہوں۔“ اجنبی نے غوث کو گھورا پھر بولا۔ ”اگر ناصرہ لاپتا ہے تو پھر حیدر کہاں ہے؟“
”میرا خیال ہے، وہ اس کی رقم لے کر کہیں غائب ہو گیا ہے۔“ اس مرتبہ بھی غوث بیگ نے ہی جواب دیا۔

”آپ نے مجھے پہلے نہیں بتایا تھا۔ میرا مطلب ہے گاڑی کی سیٹ پر خون کے دھبے......“ ندرت نے متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
”میں تمہیں یہ سب کچھ بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ غوث بیگ نے جواب دیا۔
”اوہ، اس کا مطلب ہے وہ کم بخت اس لڑکی کو بھی دھوکا دے گیا۔ اس کے پاس کتنی رقم تھی؟“ اجنبی نے پوچھا۔
”تین لاکھ روپے...... کیا وہ تمہاری بھی کچھ رقم لے گیا ہے؟“ غوث بیگ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
”میں ایک چھوٹی سی فرم کا مالک ہوں اور حیدر اطہر میرا اکاؤنٹنٹ تھا۔ بہرحال تم دونوں منہ پھیر کر کھڑے رہو۔ کم از کم دس منٹ تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے اور نہ ہی کسی کو مدد کے لیے پکارو گے۔“ اجنبی کہتا ہوا پھرتی سے کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے انجن سٹارٹ کیا اور کار کی بتیاں بجھادیں اور دوسرے ہی لمحے کار ریورس میں چلتی ہوئی سڑک پر پہنچی اور ایک لمحہ وہاں رک کر ایک زبردست جھٹکے سے تاریکی میں غائب ہوگئی۔
تقریباً دو منٹ بعد غوث بھی ندرت کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا اپنی کار کی طرف لپکا۔ اجنبی کی کار کو تلاش کرنا بے کار تھا۔ دو منٹ کا یہ وقفہ اس کے لیے کافی تھا۔ غوث کچھ دیر تک مختلف سڑکوں پر گھومتا رہا پھر اس نے کار کو احمد پور جانے والی سڑک پر گھمادیا۔
جب وہ لوگ احمد پور پہنچے تو رات اپنا نصف سفر طے کر چکی تھی لیکن انوار کے مکان میں اب بھی روشنی نظر آرہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔
”وہ گلی کے سرے سے دوسرا گھر ہمارا ہے۔“ ندرت نے ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”ناصرہ کی شادی سے پہلے ہم یہیں رہا کرتے تھے۔“
غوث نے گاڑی روک لی اور نیچے اتر کر ندرت

کے بتائے ہوئی دروازے پر دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھل گیا اور ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر عورت کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ پہلے تو چند لمحے غوث کو الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر اس کے ساتھ ندرت کو دیکھ کر کھل سی اٹھی۔

''ارے ندرت! تم کہاں کھو گئی تھیں؟ میں کئی مرتبہ تمہارے ہوسٹل فون کر چکی ہوں، لیکن وہاں بھی کسی کو علم نہیں تھا کہ تم اطلاع دیے بغیر کہاں غائب ہو؟''

''آنٹی!'' ندرت دوڑ کر ان کے سینے سے لپٹ گئی۔ ناصرہ کو کچھ ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کہاں غائب ہے، شاید کسی نے اسے قتل کر دیا ہے۔''

''ناصرہ زندہ ہے مگر اس کی حالت مخدوش ہے۔ بہت بری طرح زخمی ہے۔'' آنٹی نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

''ناصرہ زندہ ہے......؟ کیا آپ نے اسے دیکھا ہے۔ وہ کہاں ہے؟'' ندرت ایک دم چونک سی گئی۔

''ہاں، وہ زندہ ہے مگر تم آہستہ بولو، انوار سو رہا ہے۔ اسے صبح سویرے ڈیوٹی پر جانا ہے ناصرہ ایک نرسنگ ہوم میں ہے، اس کا چہرہ بری طرح زخمی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی مگر چہرے کی پلاسٹک سرجری کرانا پڑے گی۔ اس کے چہرے کو اس بری طرح کچلا گیا ہے کہ شناخت کرنا مشکل ہے۔''

''اوہ، وہ کون تھا؟ ایسا کیا کس نے؟'' ندرت چیخی۔

''ناصرہ کا ایک نیا دوست حیدر اطہر، اس نے ناصرہ کو اس حالت تک پہنچایا ہے۔ بدمعاش کہیں کا۔ کاش وہ ایک مرتبہ میرے ہاتھ آ جائے۔'' آنٹی نے دانت کچکچائے پھر غوث کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ کون ہے؟ تم نے تعارف نہیں کرایا۔''

''یہ غوث بیگ ہیں، ایک پرائیوٹ سراغ رساں اور میرے محسن۔'' ندرت نے تعارف کرایا۔

''ناصرہ کے ساتھ یہ واقعہ تقریباً ایک ہفتے پہلے پیش آیا تھا۔'' آنٹی ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''مجھے بھی آج صبح ہی اطلاع ہوئی ہے۔ وہ پولیس کو اس واقعے کی اطلاع نہیں دینا چاہتی تھی۔ پھر آج ہی اس نے اپنی کار کے بارے میں اخبار میں پڑھا تھا کہ وہ پولیس کی تحویل میں پہنچ گئی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس واقعے کی شہرت ہوئے بغیر کار واپس مل جائے۔''

''کیا آپ نے کار کے سلسلے میں پولیس سے رابطہ قائم کیا تھا؟'' غوث نے پوچھا۔

''نہیں، مجھے انوار نے منع کر دیا تھا۔ کیوں کہ اس طرح ہم بھی اس معاملے میں ملوث ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹر نے بھی ناصرہ کے زخمی ہونے کی پولیس کو اطلاع نہیں دی۔ وہ ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم ہے اور پیسے کے لالچ سے ان کا منہ بند رکھا جا سکتا ہے۔''

''یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا؟'' غوث بیگ نے پوچھا۔

''اندر آ جاؤ۔ میں بھی کتنی بدحواس ہو رہی ہوں کہ ابھی تک تم لوگوں کو باہر ہی روکے رکھا ہے۔ پہلے میں تم لوگوں کے لیے چائے بناتی ہوں۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے، تم لوگوں کو بتا دوں گی۔'' آنٹی نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

''ناصرہ کون سے اسپتال میں ہے؟'' ندرت نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''میں فوراً اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''ذاکر پرائیوٹ اسپتال...... لیکن اس وقت بند ہوگا۔ صبح سے پہلے ملاقات ممکن نہیں۔''

''نہیں، میں ابھی جانا چاہتی ہوں۔ جب تک ناصرہ کو نہ دیکھ لوں مجھے چین نہیں ہے۔ چائے ہم بعد میں آ کر پی لیں گے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیے۔'' ندرت نے ضد کی۔

''ٹھیک ہے، میں چادر اوڑھ لوں، پھر چلتے ہیں۔'' آنٹی انہیں نشست گاہ میں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں لیکن ان کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ وہ تینوں باہر آ گئے، آنٹی نے دروازہ

باہر سے مقفل کر دیا تھا۔ کار کے قریب پہنچ کر ندرت پچھلی نشست پر بیٹھ گئی تھی جبکہ غوث بیگ نے آنٹی کے لیے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

''کیا ناصرہ اس واقعہ کے پیش آنے سے پہلے بھی یہاں موجود تھی یا حادثے والے دن ہی یہاں پہنچی تھی۔'' غوث بیگ نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ آج سے نو روز پہلے یہاں آئی تھی۔'' آنٹی بتانے لگیں۔ ''اس روز صبح سویرے میں اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کئی ماہ بعد اس کی صورت دکھائی دی تھی اور وہ کچھ حواس باختہ دکھائی دے رہی تھی۔ چائے کے دوران اس نے بتایا کہ وہ سیف شاہ سے طلاق لے چکی ہے اور عدت کے بعد وہ حیدر سے شادی کر لے گی۔ حیدر سے اس کی ملاقات حسین آباد میں ہوئی تھی، جہاں وہ ایک ضروری کام سے گئی تھی۔ دونوں نے پہلی ملاقات کے بعد ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ ناصرہ نے بتایا تھا کہ اس کے پاس تقریباً بیس لاکھ کی رقم موجود تھی اور وہ دونوں شراکت میں کوئی کاروبار کرنے والے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شادی کے بعد نئی بستی چلے جائیں گے اور بزنس شروع کر کے مستقل طور پر وہیں رہیں گے۔''

''حیدر اطہر نے اسے اپنی رقم اگرچہ دکھائی نہیں تھی لیکن ناصرہ نے اس کی بات کا یقین کر لیا تھا۔ ناصرہ اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکلوا لائی تھی۔ جو طلاق کے بعد اسے سیف شاہ سے ملی تھی۔ حیدر اطہر نے اسے بتایا تھا کہ نئی بستی میں ایک اوسط درجے کا ہوٹل فروخت ہو رہا ہے، پچاس لاکھ میں۔ وہ اس ہوٹل کا سودا کرے گا۔ وہ وقتاً فوقتاً نئی بستی کے چکر بھی لگاتا رہتا تھا لیکن اس کے علاوہ وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا۔ دن بھر ناصرہ کے گھر میں بند رہتا۔ اس نے کبھی دروازے سے باہر جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا۔''

''اس لیے کہ وہ روپوش تھا۔'' بیگ نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''روپوش...... کس سے؟'' آنٹی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''حسین آباد کا ایک تاجر پستول لیے اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ حیدر اس کی رقم لے کر بھاگا ہوا ہے۔'' غوث بیگ نے بتایا۔

''لعنت ہو اس پر۔'' آنٹی بڑبڑائی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''بہرحال ناصرہ کو بات پسند نہیں تھی کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس طرح گھر میں بیٹھی رہے۔ اسے حیدر اطہر کا بھی گھر میں پڑے رہنا پسند نہیں تھا اور پھر گھر میں پڑی ہوئی رقم بھی غیر محفوظ تھی اور پھر ایک روز حیدر کی پول کھل گئی، اس کے پاس ایک پائی تک نہ تھی۔ اگر کچھ تھا بھی تو وہ جوئے میں ہار چکا تھا اور اب ناصرہ سے شادی کر کے اس کی دولت مکان وغیرہ پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

ناصرہ اب اسے گھر سے نکال دینا چاہتی تھی لیکن اس دوران وہ ناصرہ کی بعض کمزوریوں سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس نے ناصرہ کو دھمکی دی جس پر اسے خاموش رہنا پڑا لیکن وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھی۔ اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر حیدر نے اسے مارنا پیٹنا بھی شروع کر دیا تھا اور ایک روز حیدر کو شراب کے نشے میں مدہوش چھوڑ کر ناصرہ شہر سے بھاگ نکلی۔ وہ اپنی بینک سے نکلوائی ہوئی رقم بھی ساتھ لے آئی، وہ یہاں سے کہیں اور جانا چاہتی تھی مگر انوار نے اسے روک لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے کسی دوست کے ذریعے حیدر کا بندوبست کرا دے گا کہ ناصرہ کو شہر بہ شہر بھٹکنے کی ضرورت نہیں پڑے گی لیکن انوار کے کچھ کرنے سے پہلے ہی حیدر یہاں پہنچ گیا۔ اسے گھر پر ناصرہ کی ڈائری سے یہاں کا پتا مل گیا تھا۔

دونوں مل کر بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کبھی ان کی آوازیں غصے کی وجہ سے بلند ہو جاتیں اور کبھی سرگوشیوں میں بدل جاتیں۔ حیدر اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ گھر سے باہر چلے تاکہ

کسی پرفضا اور پرسکون جگہ پر بیٹھ کر اطمینان سے اس معاملے کو نمٹا سکیں۔ بالآخر ناصرہ اس کے ساتھ باہر جانے کو تیار ہوگئی، جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو سہمی ہوئی تھی۔ وہ ناصرہ کی کار میں گئے تھے۔ اس کے بعد مجھے ناصرہ کی بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔

میں اس کے بارے میں پولیس کو اطلاع دینا چاہتی تھی لیکن انوار نے مجھے روک دیا۔ وہ کسی گڑبڑ میں ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا۔ بہرحال آج شام ناصرہ کی طرف سے اطلاع ملی تو میں اسے دیکھ کر حواس باختہ ہوگئی۔ اس کا چہرہ زخموں سے مسخ ہو چکا تھا۔''

''حیدر کہاں گیا اور ناصرہ کی رقم کا کیا ہوا؟'' غوث بیگ نے اس کے خاموش ہونے پر دریافت کیا۔

''حیدر کے ساتھ رقم بھی غائب ہے۔'' آنٹی نے جواب دیا۔

غوث بیگ آنٹی کی ہدایت پر گاڑی مختلف سڑکوں پر گھماتا رہا۔ بالآخر اس نے ایک پرانی سی عمارت کے سامنے گاڑی روک لی۔ ایک دو منزلہ رہائشی مکان تھا جسے پرائیوٹ اسپتال میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ مکان کی بعض کھڑکیوں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ غوث نے کار سے اتر کر کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ ندرت اس کے سامنے کھڑی تھی اور آنٹی بھی دو قدم پیچھے موجود تھی۔ کال بیل کے جواب میں دروازہ ایک ادھیڑ عمر عورت نے کھولا، اس کی نظریں ان دونوں کے چہروں سے پھسلتی ہوئی آنٹی کے چہرے پر جم گئیں۔

''کیا بات ہے، تم لوگ اس وقت کیوں آئے ہو؟'' اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''یہ ناصرہ کی چھوٹی بہن ہے۔ اسے دیکھنے آئی ہے۔'' آنٹی نے ندرت کی طرف اشارہ کیا۔

''مس ناصرہ شاید سو رہی ہیں۔ صبح سے پہلے اس سے ملنے کی کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔''

''میں نثار پور سے آئی ہوں، صرف اپنی بہن کو دیکھنے کے لیے۔ میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لوں گی۔''

''تمہارے لیے اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ اس کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ ملاقات کے لیے صبح آجانا۔''

''ناصرہ سے اسی وقت ہمارا ملنا بہت ضروری ہے، یہ پرائیوٹ سراغ رساں مسٹر غوث ہیں۔ جوان سے چند اہم باتیں اسی وقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔'' ندرت نے کہا۔

''آپ لوگ تو بے وقت پریشان کر رہے ہیں۔'' عورت نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا اور دروازہ پوری طرح کھول دیا۔

''آپ لوگ، یہاں اس کمرے میں انتظار کریں۔ میں دیکھتی ہوں کہ مس ناصرہ جاگ رہی ہیں یا سو گئیں۔ اونچی آواز میں باتیں نہ کریں، یہاں کچھ مریض اور ہیں۔''

ادھیڑ عمر عورت کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ خاموش کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ کمرے کی فضا میں ادویات کی بو رچی بسی تھی۔ چھت پر لٹکے ہوئے بلب کی مردہ سی روشنی کچھ عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ چند منٹ بعد ہی وہ عورت واپس آگئی۔

''خوش قسمتی سے مس ناصرہ جاگ رہی ہیں لیکن میں ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے آپ لوگوں کو مریض سے چند منٹ سے زیادہ باتوں کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

غوث بیگ اور ندرت نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ عورت تو کسی طرف سے بھی ڈاکٹر نہیں لگ رہی تھی۔

بہرحال وہ اس کی رہنمائی میں چلتے ہوئے راہداری گھوم کر ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ جہاں دروازے کے سامنے کرسی پر ایک نرس بیٹھی تھی۔

''آپ لوگ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے مریضہ کو کسی قسم کا صدمہ ہو اور چند منٹ سے زیادہ

یہاں رکیں گے بھی نہیں۔'' ڈاکٹر نے ایک بار پھر انہیں تنبیہہ کی۔
کمرہ اگرچہ کشادہ تھا لیکن اسپتال والوں کی بے حسی کی منہ بولتی تصویر نظر آ رہا تھا۔ ایک چھوٹی میز جس کی چولیں تک ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ دو ساخوردہ کرسیاں اور لوہے کے اسپرنگوں والا پلنگ جس پر غالباً کئی برس پہلے رنگ کیا گیا ہوگا لیکن اب بے رنگ نظر آ رہا تھا۔ پلنگ پر تکیے کے سہارے جو عورت بیٹھی ہوئی تھی، اس کا چہرہ پوری طرح پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ آنکھیں اور ہونٹ برہنہ تھے، سفید پٹیوں میں خون کبوتر کی طرح سرخ آنکھیں کچھ عجیب سا تاثر پیش کر رہی تھیں۔ وہ چند لمحے آنے والے کو دیکھتی رہی پھر اس کے سوجے ہوئے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔
''ندرت...... میری بہن......''
ندرت دوڑ کر ناصرہ سے لپٹ گئی۔
''تمہیں کیا ہو گیا باجی! تم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔'' ندرت کا لہجہ جذباتی ہو رہا تھا۔
''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی ندرت! یہ سب کچھ میری اپنی حماقت کی وجہ سے ہوا ہے، میں اس رقم سے بھی محروم ہو گئی ہوں جو سیف سے مجھے ملی تھی۔'' ناصرہ نے کہا۔
''بس اب جو کچھ ہو چکا اسے بھول جاؤ باجی! میں کالج چھوڑ رہی ہوں' کوئی ملازمت کروں گی۔ اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھوں گی جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔'' ندرت بولی۔
''احمقانہ باتیں نہ کرو ڈیئر! میں صرف زخمی ہوئی ہوں۔ حالات سے شکست تو تسلیم نہیں کی۔ میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گی، مجھے تمہارا مستقبل بہت عزیز ہے۔'' ناصرہ نے کہا۔
''یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا مس ناصرہ؟'' غوث بیگ نے آگے بڑھ کر پہلی مرتبہ اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ ''آنٹی سے کچھ باتیں معلوم ہو چکی ہیں لیکن میں اس کے بعد کی باتیں جاننا چاہتا ہوں، جب تم حیدر کے ساتھ ان کے گھر سے رخصت ہوئی تھیں۔''
''وہ مجھے جھیل پر لے گیا تھا۔ اس کے پاس پستول بھی موجود تھا۔ میں انتہائی خوف زدہ تھی۔ وہ مجھ سے رقم بھی لے چکا تھا اور مجھے حیرت تھی کہ اب وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔''
''کیا رقم اس کے پاس تھی؟'' بیگ نے پوچھا۔
''ہاں آنٹی کے گھر سے رخصت ہونے سے پہلے رقم اس نے مجھ سے لے لی تھی لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا۔ وہ تنہائی میں گفت و شنید کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا۔''
''گفت و شنید یا مار پیٹ کے ذریعے؟'' غوث بیگ نے ایک بار پھر ٹوکا۔
''شاید اس کا مطلب یہ ہی تھا۔ وہ میرے چہرے اور سر پر پے در پے ضربیں لگاتا رہا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں بے ہوشی ہی میں دم توڑ دوں گی۔ لیکن میری زندگی تھی، میں ہوش میں آ گئی۔ اس وقت میں جھیل کے عین کنارے پر پڑی تھی، لہریں میرے جسم کو چھو رہی تھیں۔ میں گھسٹتی ہوئی کسی نہ کسی طرح کار تک پہنچ گئی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ کار کی چابی حیدر لے جا چکا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ کار ہی کیوں چھوڑ گیا۔''
''اس طرح وہ آسانی سے پکڑا جاتا۔'' غوث بیگ بولا۔ ''بہر حال پھر کیا ہوا؟''
''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ میرا خیال ہے میں کچھ دیر تک کار میں بیٹھی رہی۔ پھر گرتی پڑتی کسی نہ کسی طرح سڑک تک پہنچ گئی، خوش قسمتی سے ایک خالی ٹیکسی اس طرف سے گزری، جس نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔''
''تم نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی، اس وقت کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا تھا۔ تمہاری رقم بھی واپس مل جاتی لیکن اب حیدر اطہر کا سراغ لگانا مشکل ہوگا۔''
''اس وقت تو مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ ان زخموں نے میری روح تک کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کوئی بات

سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔'' ناصرہ نے بتایا۔
اسی وقت نرس کمرے میں داخل ہوئی۔
''میرا خیال ہے اب یہ ملاقات ختم ہوجانی چاہیے۔مس ناصرہ کو زیادہ دیر بولنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔'' اس نے کہا اور چند سیکنڈ بعد سب کو باہر کا رستہ دکھادیا۔
آنٹی اور ندرت کو گھر چھوڑنے کے بعد غوث بیگ نے رات کا باقی حصہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں گزرا اور صبح ہوتے ہی ناشتا کیے بغیر جھیل کی طرف روانہ ہوگیا۔
شہر سے تقریباً پندرہ میل کی فاصلے پر واقع اس جھیل کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی بھی تھی۔ سیاحوں کے لیے رہائشی ہٹس بھی تھے اور لاتعداد چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹ بھی موجود تھے۔ غوث بیگ نے پہلے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ناشتا کیا پھر مختلف جگہوں سے حیدر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کوئی بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاسکا۔ جس سے غوث کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ حیدر بستی کا رخ کرنے کے بجائے فوراً ہی یہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔ غوث بیگ کو حیدر کا کوئی سراغ نہ ملا البتہ سے اس ٹیکسی ڈرائیور کا نام اور پتا معلوم ہوگیا، جس نے ناصرہ کو زخمی حالت میں اسپتال تک پہنچایا تھا۔
شہر کے پسماندہ علاقے میں کوارٹرنما مکان پر دستک کے جواب میں جس شخص نے دروازہ کھولا۔ وہ صورت ہی سے یتیم نظر آرہا تھا۔ جس پر ایک میلی سی بنیان اور دھوتی غالباً دو دن سے شیو بھی نہیں بنایا تھا۔ وہ شاید سو کر اٹھا تھا۔ آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ جنہیں دونوں ہاتھوں سے مل مل کر وہ غالباً نیند کا خمار دور کرنے کی کوشش کررہا تھا۔
''کیا بات ہے بھائی! کہیں تم نے غلط دروازہ تو نہیں کھٹکھٹادیا۔ میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں۔'' وہ غوث کو گھورتے ہوئے بولا۔
''نہیں، میں ٹھیک جگہ ہی پہنچا ہوں۔ تم شہباز ہی ہونا...... ٹیکسی ڈرائیور۔'' غوث بیگ نے کہا اور پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے ناصرہ کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ ''کیا تمہیں وہ عورت یاد ہے، جسے تم نے زخمی حالت میں ایک پرائیوٹ اسپتال میں پہنچادیا تھا۔''
''اوہ، وہ عورت...... اسے تو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کے زخموں سے بہنے والے خون سے میری گاڑی کی پچھلی سیٹ تر ہوگئی تھی، جسے صاف کرنے میں پورے دو گھنٹے لگے تھے۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا۔ ''میں اسے پہلے پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتا تھا لیکن اس نے سختی سے منع کردیا۔ پھر سول اسپتال چلنے کی تجویز بھی مسترد کردی اور ایک چھوٹے سے پرائیوٹ اسپتال چلنے کو کہا۔ اس کی حالت کے پیش نظر میں نے بحث میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے اس کے بتائے ہوئے پتے پر ہی لے گیا۔ ایسی صورت میں، میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔''
''بہت اچھا کیا۔ اس کی حالت اب اطمینان بخش ہے، بہرحال کیا تم اس آدمی کے بارے میں بھی کچھ بتاسکتے ہو۔ جو اسے اس حالت تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔'' غوث بیگ نے کہا۔
''وہ اکیلی تھی۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا۔ ''قرب وجوار میں ایک خالی کار کے سوائے کسی کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔''
''وہ تمہیں کس جگہ ملی تھی؟''
''جہاں نوکیلی چٹانیں جھیل کے اندر تک چلی گئیں۔ سڑک وہاں سے چند گز کے فاصلے سے گزرتی ہے۔ میں اس وقت آدمیوں کو جھیل کے پاس ہٹ کے سامنے اتار کر واپس آرہا تھا، مجھے غصہ آرہا تھا کہ خالی واپس جانا پڑے گا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ اس زخمی عورت نے اگرچہ مجھے کرایہ دیا تھا مگر ٹپ وہ بھی گول کرگئی تھی۔ میرے خیال میں اس کے پرس میں زیادہ رقم بھی نہیں تھی۔''
''بہت شکریہ۔ یہ لو ٹپ، میری طرف سے لے

لو۔'' غوث بیگ نے کہتے ہوئے سو روپے کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور مزید کوئی بات کیے بغیر رخصت ہو گیا۔

چند منٹ بعد غوث بیگ کی کار ایک بار پھر جھیل کی طرف جا رہی تھی۔ اسے وہ جگہ تلاش کرتے ہوئے دقت پیش نہیں آئی۔ جہاں ٹیکسی ڈرائیور کے بیان کے مطابق ناصرہ اسے زخمی حالت میں ملی تھی۔ وہ چٹانیں سڑک سے بس چند گز کے فاصلے پر تھیں۔ کار روک کر وہ نیچے اترا اور اطراف کا جائزہ لیتا ہوا ایک چٹان پر چڑھ گیا جو دوسری طرف پانی کے اندر تک چلی گئی تھیں۔ تیز ہوا کے باعث لہریں پرشور آواز کے ساتھ چٹانوں سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ وہ چٹانوں پر کھڑا اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ دائیں طرف جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ چٹانی سلسلہ تھا اور بائیں طرف کافی فاصلے پر رہائشی ہٹس اور ریسٹورنٹ وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی گودی بھی وہاں موجود تھی جس کے ذریعے لوگ لانچ میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کے لیے جاتے تھے، لانچ اس وقت وہاں سے دور جھیل میں محوِ سفر تھی۔

غوث بیگ مڑنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظریں جھیل کی طرف اٹھ گئیں۔ چٹانوں سے چند گز کے فاصلے پر کوئی آدمی تیرتا ہوا کنارے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تیرنے کے لیے وہ صرف ایک ہاتھ استعمال کر رہا تھا جبکہ اس کا دوسرا ہاتھ پانی میں اس طرح ڈوبا ہوا تھا، جیسے وہ کسی چیز کو پکڑ کر اپنے ساتھ کھینچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس طرح اسے آگے بڑھنے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔

غوث بیگ کو ایک لمحہ حیرت سی ہوئی کہ وہ کس چیز کو کھینچ کر لا رہا تھا۔ پھر اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک بڑی مچھلی کا خیال ابھرا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر چٹان سے نیچے اتر کر اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں پلیٹ فارم کی طرح ایک بہت بڑا پتھر نظر آ رہا تھا۔ اس شخص نے بھی غوث بیگ کو دیکھ لیا۔ وہ اور تیزی سے ہاتھ چلانے لگا۔ قریب پہنچا تو غوث نے جھک کر اس کا ہاتھ تھاما اور اسے پانی سے باہر کھینچ لیا اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک رسّی تھی۔ جس کے دوسرے سرے پر ایک آدمی کی لاش بندھی ہوئی تھی۔

وہ ایک طویل قامت اور صحت مند شخص تھا جس کے جسم پر پورا لباس نظر آ رہا تھا۔ غوث چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر جھک کر اسے سیدھا کر دیا، کھلی ہوئی آنکھوں میں ریت مٹی وغیرہ بھری ہوئی تھی اور بالائی ہونٹ پر باریک مونچھیں دیکھ کر غوث کے ذہن میں صرف ایک ہی نام ابھرا۔

''حیدر اطہر!''

وہ شخص جو اس لاش کو پانی میں سے کھینچتا ہوا لایا تھا، اپنے بے ربط تنفس کو بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لاش کو یہاں تک لانے میں اسے واقعی کافی جدوجہد کرنا پڑی تھی، چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ لاش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے پیراکی کا شوق ہے۔ تیرتا ہوا اس چٹان کی طرف نکل گیا تھا۔ یہ لاش پتھروں میں پھنسی ہوئی تھی۔'' اس نے جھیل کی طرف اشارہ کیا جہاں تقریباً تیس چالیس گز کے فاصلے پر ایک چٹان ابھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔

''تمہارے اندازے سے یہ لاش کب سے پانی میں تھی؟'' غوث بیگ نے پوچھا۔

''لاش کی حالت بتا رہی ہے کہ وہ کم از کم دو دن تک پانی میں رہی ہے۔'' پیراک نے جواب دیا۔ پھر بولا۔ ''کیا آپ پولیس کو اطلاع کر سکتے ہیں۔ میرے اندر اب اتنی دور جانے کی ہمت نہیں رہی۔''

''ایک منٹ۔'' غوث یہ کہتا ہوا لاش پر جھک گیا اور اس کے لباس کی تلاشی لینے لگا۔ سوٹ کی جیب میں سے کار کی چابیوں کا گچھا اور پتلون کی پچھلی جیب سے چرمی پرس دستیاب ہوا، اس کے علاوہ اور کوئی چیز دستیاب نہیں ہو سکی۔ پرس میں بھی ڈرائیونگ لائسنس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ لائسنس اگرچہ بھیگ چکا تھا، لیکن اس کی تحریر پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ لائسنس حیدر اطہر کے نام تھا جو حسین آباد سے جاری ہوا تھا۔ غوث

نے پرس کو دوبارہ جیب میں رکھ کر لاش کو پلٹ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نظریں لاش کی گردن پر جم گئیں، جہاں ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ غوث کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ گولی کا نشان تھا۔ وہ لاش کو چھوڑ کر ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔

غوث بیگ آنٹی کے مکان پر پہنچا تو دن کے بارہ بجنے والے تھے۔ دھوپ خاصی تیز تھی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آنٹی اس چلچلاتی دھوپ میں مکان کے سامنے چھوٹے سے لان میں پودوں کی آبیاری کر رہی تھی۔

وہ کار سے اتر کر جیسے ہی آگے بڑھا۔ آنٹی اسے دیکھتے ہی بولی۔

''کیا بات ہے، تمہاری صورت پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

''حیدر مر چکا ہے۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔ لاش جھیل سے دستیاب ہوئی ہے۔''

''خبر زیادہ بری بھی نہیں۔'' آنٹی نے پانی کا پائپ ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اس جیسے شخص کے ساتھ ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔ قاتل کون ہے؟''

''میں نے آپ کو حسین آباد کے ایک آدمی کے بارے میں بتایا تھا جو پستول جیب میں ڈالے اسے تلاش کر رہا تھا۔ ممکن ہے حیدر اسی کے ہتھے چڑھ گیا ہو۔ اس کی گردن میں گولی مار کر لاش جھیل میں پھینک دی گئی تھی۔ اس قتل کی وجہ سے مجھے پولیس کو پوری صورت حال سے آگاہ کرنا پڑا۔''

''اوہ، تو تم نے ناصرہ کے بارے میں بھی پولیس کو بتایا؟'' آنٹی چونک سی گئیں۔

''یہ ضروری تھا۔ ممکن ہے پولیس والے اس وقت اسپتال میں ناصرہ سے پوچھ گچھ کر رہے ہوں۔'' غوث بیگ نے جواب دیا۔

''رقم کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔ حیدر کے لباس میں کار کی چابیوں اور ڈرائیونگ لائسنس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پولیس سرجن کا خیال ہے کہ اسے تقریباً ایک ہفتہ پہلے ہلاک کیا گیا تھا۔ لاش کی حالت بہت خستہ تھی۔ میرا خیال ہے جس نے اسے قتل کیا ہے وہ ہی رقم بھی لے اڑا ہے۔ اگر قاتل پکڑا گیا اور رقم بھی اس کے پاس موجود ہوئی تو وہ ناصرہ کو واپس مل سکتی ہے۔ ندرت کہاں ہے؟''

''وہ تو نثار پور واپس چلی گئی۔ جاتے ہوئے انوار کو بتا گئی لیکن مجھ سے مل کر نہیں گئی۔'' آنٹی نے جواب دیا۔

''وہ نثار پور کیوں چلی گئی؟ اس کے پاس تو شاید پیسے بھی نہیں تھے۔''

''کیوں چلی گئی، یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن وہ جاتے ہوئے پچاس روپے انوار سے قرض لے گئی ہے۔'' آنٹی نے بتایا۔

''اس لڑکی کو نجانے کیا ہو گیا ہے، ماضی میں جب یہ لوگ یہاں رہتے تھے تو یہ ٹھیک ٹھاک تھی۔ لیکن اس سانحے کے بعد تو یہ یکسر بدل گئی۔''

''کون سا سانحہ؟'' غوث بیگ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس کے باپ کی خودکشی۔'' آنٹی نے جواب دیا۔

''تمہیں شاید معلوم نہیں، لوگوں نے اسے اتفاقی حادثہ قرار دیا تھا لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس نے خودکشی کی تھی۔ بیوی کی موت کے بعد وہ کچھ بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا پھر اس نے شراب پینا شروع کر دی اور بالآخر اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ اس واقعے نے ندرت کو بہت متاثر کیا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ کل رات تمہارے جانے کے بعد اس کا دماغ ایک دم پلٹ گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک اپنے باپ کی باتیں کرتی رہی، پھر کمرے میں بند ہو گئی اور صبح سویرے اٹھ کر چلی گئی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ کوئی خاص بات اس کے ذہن کو الجھائے ہوئے ہے۔'' غوث بیگ نے کہا اور آنٹی کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

نثار پور واپس جاتے ہوئے غوث بیگ مسلسل

یہی سوچتا رہا کہ ندرت اچانک کیوں چلی گئی لیکن کوئی بات اس کے ذہن میں نہ آسکی۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد جب وہ ناصرہ کے مکان پر پہنچا تو وہاں سیاہ رنگ کی اسی ڈاج کار کو کھڑے دیکھ کر چونک گیا۔ مکان کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ غوث بیگ چند لمحات کار میں بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر جیب سے پستول نکال کر کار سے اترا اور دبے قدموں چلتا ہوا کار کی طرف بڑھنے لگا۔

برآمدے میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ اندر سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک بھاری آواز اسی شخص کی تھی جو پہلے بھی اسے پستول کی زد میں لے چکا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''میں لے جا رہا ہوں لڑکی...... اس لیے کہ یہ میری ملکیت ہے۔''

''تم بکواس کرتے ہو، جھوٹے ہو۔ یہ رقم میری بہن کی ملکیت ہے۔ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔'' جواب میں ندرت کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''نہیں۔ یہ وہ رقم ہے جو حیدر چرا کر لایا تھا۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں حسین آباد میں ایک چھوٹی سی تجارتی کمپنی کا مالک ہوں اور حیدر میرا اکاؤنٹنٹ تھا۔ وہ یہ رقم بینک میں جمع کرانے گیا تھا لیکن بینک پہنچنے کے بجائے رقم سمیت غائب ہو گیا۔ میں بڑی مشکل سے اس کا سراغ لگاتا ہوا اس رقم تک پہنچا ہوں۔ یہ نوٹ میرے حوالے کر دو لڑکی! تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔''

''نہیں، یہ رقم حاصل کرنے کے لیے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔'' ندرت چیخی۔ غوث بیگ برآمدے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچ کر جھانکنے لگا۔ ندرت دروازے کے عین سامنے کمرے کی دیوار سے چپکی کھڑی تھی۔ نوٹوں کی گڈیاں اس نے اس طرح سینے سے چمٹا رکھی تھیں، جیسے کاغذ کے یہ پرزے اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوں۔ آدمی کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ اپنے تلے قدم اٹھاتا ہوا ندرت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''مجھ سے دور رہو۔ خبردار...... مجھے ہاتھ مت لگانا۔'' ندرت چیختی ہوئی دیوار کے ساتھ ساتھ سرکنے لگی۔ اس کا چہرہ خوف کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

''میں بلاوجہ کسی کو تکلیف پہنچانا پسند نہیں کرتا۔ میں صرف اپنی رقم واپس لینے آیا ہوں، جس پر میرا حق ہے۔''

''نہیں، تم اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ دغا باز، یہ رقم میری بہن کی ہے اور یہی اس کی زندگی کا سرمایہ ہے۔''

''میرا بھی کل سرمایہ یہی ہے۔'' اجنبی نے کہتے ہوئے پستول کے دستے سے اس کے چہرے پر ہلکی سی ضرب لگائی۔ ندرت چیخ اٹھی۔ اجنبی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں کسی کو اپنے حق پر ڈاکا ڈالنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں اپنے راستوں کی رکاوٹوں کو دور کرنا خوب جانتا ہوں۔''

اجنبی غراتا ہوا دروازے کی طرف گھوم گیا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پستول کو استعمال کرسکتا۔ غوث بیگ نے یکے بعد دیگرے اس پر دو فائر کر دیے۔ ایک گولی اس کی ران میں پیوست ہوگئی اور دوسری کندھے کی ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

''تم غلط سمجھے تھے مسٹر!'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''میں نے حیدر کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی اس لڑکی کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی محنت سے چھوٹا سا کاروبار جمایا تھا۔ یہ رقم میری کل پونجی تھی، جسے حیدر نے اڑایا تھا۔ میں تو صرف یہ رقم واپس لینا چاہتا تھا۔''

''اس کے لیے تم قانون کا سہارا لے سکتے تھے۔ پولیس حیدر کو تلاش کر کے اس سے رقم برآمد کر لیتی بشرطیکہ تمہاری کہانی میں کوئی حقیقت ہوتی۔'' غوث بیگ بولا۔

''پولیس۔'' اجنبی کے ہونٹوں پر زہریلی

مسکراہٹ آ گئی۔ ”میں پولیس کے پاس گیا تھا لیکن......“ وہ جملہ پورا کیے بغیر ایک طرف لڑھک گیا۔
”اوہ، یہ ختم ہو گیا؟“ ندرت خوف زدہ لہجے میں بولی۔
”نہیں، صرف بے ہوش ہوا ہے۔ میں نے اپنے دفاع میں اس پر گولی چلائی تھی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے قتل کر دیتا۔“ غوث بیگ بولا۔
”یہ تو مجھے قتل کرنے کے درپے تھا۔“ ندرت نے کہا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ حیدر کو اس نے قتل کر دیا ہے، کیا یہ سچ ہے؟“
”اس حقیقت سے پردہ تو تم اٹھاؤ گی۔“ غوث نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔
”میں...... کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ وہ ہکلا کر رہ گئی۔
”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی جبکہ ناصرہ کے بیان کے مطابق رقم حیدر لے گیا تھا۔“
”یہ رقم یہیں تھی، اسی گھر میں...... میرا خیال ہے کہ حیدر نے احمد پور سے واپس آ کر اس گھر کو محفوظ سمجھتے ہوئے رقم یہاں چھپا دی تھی۔“
”بات حلق سے نہیں اترتی، کیا تم اس جگہ کی نشان دہی کر سکتی ہوں جہاں یہ رقم چھپائی گئی تھی؟“
”آپ مجھ پر شبہ کر رہے ہیں جبکہ......“
”تم نے حیدر کو قتل کیوں کیا تھا؟“ غوث بیگ نے اسے جملہ مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر کہا۔
”مم...... مم...... میں نہیں......“ ندرت ہکلائی۔ ”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب یہ واقعہ پیش آیا میں ہوسٹل میں تھی۔ وہاں سے تصدیق کر سکتے ہیں۔“
”تمہیں علم ہے کہ یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟“
”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ ندرت ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ”آپ اس گواہی دیں گے کہ میں شہر سے ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔“

”تم وقت ضائع کر رہی ہو ندرت! مجھے پولیس کو اطلاع دینا پڑے گی لیکن میں اس سے پہلے وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں یہاں بقول تمہارے رقم چھپائی گئی تھی۔“
”باورچی خانے میں کاغذ میں لپٹا ہوا بنڈل آٹے کے کنستر میں چھپایا گیا تھا۔ اسے تلاش کرنے کے لیے مجھے خاصی محنت کرنا پڑی تھی۔“ ندرت نے کہا اور وہ دونوں باورچی خانے میں پہنچ گئے۔ آٹے کا کنستر کھلا پڑا تھا اور اس کے قریب ہی فرش پر ایک اخباری کاغذ بھی پڑا تھا۔ نوٹوں کے بنڈل یقیناً اسی میں لپیٹے گئے تھے۔
”تم نے یکایک احمد پور سے واپس آنے کا فیصلہ کیوں کیا تھا۔ تمہیں کیسے شبہ ہوا تھا کہ رقم یہاں چھپائی گئی ہو گی؟“ غوث بیگ نے دوسرا سوال کیا۔
”گزشتہ رات ناصرہ نے یہ شبہ ظاہر کیا تھا۔ چنانچہ میں صبح ہوتے ہی یہاں چلی آئی۔“ ندرت نے جواب دیا۔ ”اس نے کہا تھا کہ اگر رقم مل جائے تو بینک میں جمع کرا دوں۔“
”نہیں جب تک کوئی تصفیہ نہیں ہو جاتا۔ رقم میرے قبضے میں رہے گی۔ لاؤ یہ مجھے دے دو۔“ غوث بیگ نے ہاتھ بڑھایا۔
”آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ اب میں آپ پر کیسے بھروسا کر سکتی ہوں۔“
”تمہارے فائدے کی بات کر رہا ہوں، اگر یہ رقم پولیس کی تحویل میں چلی گئی تو اس کی واپسی کی امید نہ رکھنا۔“ غوث بیگ نے کہا۔ ندرت چند لمحے تک الجھن آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔
پھر جب غوث بیگ نے نوٹوں کے بنڈل لینے کے لیے بڑھایا تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔
پولیس سے نمٹنے میں خاصا وقت لگا تھا۔ ماضی میں غوث بیگ کئی پیچیدہ کیسز پر پولیس کی مدد کر چکا تھا۔ پولیس کو اس سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی اور پھر ڈاج والے اجنبی کا سابقہ ریکارڈ بھی اس کے حق میں سودمند ثابت ہوا۔ اجنبی کا نام کرامت علی تھا اور وہ حیدر کے ساتھ مل کر وارداتیں کیا کرتا تھا۔ آخری واردات میں حیدر اسے فریب دے کر بھاگ نکلا تھا۔ پولیس کو متعدد

ڈکیتیوں کے سلسلے میں بہت عرصے سے ان کی تلاش تھی۔ حیدر کے بارے میں یہ بھی انکشاف بھی کرامت ہی نے کیا تھا کہ وہ اس کا ساتھی تھا اور نام بدل کر کام کیا کرتا تھا۔ البتہ اس نے حیدر کے قتل سے انکار کر دیا تھا۔

غوث بیگ پولیس سے نمٹ کر جب اپنے آفس پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ وہ کئی روز بعد اپنے دفتر میں داخل ہوا تھا۔ اس نے تازہ ہوا کے لیے کھڑکی کھول دی اور جیب سے نوٹوں کے بنڈل نکال کر رقم گننے لگا۔ کل بیس لاکھ روپے کی رقم تھی، اس نے ان نوٹوں کو اخبار میں لپیٹ کر تجوری میں رکھ دیا۔ اس کا دل تو چاہا تھا کہ کاغذ کے ان ٹکڑوں کو آگ لگا دے جن کی خاطر ایک آدمی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور دوسرا قریب المرگ تھا اور تیسری ناصرہ زخموں سے چور اسپتال میں پڑی تھی۔

غوث بیگ زیادہ دیر اپنے دفتر میں نہیں رکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ہی باہر نکل گیا اور پھر اگلے دو دن انتہائی مصروفیت میں گزرے۔ اس دوران اس نے تین مختلف شہروں کا طوفانی دورہ کیا تھا۔ جہاں وہ مختلف لوگوں سے مختلف قسم کی معلومات جمع کرتا رہا۔ بالآخر تیسرے روز وہ دوبارہ احمد پور پہنچ گیا۔ ندرت کا خیال اس کے ذہن کو بری طرح الجھائے ہوئے تھا، جب وہ احمد پور پہنچا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ندرت بھی اسپتال میں اپنی بہن کے ساتھ موجود تھی۔

ندرت ناصرہ کے کمرے کے سامنے کھڑی تھی اور ڈاکٹر ابھی ابھی کمرے سے نکل کر گئی تھی۔ ڈاکٹر جیسے ہی راہداری گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہوئی، ندرت نے غوث بیگ کو بازو سے پکڑ لیا اور اسے ایک طرف لے جاتے ہوئے بولی۔

”رقم کہاں ہے؟ ناصرہ کو اس کی ضرورت ہے۔ اسے اسپتال کا بل ادا کرنا ہے۔“

”کیا وہ اسپتال چھوڑ کر کہیں اور جا رہی ہے۔“ غوث نے سوال کیا۔

”ہاں، اس میں اسے شہر لے جاؤں گی۔ وہاں نہ صرف اس کا خیال رکھوں گی بلکہ علاج بھی بہتر ہو سکے گا۔“

مسکرائیے!

منیر صاحب کے گھر کا دروازہ زور سے بجا۔ وہ غصے سے دروازے پر گئے اور بولے۔ ”کون گدھے کا بچہ ہے؟“

باہر سے ان صاحب کے بیٹے کی آواز آئی۔ ”ابو! میں ہوں۔“

☆☆

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔

”کیوں بھئی، تم نے گانے کی مشق کیوں چھوڑ دی؟“

”اپنے گلے کی وجہ سے۔“ دوست نے آہ بھر کر کہا۔

”تمہارے گلے کو کیا ہو گیا؟“ اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔

دوست نے افسردہ ہو کر جواب دیا۔

”کچھ نہیں، بس پڑوسیوں نے دبانے کی دھمکی دی تھی۔“

☆☆

اسپتال میں ایک دل کے مریض سے مزاج پرسی کے لیے آنے والے دوست نے پوچھا۔

”یہاں دل کی دھڑکن کو کم کرنے کے لیے بھی تمہیں کچھ مل رہا ہے؟“

مریض نے جواب دیا۔ ”ہاں ایک بوڑھی نرس۔“

☆☆

کھانے کی ایک دعوت میں شریک خاتون نے دوسری سے پوچھا۔ ”تمہیں کون سی ڈش پسند آئی؟“

”اسٹیل کی۔“ دوسری نے جواب دیا۔

☆☆

”عاصم! تم اپنے مکان میں کیوں نہیں رہتے۔ دن رات ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہتے ہو۔“

کاشی۔ ”کیا کروں بھائی۔ میرے مکان کا کرایہ بہت زیادہ ہے۔“

☆☆

”لیکن اس سے پہلے میں ناصرہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب یہ معاملہ ختم ہو جانا چاہیے۔“ غوث کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

”نہیں۔“ ندرت نے دونوں بازو پھیلا کر اس کا راستہ روک لیا۔ ”ناصرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں آپ کو اس سے کوئی ایسی ویسی بات کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“

غوث بیگ نے اس کا بازو پکڑ کر ایک طرف جھٹک دیا مگر دروازے تک پہنچتے ہوئے ندرت اس سے لپٹ گئی۔ وہ اسے کمرے میں کمرے میں جانے سے روکنا چاہتی تھی دفعتاً اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”نہیں، آپ ناصرہ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا، میری خاطر کیا تھا۔ میرے درخشاں مستقبل کی خاطر۔“

”تو گویا تمہیں معلوم ہو چکا ہے۔“ غوث بیگ نے اپنے آپ کو گرفت سے چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں...... یہ رقم ناصرہ نے ہی گھر میں چھپائی تھی اور مجھے اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے میری خاطر کیا تھا۔“

اسی لمحے نہایت آہستگی سے دروازہ کھلا اور پستول کی نال باہر جھانکنے لگی۔ اس کے پیچھے پٹیوں میں لپٹی ہوئی ناصرہ کی سرخ آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”تم دونوں اندر آ جاؤ۔ خبردار مسٹر غوث بیگ! کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

”باجی، نہیں نہیں۔ خدا کے لیے کوئی غلط قدم مت اٹھائیے۔ پستول مجھے دے دیں۔“ ندرت خوف زدہ لہجے میں بولی۔

”شٹ اپ۔ اس پستول کا استعمال میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اندر آؤ۔“ ناصرہ نے اسے ڈانٹ دیا۔

”میرا خیال ہے ہمیں ناصرہ کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ کم از کم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔“ غوث بیگ بولا۔

”مسٹر غوث بیگ! اپنا ہاتھ جیب سے دور رکھنا اور کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ جانتے ہو حیدر کے ساتھ کیا ہوا تھا۔“

”مجھ سے زیادہ بہتر تم جانتی ہو ناصرہ!“ غوث بیگ نے جواب دیا اور ندرت کو لیے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔

ناصرہ نے دروازہ بند کر دیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی پلنگ کی پٹی پر جا بیٹھی۔ اس دوران ایک لمحے کو بھی اس کی نظریں ان دونوں پر سے نہیں ہٹی تھیں۔ پستول کا رخ بھی بدستور غوث بیگ کی ہی طرف تھا۔ وہ چند لمحے باری باری ان دونوں کے چہروں کی طرف دیکھتی رہی پھر مدھم لہجے میں کہنے لگی۔

”میرا خیال تھا کہ یہ راز کبھی نہیں کھلے گا لیکن ہم محض...... میری خام خیالی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ غوث سب کچھ معلوم کر چکا ہے۔ سیف سے ملنے والی رقم میں سٹے میں ہار چکی تھی۔ صرف چند ہزار روپے باقی بچے تھے۔ اس دوران حیدر سے میری ملاقات ہوئی جو کرامت علی کو دھوکا دے کر تین لاکھ کی رقم لے کر بھاگ نکلا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا اور کرامت سے چھپتا پھر رہا تھا۔ میں نے اسے وقتی تحفظ فراہم کیا اور یہ لالچ دیا کہ عنقریب ہم دونوں شادی کر کے اس ملک سے باہر چلے جائیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ کرامت اس کی تلاش میں ہے اور حیدر چند روز سے زیادہ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکے گا۔ مجھے حیدر سے نہیں، اس کی رقم سے دلچسپی تھی۔ بالآخر ایک روز جب وہ شراب کی نشے میں دھت ہو رہا تھا، میں نے اس سے رقم لے کر ایسی جگہ چھپا دی جس کے بارے میں اس کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے تھے اور پھر اسے سوتا چھوڑ کر یہاں چلی آئی لیکن وہ بھی مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ رقم میرے پاس موجود ہے، لیکن جب میں نے انکار کیا تو وہ مجھے بہانے سے جھیل پر لے گیا اور رقم کے بارے میں میرے مسلسل انکار پر مجھے پیٹنے لگا پھر اس نے پستول نکال لی اور مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی۔ میں اس سے پستول چھیننے کی کوشش کرنے لگی

اور اس چھینا جھپٹی میں پستول چل گیا اور گولی اس کی گردن میں پیوست ہوگئی۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ میں تو اپنے آپ کو بچا رہی تھی۔''

''ممکن ہے کہ تم درست کہہ رہی ہو لیکن دنیا کی کوئی بھی عدالت تمہارے سیلف ڈیفنس کے اس موقف کو تسلیم نہیں کرے گی کیونکہ اپنا دفاع کرنے والا مخالف کو قتل کرکے اس کی لاش جھیل میں نہیں ڈبو دیتا۔'' غوث بیگ نے کہا۔

''میں لاش جھیل میں نہیں پھینکی تھی۔ ہم جھیل کے کنارے ایک بڑے پتھر پر اپنی اپنی جان بچانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ گولی لگنے کے بعد وہ لڑکھڑاتا ہوا جھیل میں جا گرا تھا۔''

''اور تم کھڑی دیکھتی رہیں۔'' غوث بیگ نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں خود زخموں سے چور ہو رہی تھی اور پھر لہریں لاش کو بہا کر دور لے گئیں۔ اگرچہ کار کی چابیاں بھی اس کی جیب میں تھیں لیکن میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔''

''اگر تم اپنے آپ کو بے گناہ سمجھتی ہو تو پستول پھینک دو ناصرہ!'' غوث بیگ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''اب میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ اپنے آپ کو تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔'' ناصرہ نے جواب دیا۔ ندرت قدم بڑھا کر پلنگ کے قریب پہنچ گئی۔

''یہ پستول مجھے دے دو باجی!'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''بکومت احمق لڑکی! میں نے یہ سب کچھ تمہارے لیے کیا ہے اور تم بنے بنائے کھیل کو بگاڑنا چاہتی ہو۔'' ناصرہ چیخی۔

''تمہارا دماغ چل گیا ہے باجی! میں تمہارے اس کھیل میں شریک نہیں ہونا چاہتی۔ تم نہیں جانتیں کہ یہ سب کچھ......'' وہ یکایک خاموش ہوگئی۔ اس کی نظریں پستول پر جمی ہوئی تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ ہکلائی۔

''یہ...... یہ...... یہ پستول تو...... ڈیڈی کا ہے...... جس سے انہوں نے خودکشی کی تھی۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' ناصرہ بولی۔

''فرق میں بتاتا ہوں ناصرہ!'' غوث بیگ نے کہا۔ ''پستول تم پر حیدر نے نہیں بلکہ تم نے اس پر نکالا تھا۔ تم ہی اسے دھمکا کر جھیل پر لے گئی تھیں اور پھر تم نے ہی گولی مار کر اسے ہلاک کر دیا تھا۔ کیا میں نے غلط کہا؟''

''کیا یہ درست ہے باجی!'' ندرت نے متوحش نگاہوں سے ناصرہ کی طرف دیکھا۔ اس کا جسم خوف کی شدت سے تھرتھرا رہا تھا۔

''ہاں...... مجھے اس کا اعتراف ہے۔'' ناصرہ مدھم لہجے میں بولی۔ ''لیکن...... یہ سب کچھ میں نے تمہارے لیے کیا تھا۔ تمہارے درخشاں مستقبل کے لیے۔ کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں۔ ڈیڈی کی خودکشی کے بعد حالات نے مجھے جس راستے پر ڈال دیا تھا، وہ بہت بھیانک تھا لیکن میں تمہیں اس راستے پر جانے سے روکنا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ بدقسمتی کی سیاہ چادر میری طرح تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے۔ ڈیڈی نے ہمارے لیے ورثے میں بس یہ پستول چھوڑا تھا لیکن میں......''

ناصرہ نے جملہ ادھورا چھوڑا۔ وہ چند لمحے ندرت کو دیکھتی رہی پھر اچانک ہی اس نے پستول اپنے منہ میں رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا۔ اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے اور اس کا جسم پلنگ سے فرش پر لڑھک گیا۔

ندرت پر سکتہ طاری ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دوڑ کر ناصرہ کی لاش سے لپٹ گئی۔ کمرے میں کسی اور کے آنے سے پہلے غوث بیگ نے ندرت کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھا دیا۔ ندرت سیدھی ہوئی تو باپ کا ورثے میں چھوڑا ہوا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ غوث بیگ نے نہایت آہستگی سے پستول اس کے ہاتھ سے لے کر لاش کے قریب پھینک دیا اور مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

نرس اور بوڑھی ڈاکٹر دروازے میں کھڑی خوف زدہ نگاہوں سے یہ بھیانک منظر دیکھ رہی تھیں۔

☆☆

ادھورا مجسمہ

کانسی کا بنا ہوا مہاتما بُدھ کا وہ ادھورا مجسمہ اپنے اندر ایک قیمتی را
چھپائے ہوئے تھا۔

ہر قدم پر سسپنس ہر لمحہ چونکا دینے والے واقعات۔
زاہد اور جاوید ایک خطرناک مہم پر

"یہ کیا چکر ہے۔" کیپٹن جاوید نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

کرنل زاہد نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے گاڑی کا گیئر بدلا اور گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"چکر تمہاری تقدیر کا ہے۔"

"کیا مطلب۔۔؟"

"مطلب یہ کہ ارجنٹ کال: جنرل کیو کی طرف سے" زاہد بولا "اور جنرل جب ہم لوگوں کو طلب کرتا ہے۔ تو اس کا مطلب ہوتا ہے۔ کوئی اہم معاملہ..... کوئی خصوصی کیس جسے فوری طور پر ہمارے سپرد کیا جا رہا ہے۔"

"کہیں ہمیں باہر تو پارسل نہیں کیا جائے گا؟"

"بہت ممکن ہے ایسا ہو.... کیوں۔۔؟"

"کیوں کیا۔۔ پھر میری ایک درجن محبوبائیں میرے فراق میں برہا کے گیت گاتے گاتے میرے سپنوں میں آئیں گی اور کہیں گی...."

"لاحول واللہ قوت...." زاہد نے ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں داخل ہوتے ہوئے گاڑی پورٹیکو میں روک دی۔

"اچھا اچھا اندر چلو۔" زاہد نے نیچے اُترتے ہوئے کہا۔

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے جنرل کیو کے آفس کے دروازے پر پہنچے جہاں ایک وردی پوش رائفل لئے کھڑا تھا۔ اُس نے زاہد کو دیکھتے ہی سیلوٹ کیا اور کہا۔

"جنرل آپ کے منتظر ہیں سر۔"

زاہد نے مسکرا کر دروازہ کھولا اور جاوید کے ساتھ جنرل کیو کے آفس میں داخل ہو گیا۔

جنرل کیو اپنی لمبی چوڑی میز کے پیچھے بیٹھا پائپ سے دھواں اڑا رہا تھا۔

"ہیلو سر۔" زاہد نے مسکرا کر کہا۔

"ہیلو کرنل! بیٹھو!"

"کیسے ہیں آپ۔۔؟" زاہد ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"فائن! تمہارے لئے ایک کام ہے!" جنرل کیو نے کہا اور پھر جاوید کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تم کھڑے ہو کیپٹن! بیٹھو!"

"تھینکس۔" جاوید بھی زاہد کے برابر والی کرسی بیٹھ گیا۔

"کیا تم تیار ہو کرنل زاہد ؟" جنرل کیو نے پوچھا۔

"یس سر — میں کام کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہوں ؟" زاہد بولا۔

"ویری گڈ" ... جنرل کیو نے اپنا سر ہلایا ۔ پھر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اپنی میز کی درازوں میں سے ایک دراز کھول کر اس میں سے ایک سبز رنگ کی فائل نکالی اور اسے کھول کر اندر رکھے کاغذات میں کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔

زاہد اور جاوید خاموش بیٹھے دیکھتے رہے۔

جنرل کیو نے فائل کے کاغذات میں سے ایک صفحہ نکالا جو شاید کسی میگزین سے پھاڑا گیا تھا ۔ وہ صفحہ نکال کر جنرل نے زاہد کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اسے دیکھئے — ؟"

کرنل زاہد کے ساتھ جاوید بھی جھک کر اس صفحہ کو غور سے دیکھنے لگا۔

پورے صفحہ پر مہاتما بدھ کی ایک نہایت شاندار تصویر چھپی ہوئی تھی ، جو یقیناً کافی پرانی اور نایاب قسم کی تھی۔

"مہاتما بدھ کی یہ تصویر اس مجسمہ سے لی گئی تھی ۔ جو کانسی کا بنا ہوا ہے — " جنرل کیو نے پائپ کا دھواں اگلتے ہوئے کہنا شروع کیا — "اس مجسمے کا وزن آٹھ من اور لمبائی دس فٹ ہے ۔ محققوں کا بیان ہے کہ یہ مجسمہ پانچ سو سال پرانا ہے ۔ اور اس زمانے کی سنگ تراشی کا ایک نایاب نمونہ ہے ۔ یہ بنگال اور بہار کی سرحد پر واقع ایک جگہ کھنڈرات کی کھدائی کے دوران دستیاب ہوا تھا ۔ ملک کے مشہور تاریخ دانوں نے اس کا جائزہ لینے کے بعد اسے ایک اعلیٰ اور نایاب نہایت قیمتی سرمایہ قرار دیا تھا ، کافی عرصے تک یہ مورتی لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بنی رہی ۔ لیکن بدقسمتی سے ایک دن اسے چرا لیا گیا — "

"کیا ... چوری ہو گئی — " زاہد کے منہ سے حیرت سے نکلا۔

"ہاں ! اس کی ایک الگ کہانی ہے ، مہاتما بدھ کے مجسمے کی چوری اتنے عجیب و غریب طریقے سے ہوئی تھی کہ تمام ذمہ دار آفیسر حیرت میں رہ گئے تھے — " جنرل کیو نے دوبارہ کہنا شروع کیا "کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ نیشنل میوزیم کے جدید طرز کے طریقے سے کئے گئے حفاظتی انتظامات میں بھی مجسمے کو چوری کیا جا سکتا ہے ۔ یا چوری کا خیال تک کوئی اپنے ذہن میں لا سکتا ہے ۔ آخر مجسمہ جیب میں رکھ کر تو نہیں لے جایا جا سکتا تھا ، لیکن اس کے باوجود مہاتما بدھ کا وہ نایاب مجسمہ چوری ہو گیا ؟"

"کمال ہے — " جاوید بڑبڑایا تھا۔

"مجسمے کی چوری ہوتے ہی حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آ گئی ؟" جنرل کیو نے دوبارہ کہنا شروع کیا " مجسمے کی تلاش شروع کر دی گئی اور زمین و آسمان ایک کر دیئے گئے ۔ ہر صوبے کی پولیس نے سی آئی ڈی کی مدد سے مجسمے کی اندرون ملک گہری تلاش شروع کر دی ۔ لیکن اُسے ان کی ہوا تک نہیں ملی ۔ لیکن جب کوئی سراغ ان کے ہاتھ آیا بھی تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی ؟"

" کیا سراغ — ؟ "

" مہاتما بدھ کا وہ نایاب اور قیمتی مجسمہ ملک سے باہر پہنچ چکا تھا ؟"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

کمرے میں دیر تک سناٹا چھایا رہا۔

جنرل کیو نے بجھے ہوئے پائپ کو دوبارہ سلگایا اور اس کا کش لگاتے ہوئے بولا —

"تمام تحقیقات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک سال تک چوروں نے اس مجسمے کو یوں انڈر گراؤنڈ رہنے دیا جیسے اس کی کوئی وقعت نہ رہی ہو ۔ لیکن ایک سال بعد ان لوگوں نے مجسمے کو سڑک کے راستے بمبئی تک پہنچایا ۔ اس وقت تک وہ مجسمہ ایک جرمن شخص کے قبضہ میں تھا ۔ بمبئی میں اس نے ایک اسمگلر سے رابطہ قائم کر کے یہ معاملہ طے کر لیا کہ مجسمے کو سمندر کے راستے عرب کے ملک عراق تک پہنچا دے ۔ وہاں سے اس جرمن کا ارادہ مجسمے کو خشکی کے راستے ترکی ، یوگوسلاویہ ، آسٹریلیا ہوتے ہوئے جرمنی تک لے جانے کا تھا ۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح وہ مجسمہ عراق تک پہنچ گیا ۔ عراق سے ایک کارواں کی صورت میں وہ آگے بڑھا ۔ لیکن وہ مجسمہ اس جرمن کے نصیب میں بھی نہیں تھا ۔ بصرہ ۔ بغداد روڈ پر اس قافلے کو عراقی ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ۔ جرمن چور اور اس کے تمام ساتھی قتل کر دیئے گئے ۔ اور قافلے کی تمام قیمتی اشیاء کے ساتھ ساتھ مہاتما بدھ کا وہ کانسی کا مجسمہ بھی ڈاکوؤں کے قبضہ میں پہنچ گیا ؟"

زاہد نے گہری سانس لی تھی۔

"پھر ایک سال تک اس مجسمے کا کوئی سراغ نہیں ملا ؟" جنرل کیو نے دوبارہ کہنا شروع کیا " لیکن کافی تلاش و تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مجسمہ عراق کے ایک کباڑی عبد الحسین کے پاس موجود ہے ۔ اس نے وہ مجسمہ ڈاکوؤں سے کوڑیوں کے بھاؤ خرید لیا تھا ۔ چنانچہ ہماری حکومت نے عراقی حکومت سے مل کر اس مجسمے تک پہنچنے کی کوشش کی اس وقت تک وہ مجسمہ وہاں سے غائب ہو چکا تھا ؟"

"کیسے — ؟ " زاہد نے سوال کیا۔

"وہ کباڑی عبد الحسین ایک بہت ہی عیار اور گھاگ بیوپاری تھا ۔ وہ ساری دنیا کے ایسے آرٹ کے قدر دانوں کو

جانتا تھا کہ جن کے پاس تاریخی نوادرات کے ذاتی خزانے موجود تھے۔ اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ ان لوگوں میں یہ بات پھیلا دی کہ ——— اس کے پاس مہاتما بدھ کا ایک قدیم مجسمہ ہے جسے وہ فروخت کرنا چاہتا ہے۔

جن مشہور نوادرات ذخیرہ کرنے والے لوگوں میں اس نے یہ افواہ پھیلائی ان میں فرانس کا ایک کروڑ پتی بھی شامل تھا۔ اس فرانسیسی نے عبدالحسین سے رابطہ قائم کیا اور مہاتما بدھ کا وہ نایاب مجسمہ خریدنے کی خواہش ظاہر کی لیکن اس کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس کو منہ مانگی قیمت دینے کے لئے تیار ہے لیکن چونکہ مجسمہ چوری کا ہے اس لئے وہ پہلے اسے ٹھونک بجا کر دیکھے گا۔ اور اپنے ماہرین سے اس کا معائنہ کرائے گا تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ اس کے ساتھ کوئی جعل سازی نہیں کی جا رہی ہے۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس کے ہاتھ کوئی نقلی چیز تو نہیں فروخت کی جا رہی۔ لیکن اس کروڑ پتی روہمر کی اتنی احتیاط اور ہوشیاری کے باوجود عبدالحسین ہیرا پھیری کر گیا۔ کسی طرح اس کے کانوں میں یہ بھنک پڑ گئی تھی کہ روہمر اور اس کے ماہرین کو مجسمے کے اصلی ہونے کے جو ثبوت اور نشانات معلوم ہیں وہ سب مجسمے کی گردن کے نیچے کے ہیں اور ؟"

"ایک منٹ ——" زاہد درمیان میں بول پڑا "روہمر نے مجسمے کو دیکھے بغیر یہ کیسے معلوم کر لیا کہ ایسے نشان موجود ہیں؟"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا ——" جنرل کیو نے کہا۔ "جب کھنڈرات کی کھدائی کے دوران مجسمہ برآمد ہوا تو اخبارات نے اس کے اوپر بہت سے مضامین شائع کئے اور مجسمے کی تصاویر بھی شائع کیں۔ انہی اخبارات میں چھپی ایک تصویر ابھی تم نے دیکھی ہے جو تمہارے سامنے فائل میں موجود ہے۔ روہمر چونکہ نوادرات کا ذخیرہ کرنے میں مشہور ہے اس لئے اس نے بھی یہ مضامین اور مہاتما بدھ کی تصاویر میگزین میں ضرور دیکھی ہونگی۔"

"اوہ ——" زاہد نے گہرا سانس لیا۔

"عبدالحسین کے دماغ میں روہمر کو دھوکہ دینے کا خیال دو باتوں کی وجہ سے آیا۔ اول یہ کہ روہمر کو مہاتما بدھ کے قدیم ہونے کے بارے میں جتنے نشانات معلوم تھے۔ وہ سب کے سب مجسمے کے گردن کے نیچے کے ہی تھے —— دوئم یہ کہ جب عراقی ڈاکوؤں نے وہ قافلہ لوٹا تھا، تو افراتفری کے عالم میں وہ مجسمہ اس طرح نیچے گرا تھا جس سے اس کی گردن میں تھوڑی سی خراشیں پڑ گئی تھیں۔"

"پھر ——؟" جاوید نے جلدی سے پوچھا۔

"عبدالمبین نے چالاکی یہ کی کہ مجسمے کی گردن الگ کردی اور نہایت ہوشیار کاریگروں سے مجسمے کا نقلی سر تیار کروا کر اُسے مجسمے کے ساتھ اتنی ہوشیاری سے فٹ کروایا کہ روبھر ...

اور اس کے ماہرین بھی دھوکہ کھا گئے۔ عبدالمبین نے وہ مجسمہ روبھر کے ہاتھوں لاکھوں روپوں میں فروخت کردیا اور مجسمے کا اصلی سر بھی اپنے قبضے میں رکھا۔"

"واقعی حیرت ناک حد تک دلچسپ بات ہے۔" زاہد مسکرایا تھا۔

"ہاں! پھر کچھ عرصے بعد عبدل نے وہ خالی سر بھی فروخت کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یا تو اس سر کا کوئی خریدار نہیں ملا یا اس نے پھر جو قیمت مقرر کی تھی وہ اسے کوئی دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوا۔"

جاوید جلدی سے بول پڑا۔

"سر! اُسے چاہیئے تھا جس طرح اس نے مجسمے کے دھڑ کیلئے سر نقلی بنوایا تھا، اب سر کے لئے دھڑ نقلی بنوا کر مکمل مجسمہ دوبارہ فروخت کر دیتا ۔۔۔؟"

"اس نے یہی کیا تھا" جنرل کیو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اس نے نقلی دھڑ بنوا کر اس پر اصلی سر فٹ کروایا۔ اور پھر افواہ پھیلا دی کہ ان کے پاس ایک اور مہاتما بدھ کا قدیم مجسمہ آیا ہے۔ اس کے بعد اس نے اس بت کو کیسے بیچا، کیسے فروخت کیا اور کتنے میں سودا کیا۔ اس کی کوئی تفصیل ہمارے پاس نہیں ہے، لیکن ہم اس آدمی کو ضرور جانتے ہیں جس کے پاس آجتک وہ مجسمہ موجود ہے۔"

"اصلی سر اور نقلی دھڑ والا!"

"بے شک ۔۔۔"

"کون ہے وہ ۔۔۔؟"

"اس کا نام چن لیاؤ ہے جو اوسلو میں چینی سفارتخانے میں تھرڈ سیکریٹری ہے۔ اوسلو ناروے کی راجدھانی ہے ہمیں باخبر حلقوں سے پتہ چلا ہے کہ وہ مجسمہ آجکل اوسلو چن لیاؤ کی رہائش گاہ میں موجود ہے۔"

ایک لمحہ کے لئے پھر سناٹا چھا گیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

کرنل زاہد کی نظریں جنرل کیو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

جاوید نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پھر سوال۔

"سر! کیا ہمیں اس مجسمے کو یا اس کے سر کو واپس لانا ہوگا؟"

"نہیں، مشن یہ نہیں ہے۔" جنرل کیو نے دھیرے سے کہا۔

"یہ مشن اتنا سیدھا اور آسان نہیں ہے!"

"پھر ۔۔۔؟"

"معاملہ کچھ اور ہے۔" جنرل کیو کہنے لگا۔ اگر مجسمے کی واپسی کا سوال ہوتا تو یہ کام ہمارے دوسرے ایجنٹ بھی کر سکتے تھے ہماری حکومت اسے آسانی سے محکمہ آثار قدیمہ کی چوری کا حال بتا کر اس پر اپنا حق جتا سکتی تھی۔ ہماری اس مجسمے میں دلچسپی محض قدیمی مجسمے یا تاریخی حیثیت سے نہیں ہے۔ بلکہ ایک دوسری وجہ سے ہم اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔"

"وہ کیا سر ۔۔۔؟"

"اس کے لئے بھی مجھے تمہیں ایک کہانی اور سنانی پڑیگی!"

"میں دلچسپی سے سنوں گا سر ۔۔۔" زاہد کہنے لگا۔

"محکمہ دفاع میں ایک سائنسدان کام کرتا تھا۔" جنرل کیو کہنے لگا۔ انہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ ایک حیرت انگیز کام انجام دیا۔ انہوں نے ایک ایسی گیس ایجاد کی جسے ہوائی جہازوں اور خلا میں چھوڑے جانے والے سیاروں میں ایندھن کے طور پر پٹرول کی جگہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ سو روپے کی جگہ ایک روپے کا خرچ آتا یعنی جتنے روپوں میں ایک گیلن پٹرول آتا ہے ۔۔۔ اتنے روپوں میں اتنی گیس بنائی جا سکتی تھی، جو سو گیلن پٹرول کے برابر ہوتی اس سائنسدان نے اپنی اس ایجاد کی خبر اس حکومت کو دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ اپنا یہ فارمولہ حکومت کے حوالے اس وقت کریں گے جب حکومت ان کی دو شرطیں قبول کرلے گی۔"

"وہ دو شرطیں کیا تھیں؟"

"اسے محکمے کا ڈائریکٹر بنا دیا جائے اور دوسرے اپنی ایجاد کی رائلٹی کے طور پر اسے اور اس کے بعد اس کے خاندان کو ایک سو ایک سال تک ایک بے حد کثیر رقم دینے کا حکومت وعدہ کرے۔ یہ دونوں شرطیں حکومت کو بالکل پسند نہیں آئیں۔ اس لئے اس نے بالکل انکار کردیا۔ لیکن حکومت اسے دیگر سہولیات دینے کے لئے تیار تھی جو خود سائنسدان صاحب کو منظور نہیں تھیں۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہا ۔۔۔ اسلئے حکومت نے اس میں اور اس کے فارمولے میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ اور یہ سوچا کہ وقت کے ساتھ سائنسدان آخر ہار ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ سائنسدان نے اپنی ایجاد کو کسی دوسرے ملک میں فروخت کرنے کا پلان بنا لیا۔"

"کیا واقعی ۔۔۔؟"

"یہ حقیقت تھی ۔۔۔" جنرل کیو کہنے لگا "ہماری حکومت

اس سے ایسی حرکت کی اُمید نہیں رکھتی تھی، لیکن اپنی طرف سے ہوشیار تھی۔ اور ایسے کسی بھی معاملے سے نبٹنے کے لئے پوری طرح مستعد بھی تھی۔ سائنسدان کی سی۔ آئی۔ بی کے ذریعے برابر نگرانی کرائی جا رہی تھی، جس سے سائنسدان باخبر تھا اور اسی لئے اس نے سی۔ آئی۔ بی کی آنکھوں میں صاف دُھول جھونک دی۔"

"کیا وہ فارمولہ ملک سے باہر بھیجنے میں کامیاب ہو گیا۔" جاوید حیرت سے بولا۔

"ہاں۔"

"لیکن کیسے۔۔۔؟"

"یہ ہمیں کافی وقت گذرنے اور کافی بھاگ دوڑ اور سخت جدوجہد کے بعد پتہ چلا کہ سائنسدان نے اپنا وہ فارمولہ کیسے ملک سے باہر بھیجا۔"

"کیسے۔؟"

"ان سائنسدان نے اپنے فارمولے کے کاغذات کی ایک مائیکروفلم تیار کروائی اور تمام کاغذات کو ضائع کر دیا اور مائیکرو فلم مہاتما بدھ کے مجسمے میں کہیں چھپا دیا۔ مہاتما بدھ کا مجسمہ نیشنل میوزیم سے چوری ہو گیا۔ مجھے امید ہے اب ساری کہانی تم لوگوں کی سمجھ میں آ گئی ہو گی؟"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی" زاہد بولا "وہ سائنسدان اس جرمن پر اس حد تک بھروسہ کرتا تھا کہ اتنی قیمتی چیز اس کے حوالے کر دی جو اسے ملک سے باہر نکال لے گیا اور آخر میں مارا گیا۔"

"ہم نے جو تحقیقات کروائی تھی۔ اس کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ سائنس دان جس کا نام وی پی سنگھ تھا اس جرمن سے پہلے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ کسی تیسرے شخص کے ذریعے اس جرمن کے قریب آیا تھا۔ دونوں کے تعلقات جو رنگ لائے اس سے ایک نہایت قیمتی راز مہاتما بدھ کے مجسمے کے ساتھ ہی اسمگلنگ ہو کر چلا گیا۔ اب ہم قطعی طور پر یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ اس جرمن کو اس بات کا علم تھا یا نہیں کہ مائیکروفلم مہاتما بدھ کے مجسمے کے اندر چھپی ہوئی ہے؟"

"کیا اس سلسلہ میں سائنسدان وی پی سنگھ سے پوچھ تاچھ کی گئی۔؟"

"جب تک ہمیں ان تمام حالات کی خبر ہوئی اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی اور سائنسدان وی پی سنگھ اس وقت تک ایک ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو چکا تھا۔ اس کی ناگہانی موت کے بعد اس کے ذاتی سامان کو نہایت باریک بینی سے جانچا گیا لیکن اس فارمولے کے متعلق کاغذات کا نام و نشان تک نہیں ملا۔ تب ہمیں شبہ ہوا تھا کہ سائنسدان وی پی سنگھ نے ضرور وہ فارمولہ کسی دوسرے شخص کے حوالے کر دیا ہو گا۔ تب ہماری پوری مشینری حرکت میں آگئی اور سخت جدوجہد کے بعد ہمیں وہ کہانی معلوم ہوئی جو میں تمہیں سنا چکا ہوں۔ اس کے بعد ہمارے دو ایجنٹ فرانسیسی کروڑپتی روبر کے پاس اس مہاتما بدھ کے مجسمے کو کھنگالنے کے لئے بھیجے گئے۔ فرانس میں ہمارے ایجنٹوں نے نہایت ہوشیاری اور باریک بینی سے مجسمے کو کھنگال ڈالا۔ لیکن مائیکروفلم اس میں موجود نہیں تھی۔ تب ہی ہمیں یہ رپورٹ بھی ملی کہ اس مجسمے کا دھڑ تو اصلی ہے لیکن سر نقلی جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ وہ مائیکروفلم اسی اصلی سر میں موجود تھی ——— اس اصلی سر کی سرگرم تلاش کے بعد ہمیں یہ سراغ ہاتھ لگا کہ وہ نقلی دھڑ والا مجسمہ اوسلو میں مقیم چینی سفارتخانے کے تھرڈ سیکرٹری چن لیاؤ کے گھر میں موجود ہے۔"

"کیا چن لیاؤ کو نوادرات کا شوق ہے۔؟"

"نہیں۔؟" جنرل کیو نے کہا۔ "بہت ممکن ہے اس نے اس مجسمے کو اپنے گھر کی سجاوٹ کے لئے خرید لیا ہو اور اسے اصل معاملہ یا راز کی کوئی خبر نہ ہو۔ اب صورتحال یہ ہے کہ سائنسدان وی پی سنگھ کے فارمولے کی مائیکروفلم اگر کہیں ہے تو چن لیاؤ کے گھر میں مہاتما بدھ کے مجسمے کے سر میں ہے اگر مائیکروفلم ہمیں وہاں سے بھی دستیاب نہیں ہوئی تو ہمارے لئے اس فارمولے سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو لینے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہ جائے گا۔"

"میں سمجھ گیا سر! آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اسلو جا کر مہاتما بدھ کے مجسمے کے سر میں سے وہ مائیکروفلم تلاش کرنا ہے۔" کرنل زاہد بولا۔

"بالکل۔" جنرل کیو نے سر ہلایا "تم دونوں کے علاوہ اور کوئی یہ کام سرانجام نہیں دے سکتا اسلئے میں تم دونوں کو اس مشن پر بھیج رہا ہوں لیکن یہ معاملہ آسان نہیں ہے تمہیں بہت ہی ہوشیاری اور حاضر دماغی سے کام لینا ہو گا ورنہ کھیل بگڑ بھی سکتا ہے۔" "آپ بے فکر رہیں سر۔" زاہد بولا۔

"تم دونوں کے سفر کا سب بندوبست ہو چکا ہے۔ کل صبح پانچ بجے کے پلین سے جو لندن کے لئے روانہ ہو گا اس میں براسلیز تک کے لئے سیٹیں بک ہو چکی ہیں۔ وہاں سے تم دونوں کو کوپن ہیگن کے لئے دوسرے فلائٹ پکڑنا ہو گی۔ کوپن ہیگن سے اوسلو کے لئے سیدھی ٹرین جاتی ہے۔۔۔ کیا تم سمجھ گئے ہو۔"

"اچھی طرح۔"

"ویری گڈ۔" جنرل کیو دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

کوپن ہیگن ریلوے اسٹیشن پر رش بہت معمولی تھا۔

کرنل زاہد اور کیپٹن جاوید دونوں ایک کینٹین کے سامنے کھڑے گرم گرم کافی کے گھونٹ حلق سے نیچے اتار رہے تھے۔

برسیلز تک آنے میں انہیں کافی دیر ہو گئی تھی۔ کیوں کہ لندن ائیرپورٹ پر ہوائی جہاز میں کچھ نقص پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ بڑی مشکل سے ہی کوپن ہیگن کے لئے دوسرا پلین لے سکے تھے۔

اتنے لمبے سفر نے انہیں کافی تھکا دیا تھا۔ جاوید پر بوریت بری طرح سوار تھی لیکن وہ خاموش ہی تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ زاہد کا موڈ بھی زیادہ خوشگوار نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک ایک لمبا چوڑا آدمی پلیٹ فارم پر نمودار ہوا اور کینٹین کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ایک لمبا اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور اس کی آنکھوں پر ایک نہایت قیمتی فریم کا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ اس کی چال ڈھال سے رئیسی ٹپکتی تھی۔

کرنل زاہد نے نو وارد کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور پھر نہایت اطمینان سے کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔

اجنبی اوورکوٹ والا ان دونوں کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اس کی نظریں ایک لمحہ کے لئے زاہد اور جاوید پر رکیں۔ پھر وہ ان کے اور قریب ہوتے ہوئے بولا۔

"کیا میں آپ سے چند باتیں کر سکتا ہوں؟"

زاہد اور جاوید دونوں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"ضرور! فرمایئے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ برسلیز میں آپ سے رابطہ قائم نہ کر سکا کیونکہ میرا ایلچی کو پتہ کسی وجہ سے وہاں سے دیر سے پہنچا تھا۔"

" زاہد حیرت سے اس اجنبی کی صورت تکے جا رہا تھا۔ یہی حال جاوید کا بھی تھا۔ کچھ دیر بعد زاہد بولا

"کیا آپ مجھے جانتے ہیں۔؟"

"نام سے واقف نہیں، لیکن باقی سب کچھ جانتا ہوں۔"

"مثلاً۔؟"

"مثلاً یہ کہ آپ اپنے ملک سے چوری کئے گئے مجسمہ کا سر تلاش کرنے نکلے ہیں، اور آپ کا سفر اوسلو تک... کا ہے۔"

کرنل زاہد اور جاوید دونوں بری طرح چونک کر اوورکوٹ والے کو گھورنے لگے تھے۔

"لل... لیکن تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے۔" جاوید بولا

"مجھے کیا نہیں معلوم۔" اوورکوٹ والے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "ایسی باتیں جاننے کے بہت سے طریقے ہیں، کیا یہ صحیح نہیں؟"

"کیا اپنا تعارف کرانا پسند کرو گے؟" زاہد بولا۔

"اس ناچیز کو روہمر کہتے ہیں۔"

"اوہ گاڈ۔؟" جاوید کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

چند لمحوں تک سناٹا چھایا رہا۔

جاوید سوچ رہا تھا تو یہ ہے وہ کروڑپتی، نوادرات کا شوقین فرانسیسی۔ روہمر جس کے ہاتھ عبدالحسین نے اصلی دھڑ پر نقلی سر لگا کر مہاتما بدھ کا نایاب مجسمہ فروخت کر ڈالا تھا۔

اور اوورکوٹ والے فرانسیسی روہمر نے مسکرا کر کہا۔

"اب آپ لوگ اپنا تعارف کرا دیں تو اچھا رہے گا۔"

"مجھے زاہد کہتے ہیں۔" زاہد بولا "اور یہ میرے دوست جاوید ہیں۔"

"بہت خوب! آپ دونوں سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔"

روہمر نے باری باری زاہد اور جاوید سے ہاتھ ملایا تھا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں مسٹر روہمر۔" زاہد نے پوچھا۔

"یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ میں نوادرات کا بے حد شوقین ہوں۔ میرے پاس مہاتما بدھ کا ایک نایاب اور قیمتی مجسمہ موجود ہے جس کا دھڑ اصلی لیکن سر نقلی ہے۔ میں اس کا اصلی سر حاصل کرنا چاہتا ہوں اور یہ امید لے کر آپ لوگوں کے پاس حاضر ہوا ہوں کہ آپ اس سلسلہ میں میری مدد فرمائیں گے۔"

"کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں کہ ہم یہ کام کرنے کے لئے راضی ہو جائیں گے۔؟"

"کیا ایسا ممکن نہیں۔" روہمر جلدی سے بولا "میں نے اس مجسمے کا اصلی سر حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن جگہوں پر اپنے آدمی پھیلا رکھے ہیں۔ انڈیا میں خاص طور پہ کیوں کہ وہ مجسمہ وہیں سے آیا تھا۔"

زاہد ایک لمحہ تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ اس آدمی کو دوبارہ پکڑتے جس سے آپ نے وہ مجسمہ خریدا تھا۔؟"

"اب وہ مر چکا ہے۔" روہمر نے جواب دیا۔

"اوہ" "لیکن آپ کو ہمارے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

"میرے آدمیوں نے مجھے خبر دی تھی کہ آپ کی حکومت

کا کوئی انتہائی اہم محکمہ بہت ہی راز داری کے ساتھ مہاتما بدھ کے
اس چوری کیے گئے مجسمے کے بارے میں تفتیش کر رہا ہے۔ آپ کی
حکومت یہ بھی جانتی ہے کہ اس مجسمے کا دھڑ میرے پاس ہے۔ کچھ
لوگ میری آرٹ گیلری میں اسی مجسمے کا معائنہ بھی کرنے آئے
تھے اگر میں چاہتا تو ان لوگوں کو آسانی سے پکڑ سکتا تھا۔ لیکن
میں نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ لوگ مجسمے سے
زیادہ اس کے اندر چھپی ہوئی کسی خاص چیز کی تلاش میں ہیں۔"

"انہیں کس چیز کی تلاش تھی۔؟" زاہد نے روہمر کو ٹٹولنے والی
نظروں سے دیکھا۔

"یہ میں نہیں جانتا مسٹر زاہد۔" روہمر بولا۔ "میرا خیال
ہے آپ بھی اسی چیز کی تلاش میں مجسمے کا سر ڈھونڈنے آئے ہیں۔
کیا خیال ہے۔؟"

زاہد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ روہمر دوبارہ کہنے لگا۔

"جس وقت انڈیا کے ایجنٹ میری آرٹ گیلری میں مجسمے
کا معائنہ کرنے آتے تھے تو میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ
لوگ ہی اب مجسمے کے اصلی سر کا بھی کوئی سراغ لگائیں گے اسی
لیے میں نے اپنے آدمی اُن ایجنٹوں کے تعاقب میں لگا دیے
تھے اب مجھے پورا یقین ہے کہ آپ لوگ جان گئے ہیں کہ
مجسمے کا سر کس کے پاس ہے۔ کیا آپ لوگ ناروے جا
رہے ہیں؟"

"حیرت ہے آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہم لوگ کون
ہیں اور کس مشن کے سلسلہ میں یہاں آئے ہیں۔" زاہد کا لہجہ
سخت ہو گیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ دونوں اسی سر کی تلاش میں
ناروے کی راجدھانی اوسلو ہی جا رہے ہیں۔"

"نہیں۔ اور ہو سکتا ہے ہاں۔؟"

روہمر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ ہم سے کوئی بات نہیں چھپا سکتے۔ میرے آدمیوں
کے لیے یہ جان لینا کوئی مشکل نہیں ہوگا کہ آپ کی منزل
کہاں ہے۔"

"مسٹر روہمر۔" جاوید غراتے ہوئے بولا "آپ بہت
ہی خطرناک کھیل کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے اس کا احساس ہے اور میں ہر خطرے کا مقابلہ
کرنے کے لیے تیار رہوں۔"

"پھر۔؟"

"آپ لوگ سمجھ ہی گئے ہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"

روہمر کہنے لگا۔ "میں اس کے لیے منہ مانگی قیمت دینے کیلئے
تیار ہوں۔ بس مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ مجسمے کا اصلی سر کس
کے پاس ہے....؟"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

زاہد نے گہری سانس لی اور روہمر سے کہنے لگا۔

"اصلی سر کہاں ہے، یہ بات تمہارے ایجنٹوں نے
نہیں بتائی۔"

"بس یہی بات ہمارے ایجنٹ ابھی تک نہیں جان سکے
ہیں۔" روہمر بولا "اسی لیے مجھے آپ لوگوں کی مدد کی
ضرورت ہے۔"

"سوری! اس سلسلہ میں ہم کوئی مدد نہیں کر سکتے۔" زاہد
نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" روہمر بے رُخی سے بولا۔ "اس مسئلہ
کا کوئی دُوسرا حل بھی ہو سکتا تھا، چلیئے، میں یہ آپ سے نہیں
پوچھتا کہ مجسمہ کا سر کس کے پاس اور کہاں ہے۔ میں تو صرف
یہ چاہتا ہوں کہ وہ سر کسی طرح مجھے لا دیجیے۔ اس کے معاوضہ
کے طور پر آپ جتنی رقم چاہیں طلب کر سکتے ہیں۔"

"شکریہ! مجھے آپ کی یہ پیشکش منظور نہیں۔" زاہد سرد
لہجے میں بولا۔

"آخر آپ کیا چاہتے ہیں۔" روہمر جھلاتے ہوئے
بولا "مجھے معلوم ہے کہ آپ کو وہ سر نہیں چاہیئے بلکہ اس
کے اندر چھپی ہوئی کوئی خاص چیز چاہیئے۔ پھر آپ کو انکار کیوں
ہے۔؟"

"بس! میں یہ سودے بازی پسند نہیں کرتا۔"

اس جواب سے روہمر کا چہرہ غصّہ سے سرخ ہو گیا۔ اس نے
زاہد کو گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ مت سمجھیئے کہ آپ غیر ملک میں ہیں مسٹر زاہد!
اور اگر میں چاہوں تو آپ سے یہ راز زبردستی بھی اُگلوا سکتا
ہوں کہ وہ سر کہاں ہے۔"

"اچھا! تو آپ اب دھمکیوں پر اُتر آئے۔" جاوید
غصیلے لہجے میں بولا۔

"یہ دھمکی نہیں بلکہ مشورہ ہے۔"

"مشورے کے لیے شکریہ! اب آپ تشریف لے
جا سکتے ہیں۔"

"او کے۔ او کے۔" روہمر نے گردن ہلائی اور زاہد
کو گھورتے ہوئے اپنا پرس نکالا اور اس میں سے اپنا کارڈ

کھینچ کر زاہد کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔
"یہ رہا میرا کارڈ! اگر آپ کا ارادہ بدل جائے تو آپ مجھے سر کے ساتھ اس پتے پر تشریف لا سکتے ہیں۔"
زاہد نے خاموشی سے کارڈ لے لیا۔
روہمر چند لمحوں تک کھڑا زاہد کو گھورتا رہا۔ پھر گھوم کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا جس طرف سے آیا تھا اسی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد زاہد جاوید سے بولا۔
"تم نے دیکھا، آج کل لوگ کتنے باخبر رہتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے اچھا نہیں ہوا۔ اس سے ہمارے کام میں سخت مشکلیں پیش آ سکتی ہیں۔"
"کیا اسے ہمارے مشن کے بارے میں بھی خبر ہے۔ یا صرف ہمیں انجان بن کر بے وقوف بنا رہا تھا۔؟"
"بہر حال اب ہمیں اس شخص سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔" جاوید کہنے لگا "اور اب وہ ہمارے پیچھے اپنے آدمیوں کو ضرور لگائے گا۔"
"صاف ظاہر ہے۔" زاہد بولا "آؤ چلیں ٹرین آ رہی ہے۔"
"چلیئے۔"
چلتے چلتے زاہد نے روہمر کا دیا ہوا کارڈ دیکھا۔ اس پر خوبصورت لفظوں میں چھپا ہوا تھا۔
"جی۔ پی۔ روہمر۔ جارج ففتھ ہوٹل، پیرس۔"
زاہد نے مسکرا کر یہ کارڈ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اوسلو سمندر کے کنارے بسا ایک خوبصورت شہر تھا۔ یہاں کے لوگ بہت ہی خوش اخلاق اور ملنسار تھے اور زیادہ تر مچھلیوں کا شکار کرتے تھے۔
کرنل زاہد اور جاوید اوسلو کے ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلے اور ٹیکسی پکڑ کر سیدھے ہوٹل برسٹل پہنچ گئے جہاں ساتویں منزل پر انہیں ایک ڈبل بیڈ والا کمرہ مل گیا۔ دونوں تھکے ہوئے تھے اس لئے جاتے ہی فوراً سو گئے۔
دونوں چار بجے اُٹھے اور نہا دھو کر تیار ہو گئے۔
"جناب! کچھ پیٹ پوجا کا بھی خیال ہے یا نہیں۔" جاوید بولا۔
"ہے۔ لیکن یہاں کے لوگ لنچ نہیں لیتے۔ یہ خیال رکھنا صرف ڈنر لیتے ہیں اور لنچ میں سنڈوچ پر گزارہ کرتے ہیں۔"
"بہت عجیب لوگ ہیں۔" جاوید حیرت سے بولا تھا۔
"میں تو یہاں خوش رہ سکتا ہوں لیکن میری ڈیڑھ وزن محبوبائیں ہیں جن کو ہر وقت کھانا کھانے کی عادت ہے۔"
زاہد اسے لے کر گراؤنڈ فلور پر واقع ایک ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا۔ جاوید کی طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ کیوں کہ وہاں ناروے کا قومی لباس پہنے خوبصورت لڑکیاں میزوں سے سرو کر رہی تھیں۔
دونوں گوشے کی میز پر جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک حسین لڑکی آرڈر لینے اُن کے پاس پہنچ گئی۔ جاوید کی باچھیں کھل گئیں۔
"یہاں کیا کیا ملتا ہے۔"
"جو آپ پسند کریں۔"
"مجھے تو آپ پسند ہیں۔"
"اوہ! نا ٹی بولتے۔" لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
زاہد نے جاوید کو گھورا اور کھانے کا آرڈر لکھوا دیا۔
تھوڑی دیر بعد ان کی میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔
"کھاؤ۔" زاہد جاوید سے بولا۔ "یہاں کا سب سے لذیذ کھانا ہے۔"
جاوید کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔
کھانے سے فارغ ہو کر وہ دونوں پیدل ہی راؤس گیٹ پہنچے، اس سے تھوڑی ہی فاصلے پر وہ سڑک تھی۔ جس پر چینی سفارت خانے کی عمارت تھی اور اس سے ایک فرلانگ دُور تھرڈ سیکرٹری کا فلیٹ تھا۔
زاہد اور جاوید ٹہلتے ہوئے چن لیاؤ کے فلیٹ کے سامنے سے گزرے یہ ایک بہت بڑا فلیٹ تھا جس میں کئی روم تھے۔ یہ فلیٹ ایک چار دیواری سے گھرا ہوا تھا اور جس میں لوہے کا پھاٹک نصب تھا۔
پھاٹک پر مقامی پولیس کی طرف سے مقرر گارڈ ہر وقت پہرہ دیتا رہتا تھا جو اس وقت بھی موجود تھا۔ فلیٹ کے عقب میں ڈبل گیراج تھا۔ لیکن پچھلی سمت اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔
دونوں خاموشی سے واپس لوٹ آئے۔
اگلے تین دنوں تک دونوں نے اس فلیٹ کی نگرانی کرنے کے علاوہ اور کوئی دوسرا کام نہیں کیا اور وہاں سے کئی سود مند باتیں معلوم کریں۔ مثلاً فلیٹ میں شوفر، باورچی، مالی اور چپڑاسی کو ملا کر صرف آٹھ نوکر تھے۔ لیکن صرف ایک نیگرو ملازم کو چھوڑ کر باقی سب اپنے اپنے گھر چلے جایا کرتے تھے۔
وہ نیگرو ملازم بوقت ضرورت چن لیاؤ کی گاڑی سے بھی

ڈرائیو کر لیا کرتا تھا لیکن زیادہ تر وہ چین لیاؤ کے محافظ کے طور پر کام کیا کرتا تھا اور ہر وقت سائے کی طرح چین لیاؤ کے ساتھ چپکا رہتا تھا اور فلیٹ کی دوسری منزل اس کی رہائش گاہ تھی۔

نیگرو کے کمرے کی کھڑکی سے فلیٹ کا صدر دروازہ، چہار دیواری اور باہر سڑک کا منظر صاف دکھائی دیا کرتا تھا۔

چین لیاؤ کا بیڈروم کہیں اندر تھا؟

چونکہ وہ علاقہ مختلف ملکوں کے نمائندوں کا تھا اس لئے وہاں پولیس کا سخت انتظام تھا اور گشتی گاڑیاں ہر وقت گزرتی رہا کرتی تھیں۔ یہ ایک بہت ہی اہم بات تھی کیونکہ اس سے فلیٹ کے اندر داخل ہونے میں گرفتار ہونے کا زبردست خطرہ تھا۔

زاہد کو چین لیاؤ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے فلیٹ میں تنہا رہنے کا عادی ہے۔ وہ رنڈوا تھا اور اس کی بیوی کو مرے کافی عرصہ بیت چکا تھا۔ اس کے بچے سوئٹزرلینڈ میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ پارٹیاں دینے اور پارٹیوں میں جانے کا بے حد شوقین تھا اور وہ رات کو ڈیڑھ دو بجے سے پہلے کبھی نہیں سوتا تھا۔

زاہد اور جاوید نے کافی ہوشیاری سے ملازمین کے بارے میں تحقیقات کی اور وہ آخر میں اس نتیجے پر پہنچے کہ فرانسیسی ہاؤس کیپر کلارا کے علاوہ کسی سے بھی کسی قسم کی مدد حاصل کرنا ممکن تھا؟

کلارا تقریباً چوبیس پچیس سال کی ایک دل کش لڑکی تھی۔ جو بوائے فرینڈز میں کافی دل چسپی لیا کرتی تھی۔ رات کو ٹھیک نو بجے وہ اپنی چھوٹی سی آسٹن میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو جاتی تھی۔ — اور فرینچ پارک میں واقع اپنے فلیٹ میں پہنچ جاتی تھی وہاں سے نہا دھو کر اور نیا لبادہ پہن کر اپنے کسی دوست کو ساتھ لے کر تفریح کے لئے نکل جاتی تھی۔

زاہد اور جاوید دونوں نے یہ بات بھی خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ کلارا ڈانس کی بے حد شوقین تھی اور زیادہ تر کلب مون لائٹ میں جایا کرتی تھی۔

ان دونوں نے یہ بھی پتہ چلا لیا تھا کہ کلارا کے پاس فلیٹ کے دونوں دروازوں کی چابیاں بھی رہتی ہیں۔

اس کے بعد زاہد کے لئے اس نتیجے پر پہنچنا ضروری ہو گیا کہ کلارا سے دوستی پیدا کی جائے اور اس سے نہ صرف وہ چابیاں حاصل کر کے نقلی چابیاں بنوائی جائیں بلکہ کسی وقت فلیٹ کی تلاشی لے کر یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ مہاتما بدھ کا مجسمہ کہاں رکھا ہے؟

کلارا سے دوستی بڑھانے کا کام جاوید کو سونپا گیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ جاوید کی یہ سنتے ہی باچھیں کھل گئی تھیں۔

جاوید نے اپنی عادت کے مطابق بہت جلد کلارا سے راہ و رسم پیدا کر لی اور زیادہ وقت وہ کلب مون لائٹ میں اس کے ساتھ گزارنے لگا۔

ایک ہفتہ بعد جاوید نے آ کر زاہد کو یہ خوش خبری سنا دی کہ آج کلارا نے اپنے فلیٹ پر مدعو کیا ہے۔

ٹھیک نو بجے تیار ہو کر جاوید ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

زاہد ہوٹل میں تنہا تھا۔

اچانک کسی آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے کوئی آواز نکالے بغیر اس کی طرف کان لگا دیئے۔ اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ کوئی کھڑکی کھولنے کی کوشش کر رہا ہے؟

چند لمحوں تک زاہد پڑا کچھ سوچتا رہا پھر وہ آہستگی سے اٹھا اور میز پر سے گل دان اٹھا کر ہاتھ میں لے لیا اور اندھیرے میں دبے پاؤں چلتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے اپنی سانس بھی روک رکھی تھی۔

باہر سے بیٹھے ہوئے شخص کا سایہ کھڑکی کے شیشے پر پڑ رہا تھا جو کھڑکی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

زاہد نہایت خاموشی سے انتظار کرنے لگا۔

آہستہ آہستہ کھڑکی کے پٹ کھلنے لگے۔ اس کے بعد ایک تاریک سایہ کھڑکی سے نکل کر کمرے کے دبیز قالین پر کود گیا.... اور پھر اس سے قبل کہ وہ سیدھا ہوتا۔ زاہد نے گلدان اس کے سر پر دے مارا۔

سائے کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی کراہ نکلی اور وہ لہرا کر قالین پر ڈھیر ہو گیا۔

ٹھیک اسی لمحہ کسی نے اس کے اوپر چھلانگ لگائی اور دو مضبوط ہاتھوں نے اس کی گردن دبوچ لی۔

اب زاہد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ظاہر تھا کہ کھڑکی پر دو آدمی تھے ایک آدمی کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اسی لئے دھوکہ کھا گیا۔

اچانک دوسرے آدمی کے وزن سے زاہد کی ٹانگیں مڑ گئی تھیں۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے قالین پر گرے۔ زاہد اب اپنی گردن کو اس آدمی کی گرفت سے آزاد کرانے کے لئے زور لگا رہا تھا لیکن وہ جیسے فولادی شکنجے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ دونوں زور آزمائی کرتے ہوئے سامنے کی دیوار سے ٹکرائے۔

ٹھیک اسی لمحہ پہلے والا بدمعاش ہوش میں آکر اُٹھ کھڑا ہوا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں زاہد اور اپنے ساتھی کو گتھے ہوئے دیکھنے لگا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ ان میں اس کا ساتھی کون سا ہے۔؟

زاہد بڑی مشکل سے اپنے شانوں پر سوار بدمعاش کو لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بدمعاش کی ٹانگیں اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھیں اور اس کا ایک بازو اس کی گردن کو جکڑے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ زاہد کی کنپٹی پر مسلسل مکے برسا رہا تھا۔؟

کرنل زاہد کمرے کے درمیان میں پہنچ کر تیزی سے دیوار کی طرف بھاگا اور دوسرے لمحہ بدمعاش اتنی زور سے دیوار سے ٹکرایا کہ بدمعاش کے حلق سے ایک تیز چیخ نکل گئی اور اس کی گرفت زاہد کے اوپر سے ڈھیلی پڑ گئی اور وہ بے جان چھپکلی کی طرح نیچے گر پڑا۔

زاہد نے اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ پاؤں کی ایک زبردست ٹھوکر اور اس کے اوپر جمادی۔ بدمعاش بے ہوش ہو کر ساکت ہو گیا۔

پہلا بدمعاش اب دھیرے دھیرے زاہد کی طرف بڑھنے لگا تھا لیکن زاہد نے اسے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور تیزی سے اس کی طرف جھپٹا اور کسی بیل کی مانند اس نے اپنا سر اس کے پیٹ سے دے مارا، پہلا بدمعاش تکلیف سے چلایا اور دوہرا ہوتا چلا گیا۔ زاہد نے پوری قوت سے اس کی گردن پر کراٹے کا وار کیا وہ بھی لہرا کر اس کے قدموں میں بے ہوش ہو کر گر پڑا!

زاہد نے ہانپتے ہوئے دیکھا۔ کمرے کے وسط میں پڑے بدمعاش کے ہاتھ میں ایک ریوالور بھی دبا ہوا تھا آگے بڑھ کر ریوالور زاہد نے اپنے قبضے میں لے لیا اور اس کے بعد باری باری دونوں کی تلاشی لینے لگا۔

پہلے والے بدمعاش کی جیب سے ایک سگریٹ کا پیکٹ اور ایک لائٹر اور ایک کنگھا اور چند نوٹ نکلے۔

دوسرے بدمعاش کی جیب سے تقریباً ویسی ہی چیزیں برآمد ہوئیں، لیکن ان میں دو چیزیں اور بھی تھیں.... ایک تو بڑا سا خطرناک چاقو، جو کھٹکے سے کھلتا تھا اور دوسرا ایک ڈرائیونگ لائسنس جس میں اس کا نام ہاکن لکھا ہوا تھا۔

زاہد نے دونوں کی ٹائیاں اور کمر سے پیٹیاں اتار لیں اور ان سے ان ہی کو باندھ کر ڈال دیا۔ پھر اس نے پہلے والے کو کندھے پر اٹھایا اور باتھ روم میں لے جا کر ڈال دیا اور دروازہ بند کر کے ہاکن کے پاس آ گیا۔

ایک کرسی کھینچ کر وہ ہاکن کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے ساتھی کا ریوالور اپنی گود میں رکھ کر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا؟

٭ ٭ ٭ ٭

تقریباً نصف گھنٹہ بعد ہاکن کو ہوش آیا۔

کمرے میں تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ زاہد نے ٹیبل لیمپ کی روشنی کا رُخ اسی کے چہرے کی طرف کر رکھا تھا۔

ہاکن ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

زاہد نے اپنی گود میں رکھا ہوا ریوالور اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ہاکن کمرے میں چاروں طرف اپنے ساتھی کو تلاش کر رہا تھا۔

"تم شاید اپنے ساتھی کو ڈھونڈ رہے ہو۔" زاہد دھیرے سے بولا "میں نے اس سے کچھ سوال پوچھے تھے اس نے جواب نہیں دیا۔ اس لئے میں نے اسے اٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینک دیا ہے۔ ساتویں منزل سے نیچے۔؟"

شدید حیرت سے ہاکن کی آنکھیں پھیل کر رہ گئیں۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے بے اختیار کھڑکی کی طرف دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" زاہد نے اس سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

لیکن ہاکن کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ زاہد نے ریوالور اپنی انگلی پر نچاتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب فوراً شروع ہو جاؤ۔"

ہاکن اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا تھا۔

"اگر تم نے فوراً اپنی زبان نہیں کھولی تو میں تمہیں تمہارے ساتھی کے پاس پہنچا دوں گا۔"

"سنئے! ہم آپ کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔" ہاکن دھیرے دھیرے کہنے لگا "ہمیں تو صرف آپ کے کمرے میں داخل ہونے کا حکم ملا تھا۔"

"کیوں۔؟" زاہد کی نظریں ہاکن کے چہرے پر جم گئیں۔

"ہمیں آپ کے کمرے کا سامان چرا کر اس شخص کے حوالے کرنا تھا ہمارا خیال تھا کہ آپ کمرے میں موجود نہیں ہیں...."

"اب تم اس شخص کے بارے میں بتاؤ جس نے تمہیں یہاں بھیجا تھا؟"

"میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔" ہاکن بولا۔

زاہد نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" ہاکن جلدی سے بولا "میں واقعی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہماری اس سے ملاقات ساحلی علاقے پر ایک کیبن میں ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں آپ

کے کمرے کا نمبر بتا کر کہا تھا کہ آپ کا سامان چڑا کر لاؤں گا "

" وہ سامان تمہیں لے جا کر کہاں دینا تھا ؟ " زاہد نے پوچھا۔

" اسی کیبن ہیں ۔" ہاکن بتانے لگا " سامان کے ساتھ ہمیں رات کے ایک بجے وہاں پہنچنا تھا۔ اس آدمی نے کہا تھا کہ سامان لینے وہ خود آئے گا یا اپنے کسی آدمی کو بھیجے گا "

زاہد نے اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ سوا بارہ بجے تھے۔ جاوید کو اب تک واپس آجانا چاہیئے تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ زاہد کو لگا جیسے وہ کہیں کسی مصیبت میں تو گرفتار نہیں ہو گیا۔ کہیں اس کے کمرے کا نمبر اور ہوٹل کا نام جاوید سے ہی تو نہیں اگلوایا گیا تھا ؟

" اس آدمی کا کیا حلیہ تھا " زاہد نے سوال کیا۔

" میں اس کی شکل اچھی طرح نہیں دیکھ سکا۔ کیونکہ کیبن میں اندھیرا تھا "

" اس کا قد کتنا رہا ہو گا ۔ ؟ "

" وہ .... ایک دراز قد آدمی تھا ۔"

" کیا وہ آنکھوں پر چشمہ لگائے ہوئے تھا اور اوورکوٹ پہنے تھا "

" جی نہیں "

زاہد نے گہرا سانس لیا۔ اگر ہاکن غلط نہیں کہہ رہا تھا تو وہ شخص روہمر نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے روہمر اپنا ایجنٹ ضرور بھیج سکتا تھا۔ لیکن زاہد کے دماغ میں یہ بات نہیں بیٹھ رہی تھی کہ ہاکن جیسے آدمیوں سے روہمر جیسا کوئی تعلق رکھے ؟

" کیا وہ فرانسیسی تھا ؟ "

" جی نہیں ۔ "

" تمہارے خیال میں وہ آدمی کس ملک کا ہو سکتا تھا ؟ "

" بہت ممکن ہے کہ وہ کوئی ایشین رہا ہو، لیکن افریقن ضرور ہو سکتا تھا "

" اچھا ہاکن یہ بتاؤ اگر تمہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ میں کمرے میں ہوں تو تم کیا کرتے ؟ "

" تو پھر ہم خاموشی سے واپس چلے جاتے ۔" ہاکن کہنے لگا " اور اس آدمی کو جا کر بتا دیتے کہ آج کام نہیں ہو سکا "

" تمہیں ہر حالت میں آج ایک بجے وہاں اس سے ملنا ہے "

" جی ہاں " ہاکن بتانے لگا " ہمیں ٹھیک ایک بجے رات کو ساحلی کیبن میں جا کر بیٹھ جانا ہے۔ وہ خود یا اس کا کوئی آدمی ملنے آئیگا "

" کیا تم جھوٹ بول رہے ہو ؟ "

" ہرگز نہیں جناب ! ہم معمولی چور ہیں۔ چھوٹی موٹی رقموں کے لئے کام کرتے۔ ہمیں اپنی جان پیاری ہے۔ ہم جھوٹ نہیں بولیں گے " ہاکن افسردہ لہجے میں بولا " آپ نے ہمارے دوست کو غصے میں نیچے پھینک دیا۔ بے چارہ ۔ "

زاہد نے محسوس کیا کہ ہاکن جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ یہ یقینی بات تھی کہ وہ پراسرار آدمی رات ایک بجے ہاکن اور اس کے ساتھی سے ساحلی کیبن پر ملنے والا تھا ۔ اگر یہ لوگ وہاں ایک بجے تک نہیں پہنچے تو اس آدمی کو شک ہو جائے گا اور ہوشیار ہو جائیگا؟ اگر بالفرض جاوید اس اجنبی کی قید میں تھا تو ایک بجے تک ہاکن اور اس کے ساتھی کی رپورٹ ملنے تک بالکل محفوظ تھا ؛

اب زاہد کو جو کچھ بھی کرنا تھا ایک بجے سے پہلے کرنا تھا۔ ایک بجے کے بعد شاید دشمن جاوید سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ہی بہتری سمجھے گا ۔

زاہد سوچنے لگا کہ جاوید دشمن کے پھندے میں کیسے پھنس گیا، پھر اسے کلارا کا خیال آیا ... کلارا سے ہی صحیح بات معلوم ہو سکتی تھی۔

" ٹھیک ہے ہاکن ۔" زاہد نے اس سے کہا " میں تمہاری بات پر یقین کئے لیتا ہوں۔ اب تم آزاد ہو "

" تھینکس سر ۔" ہاکن نے خوش ہو کر کہا۔

" اور تمہارا ساتھی باتھ روم میں پڑا ہے، جا کر اسے بھی آزاد کرا دو ۔" زاہد بولا ۔

ہاکن خوشی سے باتھ روم میں گیا اور تھوڑی دیر میں ہی اپنے ساتھی کو لے کر واپس آگیا ۔

دونوں نے زاہد کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

ان کے جاتے ہی زاہد نے کپڑے بدلے اور کمرے سے باہر نکل کر اس نے قفل لگایا اور لفٹ کے ذریعے نیچے اتر گیا۔

ٹیکسی سامنے ہی کھڑی تھی ۔ زاہد نے دروازہ کھولا اور پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا۔

" چلو .... "

ٹیکسی فراٹے بھرنے لگی تھی ۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ٹیکسی ایک پانچ منزلہ عمارت کے سامنے آکر رک گئی ۔

زاہد نے نیچے اتر کر ایک نوٹ ٹیکسی ڈرائیور کو تھمایا اور عمارت کی طرف بڑھ گیا ۔ یہ ایک پرانی عمارت تھی ۔

گیلری میں بہت سے لیٹر بکس نصب تھے۔ ان میں سے ایک پر کلارا کا نام بھی لکھا ہوا تھا اور فلیٹ کا نمبر بھی۔

زاہد سیدھا چوتھی منزل پر پہنچ گیا ۔ گیلری میں کافی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور سارے دروازے بند تھے ۔ زاہد نے دیکھا وہ

ایک گاؤن پہنے ہوئے تھی اور ابھی ابھی سو کر اٹھ کر آئی تھی۔ وہ ظاہر بھی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن زاہد کی گہری نظروں سے اس کے بالوں کی حالت چھپی نہ رہ سکی جو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے تھے۔۔۔ بالکل درست حالت میں تھے۔

"کیا چاہیے۔۔؟"

زاہد نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اسی وقت اندر سے تمباکو کا بھبکا آیا جو زاہد کی ناک میں گھس گیا۔ اندر شاید کوئی سگار پی رہا تھا۔۔!

"ارے؟ کیا گونگے ہو۔۔؟"

زاہد نے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے کلارا کا منہ دبوچا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کمر تھام لی اس نے اپنی کہنی سے دروازہ بند کیا اور کلارا کو لئے لئے اندر گھس گیا؟

کلارا زاہد کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے بری طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

برآمدے کو پار کر کے زاہد آگے بڑھا اور ایک شاندار ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ جس کے ایک گوشے میں ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ اس میں دو دروازے تھے جن میں سے ایک بند تھا۔ کھلے دروازے سے سگار کی بو آ رہی تھی اور روشنی بھی ہو رہی تھی۔

"کلارا۔۔" اندر سے بھاری آواز آئی۔

کلارا کے حلق سے گھوں گھوں کی سی آواز نکلنے لگی۔ زاہد نے اپنی گرفت اس کے اوپر اور زیادہ مضبوط کر دی۔

اسی لمحے دروازے پر ایک لمبا ضخیم سایہ نمودار ہوا۔۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی اس تک بالکل بھی نہیں پہنچ رہی تھی اس لئے زاہد اس کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ دوسرے ہی لمحے زاہد نے کلارا سمیت فرش پر چھلانگ لگائی تھی۔

اچانک فائر کی آواز گونجی اور گولی زاہد کے سر کے اوپر سے سنساتی ہوئی گزر گئی۔۔؟

زاہد نے کلارا کو ایک طرف پھینکا اور فوراً اپنا ریوالور نکال لیا اور کلارا کے اوپر سے چھلانگ لگا کر اس کے پیچھے پہنچ گیا۔

کلارا اس وقت تک بے ہوش ہو چکی تھی۔ زاہد اس وقت جہاں تھا وہاں تک ٹیبل لیمپ کی روشنی بھی نہیں پہنچ رہی تھی۔ ظاہر تھا دروازے پر کھڑا آدمی اسے بھی صاف طور پر نہیں دیکھ پا رہا ہوگا۔

زاہد نے دروازے کی طرف اپنے ریوالور کا رخ کیا لیکن اس کے فائر کرنے سے پہلے ہی وہ سایہ غائب ہو چکا تھا۔

اچانک اندر والے کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ زاہد اچھل کر بیٹھ گیا اور دروازے کی چوکھٹ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنے لگا۔ اسے سائے کا دروازے پر دوبارہ ظاہر ہونے کا انتظار تھا۔

دفعتاً اندھیرے میں ایک ہلکی سی چاپ ابھری اور دوسرے ہی لمحے کوئی چیز ڈرائنگ روم میں رکھے ٹیبل لیمپ سے ٹکرائی۔

نتیجے میں ٹیبل لیمپ گر پڑا اور اب ڈرائنگ روم میں بھی گھپ اندھیرا چھا چکا تھا۔

زاہد کے کان اب ہلکی سی آہٹ سننے کے لئے لگے ہوئے تھے۔ وہ دھیرے سے کلارا کے پاس سے اٹھا اور جھکا جھکا چلتا ہوا ڈرائنگ روم کی چوکھٹ تک پہنچ گیا اور وہیں قریب پڑی ایک میز کی آڑ میں ہوتے ہوئے بولا۔

"اے۔۔ میری بات سن رہے ہو؟"

لیکن اندر گہری مکمل خاموشی طاری رہی۔

"سنو۔ تم ایک فائر کر چکے ہو۔ اب اور گولیاں میں چلاؤں گا۔ فائرنگ کی آواز سن کر اس عمارت کا کوئی نہ کوئی شخص پولیس کو ضرور فون کرے گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو۔۔؟" اندر اندھیرے میں سے ایک بھرائی ہوئی سی آواز ابھری۔

"سنو۔۔" زاہد تحکمانہ لہجے میں بولا "میں ابھی اپنا ریوالور کلارا پر خالی کر دوں گا اور زور زور سے شور مچا کر لوگوں کو جمع کر لوں گا اور ریوالور سے اپنی انگلیوں کے نشان مٹا کر یہیں پھینک دوں گا۔ ویسے یہ ریوالور میرا ہے نہیں۔۔۔ میں چونکہ دروازے کے قریب ہوں اس لئے لوگوں کے آنے سے پہلے یہاں سے کھسک بھی سکتا ہوں لوگوں نے یا پولیس نے اگر تمہیں یہاں کلارا کی لاش کے ساتھ پکڑ لیا تو تم خود جانتے ہو کہ تمہارا حشر کیا ہو سکتا ہے۔"

اندر سے جواب نہیں ملا۔

"اچھا تو میں کلارا پر گولیاں برسانا شروع کرتا ہوں!"

"ٹھہرو۔۔" اندر سے کہا گیا۔ لیکن آواز بالکل قریب سے آئی تھی۔

زاہد نے اندازے سے اس جانب اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ آواز پھر آئی "تم کیا چاہتے ہو؟"

"پہلے روشنی کر دو تاکہ میں تمہیں دیکھ سکوں۔"

"نہیں۔ میں روشنی نہیں کروں گا۔" آواز آئی "میری صورت دیکھنا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے۔ بات چیت اندھیرے میں بھی ہو سکتی ہے۔"

اب زاہد کو اس کی آواز سن کر احساس ہونے لگا تھا جیسے وہ یہ آواز پہلے بھی کہیں سن چکا ہے۔ لیکن کہاں یہ اسے یاد نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ تحکمانہ لہجے میں کہا "تم پہلے روشنی کر دو۔"

"ہرگز نہیں، جو کچھ کہنا ہے اندھیرے میں ہی کہو۔ بولو،

کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں؟" زاہد نے کہا۔

"کون سی معلومات ۔۔۔؟"

"جاوید کہاں ہے ۔۔؟"

"اچھا! تو یہ بات ہے ۔۔؟" اندھیرے میں سے ایک قہقہہ پھوٹ پڑا تھا!

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

زاہد نے کچھ لمحوں تک انتظار کیا، اس کے بعد بولا۔

"تم اپنے آپ کو زیادہ چالاک ظاہر کرنے کی کوشش مت کرو، موت تمہارے سر پر کسی بھی وقت پہنچ سکتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تم اس وقت اندر کمرے میں نہیں ہو۔" زاہد کہنے لگا "تم اس وقت یہیں ڈرائنگ روم میں موجود ہو اور آہستہ آہستہ نہایت ہوشیاری سے میری طرف بڑھ رہے ہو اور اب اگر تم ایک انچ بھی آگے بڑھے تو میں تمہاری طرف گولیاں برسانا شروع کر دونگا۔"

"نہیں ..... تم ایسا نہیں کرو گے ۔۔؟"

"تو پھر میرے سوال کا جواب دو۔" زاہد بولا "جاوید کہاں ہے ۔۔؟"

وہ میرے قبضہ میں ہے لیکن بالکل محفوظ ہے۔ میں اس سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ بہت ہی ضدی ہے۔ اپنی زبان کھولنے کے لئے تیار نہیں۔ میں اس سے اپنی مخصوص معلومات حاصل کر کے اسے رہا کر دوں گا۔"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو ۔۔؟"

"اگر تم وہ معلومات مجھے مہیا کر دو گے تب بھی میں جاوید کو چھوڑ دوں گا۔ بتاؤ تم لوگ چن لیاؤ میں کیوں دلچسپی لے رہے ہو۔"

"ایک خاص وجہ سے چن لیاؤ میں دلچسپی لے رہے ہیں۔" زاہد کہنے لگا "کیا تم بھی اس میں دلچسپی رکھتے ہو۔ اگر ہم دونوں کا مشن ایک نہیں ہے۔ تب ہمارا آپس کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔"

"اور ہم دونوں کا مشن ایک ہوا تب۔"

"تب بھی کوئی نہ کوئی سمجھوتے کا حل نکل سکتا ہے۔" زاہد بولا "اب پہلے تم بتاؤ، تمہارا کیا مشن ہے؟"

"نہیں، تم اپنا مشن بتاؤ۔" اجنبی نے کہا۔ "یہ مت بھولو کہ تمہارا ایک ساتھی میرے قبضہ میں ہے، ہم زبردستی اس سے سب کچھ اگلوا سکتے ہیں۔"

"لیکن جب میں تمہیں اس لائق چھوڑوں گا تب نا۔"

"نہیں! تم ہمیشہ مجھے یہاں روک کر نہیں رکھ سکتے۔ اگر میں اپنے مقررہ وقت تک اپنے ٹھکانے پر نہیں پہنچا تو تمہارے ساتھی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔"

زاہد ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔

"معلوم ہوتا ہے، اب تمہیں عقل آ گئی ہے۔" اجنبی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اب بولو تم چن لیاؤ کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔"

"لیکن میں تمہیں ایک نہایت سنسنی خیز خبر سنانا چاہتا ہوں۔" زاہد بولا۔

"کیا ۔۔؟"

"وہ یہ کہ میں تمہیں پہچان چکا ہوں پیارے راجر ۔۔؟؟"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ایک لمحہ کے لئے گہری خاموشی چھا گئی۔

"تم اپنی آواز کو کتنا ہی بدلنے کی کوشش کیوں نہ کرو راجر" زاہد نے دوبارہ کہا "لیکن میں نے تمہیں پہچان لیا ہے .... سی آئی اے ایجنٹ ۔۔"

دوسری طرف سے پھر کوئی جواب نہیں ملا۔

"اب تو روشنی کر دو پیارے۔" زاہد بولا۔

جواب میں اچانک کوئی چیز زاہد سے آ کر ٹکرائی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں اندھیرے میں جا گرا اور وہ اپنے ساتھ لپٹنے والے سے بھڑ گیا۔

"میں نے اسے پکڑ لیا ہے...." کلارا زور سے چلائی "راجر میں نے اسے پکڑ لیا ہے۔"

زاہد کی یہ غلطی تھی کہ وہ کلارا کو بھول ہی گیا تھا۔ پتہ نہیں اسے کب ہوش آیا تھا اور اب وہ کسی چھپکلی کی طرح اس سے چپکی ہوئی تھی۔ زاہد اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کے لئے زور لگانے لگا۔

ایک جھٹکا سا ہوا اور کوئی چیز الٹ کر نیچے گری اور پھر دھپ دھپ کرتا ہوا کوئی بھاگنے لگا۔ اس کے بعد فلیٹ کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز کے بعد سناٹا چھا گیا۔

زاہد نے بڑی مشکل سے کلارا کو اپنے آپ سے چھڑایا اور دروازے کی طرف تیزی سے بھاگا لیکن اسی وقت کلارا نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ زاہد اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا لیکن گرتے گرتے بھی اس نے پلٹ کر دوسری ٹانگ کی ٹھوکر کلارا پر رسید کر دی تھی۔ کلارا الٹ کر دور جا گری۔

وہ سنبھل کر اٹھا اور دروازہ کھول کر گیلری میں آ گیا۔ راجر کا دور دور پتہ نہ تھا۔ وہ لفٹ تک پہنچا، لفٹ تیزی سے نیچے جاتی ہوئی دکھائی دی۔

زاہد پلٹ کر فلیٹ کی طرف بھاگا۔ اب راجہ کے تعاقب میں بھاگنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس کے چکر میں ہاتھ سے کلارا بھی نکل جاتی۔

کلارا اس وقت تک فلیٹ سے نکل کر دوسری جانب سیڑھیوں کی طرف بھاگنے لگی تھی۔ زاہد نے اسے دبوچ لیا۔ اور اسے اٹھا کر واپس فلیٹ کے اندر لے آیا اور ڈرائنگ روم میں روشنی کر دی۔

زاہد نے کلارا کو صوفے پر پھینک کر نیچے پڑا ہوا ریوالور اٹھا لیا اور بولا۔

"دیکھو وقت برباد کرنے کا موقع نہیں ہے، فوراً بتاؤ جاوید کہاں ہے۔؟"

کلارا صوفے پر پڑی ہانپتی رہی۔

زاہد نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے اور زور سے جھٹکا دیا۔ کلارا نے چلانے کے لئے منہ کھولا تو زاہد نے ریوالور کی نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔

"جلدی بتاؤ۔ جاوید کہاں ہے؟"

کلارا نے سر ہلایا تو زاہد نے نال اس کے منہ میں سے نکال لی اور کہنے لگا۔

"اس کا پتہ بتاؤ؟"

کلارا نے کچھ کہا لیکن زاہد کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے کلارا سے کہا۔

"تم کاغذ پر لکھ کر دو۔"

کلارا نے میز پر سے کاغذ اور قلم اٹھایا اور جلدی جلدی کچھ لکھ کر زاہد کی طرف بڑھایا۔ زاہد نے دیکھا کاغذ پر تحریر تھا۔

"ہاؤس نمبر ۳۱، شلوزگیٹ۔"

"کیا یہ صحیح ہے؟"

"ہاں۔"

"اگر دھوکا ہوا تو۔؟"

"نہیں۔ دھوکہ نہیں ہے۔"، کلارا نے انگلش میں جواب دیا۔

"سمجھ لو، اگر یہ پتہ غلط ثابت ہوا تو میں واپس آکر تمہیں شوٹ کر دوں گا۔" زاہد نے کہا۔

کلارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

زاہد نے فلیٹ میں ایک رسی تلاش کی اور اس سے کلارا کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے ٹائی باندھ دی۔ پھر اس نے کلارا کو اٹھایا اور بیڈ روم میں لے جا کر ڈال دیا۔

اس کے بعد اس نے بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ راجہ کے ادھ جلے سگار کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔

زاہد گردن ہلا کر واپس چل دیا۔

* * * * * *

ابھی ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

شلوزگیٹ پہنچ کر ۳۱ نمبر کی عمارت تلاش کرنا زاہد کے لئے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ ساحلی علاقے کا کیبن نما ہوٹل تھا۔ اس کے سامنے ایک وین کھڑی تھی جس کا زیادہ حصہ ترپال سے ڈھکا ہوا تھا۔

ہوٹل سے تھوڑی دور ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ خود کرنل زاہد موجود تھا اور نگرانی کر رہا تھا۔

وہ ابھی ابھی یہاں پہنچا تھا اور وین کو دیکھ کر ٹھٹھکا تھا۔ پھر اس نے وہیں ٹھہرنا مناسب سمجھا۔

تھوڑی دیر بعد ہوٹل کی عمارت سے دو آدمی گول لپٹا ہوا قالین اپنے کاندھوں پر اٹھائے باہر نکلے اور وین کی طرف بڑھنے لگے۔

زاہد سنبھل کر بیٹھ گیا۔

وین کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر کود کر قالین لانے والوں کا انتظار کرنے لگا۔ جب دونوں بوجھ اٹھاتے قریب آئے تو اس آدمی نے وین کا ترپال اٹھا دیا۔ دونوں آدمیوں نے لپٹا ہوا قالین وین میں رکھ دیا اور خود بھی اس میں سوار ہو گئے۔ ترپال ٹھیک کرکے تیسرا شخص دوبارہ سیٹ پر جا بیٹھا۔

وین کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ ایک طرف چل پڑی۔

"دیکھو۔" زاہد ڈرائیور سے بولا۔ "اس وین کا پیچھا کرنا ہے۔ لیکن ہوشیاری سے، تمہیں انعام ملے گا۔"

"لیکن جناب....؟"

وقت برباد ہو رہا تھا۔ کیونکہ وین کافی آگے نکل گئی تھا۔ اس لئے زاہد نے پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا اور اسے ڈرائیور کو دکھایا۔ ڈرائیور نے خوفزدہ ہو کر فوراً ہی اپنی ٹیکسی وین کے تعاقب میں لگا دی۔

"جناب کوئی خطرے والی بات نہیں؟"

"بالکل نہیں، تم نے نہیں دیکھا قالین میں شاید کسی کا جسم لپٹا ہوا تھا جو وہ لوگ کہیں لے جا رہے ہیں۔" زاہد نے کہا "وہ میرا ساتھی بھی ہو سکتا ہے جو ان لوگوں نے پکڑ لیا ہے۔"

ڈرائیور مطمئن ہو کر ٹیکسی کو نہایت ہوشیاری سے وین کے تعاقب میں لگائے ہوئے تھا۔ وین اوسلو کی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی مخالف سمت بھاگی جا رہی تھی۔ پھر وہ پندرہ منٹ بعد ایک دو منزلہ عمارت کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے سوالیہ نگاہوں سے زاہد کی طرف دیکھا زاہد نے اسے آگے لے جا کر ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا۔

زاہد کی ٹیکسی جب عمارت کے سامنے سے گزری تو اس نے دیکھا وین ایک گیراج کے سامنے کھڑی تھی اور ایک آدمی گیراج کا دروازہ کھول رہا تھا۔

تقریباً پچاس گز آگے جانے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی۔ زاہد نے ڈرائیور کو کرائے کے علاوہ پچاس کا نوٹ انعام میں دیا اور پیدل ہی عمارت کی طرف چلنے لگا۔

زاہد عمارت کے سامنے پہنچا۔ وین اب کپاؤنڈ میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ گیراج میں چلی گئی ہے۔ زاہد نہایت اطمینان سے عمارت کے کپاؤنڈ میں داخل ہو گیا اور دبے قدموں اس گیراج کی طرف بڑھنے لگا۔ جس کا دروازہ اس نے کھلتے ہوتے دیکھا تھا۔

قریب پہنچکر زاہد نے دھیرے سے اسے کھول کر اتنی جھری بنالی۔ جس میں سے وہ اندر آسانی سے داخل ہو سکے، وہ اندر گھسا اور پھاٹک پھر اسی طرح بند کر دیا۔

گیراج کی پشت پر ایک دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا اور جس میں سے باہر کی روشنی گیراج کے اندر پہنچ رہی تھی۔ وین گیراج میں موجود تھی۔ لیکن اس کے اندر قالین نہیں تھا۔

زاہد کو اب یہ یقین ہو گیا تھا جاوید زندہ ہے۔

اگر جاوید کو وہ لوگ ختم کر چکے ہوتے تو انہیں اسے قالین میں لپیٹ کر یہاں لانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسے کہیں بھی پھینک کر ٹھکانے لگا سکتے تھے۔ انہوں نے تو راجہ کے حکم پر جاوید کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا تھا کیونکہ راجہ کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ زاہد کلارا سے عمارت کا پتہ اگلوا لے گا۔

راجہ جاوید سے راز اگلوانا چاہتا تھا.... لیکن کون سا راز....

کیا راجہ کو بھی مہاتما بدھ کے مجسمے میں چھپی مائیکرو فلم کے بارے میں خبر ہو گئی تھی۔ زاہد نے سوچا یا وہ کسی اور خاص وجہ سے چن لیانگ میں دلچسپی لے رہا ہے۔

زاہد نے پھر اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور بلی کی سی چال چلتا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھا جہاں سے روشنی آ رہی تھی۔

دروازے کے دوسری طرف ایک طویل راہداری دکھائی دی۔ راہداری میں پہنچکر زاہد رک گیا اور آوازیں سننے لگا۔ کہیں سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

زاہد نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ آواز اوپر کی منزل سے آ رہی ہے۔ اس لئے وہ آگے بڑھ کر راہداری کے آخری سرے پر پہنچ گیا جہاں اوپر جانے کے لئے زینہ تھا۔

ابھی زاہد نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ اوپر سے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی، جیسے کوئی آ رہا تھا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

زاہد نے اپنا سانس روک لیا اور زینے کے نیچے چھپ گیا۔

کوئی بھاری قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگا اور پھر جیسے ہی وہ آدمی نیچے آیا۔ زاہد نے بجلی کی سی پھرتی سے اس پر حملہ کر دیا اس نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر دے ماری تھی۔

وہ آدمی بغیر کوئی آواز نکالے وہیں ڈھیر ہو گیا۔

زاہد نے جھک کر اس آدمی کا چہرہ دیکھا اور پہچان لیا۔ یہ وین کا ڈرائیور تھا۔ زاہد نے اسے گھسیٹ کر اس جگہ ڈال دیا جہاں ابھی وہ چھپا تھا۔

اس کے بعد وہ نہایت اطمینان سے زینہ طے کر کے اوپر پہنچ گیا۔ آواز اب کافی تیز آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن اتنی صاف نہیں تھی کہ وہ سن سکتا۔ آوازیں آخری کمرے میں سے آ رہی تھیں۔

زاہد اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا اور جھک کر کی ہول سے اپنی آنکھ لگا دی۔ اندر چھوٹے سے کمرے میں سامنے دیوار سے پیٹھ لگائے جاوید بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور چہرہ خون سے بھیگا ہوا تھا۔ خون کے داغ اس کی قمیص پر بھی جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔

زاہد نے دیکھا۔ جاوید کے سامنے ایک اسٹول پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا اور ایک دوسرا آدمی اس کی بغل میں کھڑا تھا۔

"اے مسٹر...!" اسٹول والا آدمی جاوید سے کہہ رہا تھا "تم کب تک نہیں بولو گے یہ دیکھنا ہے۔ جو کچھ ہم جاننا چاہتے ہیں۔ وہ تم سے ضرور اگلوا لیں گے۔ اس لئے اپنی درگت بنوانے سے کیا فائدہ...؟"

جاوید نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"شاید تمہیں اپنے ساتھی سے بہت سی امیدیں ہیں" بدمعاش دوبارہ کہنے لگا "تمہیں معلوم ہے کہ وہ کچھ ہوشیار ہے۔ لیکن وہ یہاں تک کسی بھی حالت میں نہیں پہنچ سکتا۔ وہ پہلے والے پتے پر جب پہنچے گا تو اسے کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

جاوید پھر بھی نہیں بولا تو اسٹول والے ساتھی نے کہا۔

"مجھے کچھ خدمت کا موقع دو... یہ ابھی بولنے لگے گا۔"

"نہیں..." اسٹول والے نے کہا "یہ عقلمند آدمی ہے اور خود ہی سب کچھ بتا دے گا۔ تمہیں تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تو ہاں مسٹر جاوید! تمہیں چن لیانگ میں کیا دلچسپی ہے — سچ سچ بتا دو...؟"

جاوید پھر بھی خاموش رہا۔

اگر تم نے اپنی زبان نہیں کھولی تو پھر میں زیرڈا کو اپنی حسرتیں نکالنے کا حکم دے دوں گا۔"

"بکواس بند کرو کتے۔" جاوید غرایا تھا۔

"آل رائٹ۔" اسٹول والا بدمعاش پھنکارتے ہوئے بولا۔ زیرڈا اچھا اسے سبق تو سکھاؤ۔"

لمبا چوڑا بدمعاش جس کا نام زیرڈا تھا اپنی باچھیں پھاڑتا ہوا جاوید کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب پہنچ کر اس نے نہایت بے رحمی کے ساتھ جاوید کے بالوں کو اپنی مٹھی میں پکڑا اور اس کا سر دیوار پر دے مارا۔ جاوید کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔

یہ دہشت ناک منظر دیکھ کر زاہد نے اپنی آنکھ چابی کے سوراخ سے ہٹائی اور سیدھا کھڑا ہو کر دروازے کو زبردست ٹھوکر ماری۔ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور زاہد اندر داخل ہوگیا۔!

"خبردار۔" زاہد نے اپنے ریوالور سے دونوں بدمعاشوں کو نشانے پر لے لیا تھا۔

دونوں بدمعاشوں کے چہرے خوف سے سفید پڑ گئے۔ زاہد کو دیکھتے ہی جاوید کے خون لگے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

"اب اسے کھول دو۔" زاہد نے زیرڈا کو حکم دیا۔

زیرڈا گھبرا کر جاوید کے بندھن کاٹنے لگا۔ دوسرے ہی لمحہ جاوید آزاد تھا۔ لیکن اس کے اندر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی طاقت نہیں تھی۔

"زیرڈا۔" زاہد نے دوسرا حکم دیا "اب اسی رسی سے اسٹول والے اپنے دوست کی مشکیں کس دو اور منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دو۔ چلو جلدی کرو۔"

زیرڈا نے وہی کیا جو زاہد نے حکم دیا تھا۔ اس کے بعد زاہد نے اس سے کہا۔

"اب جاوید کو اٹھا کر کھڑا کرو۔"

زیرڈا نے جاوید کو سہارا دے کر کھڑا کر دیا اور زاہد کے اشارے پر اسے لے کر آگے بڑھا۔

"نیچے چلو....." زاہد نے زیرڈا کی کھوپڑی سے ریوالور کی نال لگا دی۔

جاوید کو تقریباً اپنے اوپر لادے ہوئے زیرڈا دوسری منزل کے زینے سے نیچے اترا اور گیراج میں پہنچ گیا۔

"شاباش! اب جاوید کو وین میں بٹھا دو۔" زاہد نے حکم دیا۔

زیرڈا نے جاوید کو وین میں بٹھا دیا۔ اس کے بعد زاہد نے زیرڈا کی تلاشی لے کر ایک پستول برآمد کر کے اسے جاوید کے حوالے کر دیا۔

"پھاٹک کھولو۔"

زیرڈا نے پھاٹک کھولا۔ زاہد نے اسے بھی اپنے پاس وین میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب زیرڈا بیٹھ گیا تو زاہد نے وین اسٹارٹ کی اور اسے عمارت سے باہر نکال لایا۔ پیچھے جاوید بھی زیرڈا پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

"جاوید! اب کہاں چلیں۔"

ایک ہی جگہ ہے زاہد صاحب! جہاں ہم اس حرامزادے کی مزاج پرسی کر سکتے ہیں۔"

"کون سی جگہ؟"

"وہی شلوز گیٹ والی ساحلی ہوٹل" جاوید بولا "جہاں سے یہ لوگ مجھے لاتے ہیں۔ اس کے باس کو وہاں ہماری موجودگی کا تو کبھی خواب میں خیال نہیں آسکتا۔"

"کیا اس جگہ کی تمہارے پاس چابی ہے زیرڈا۔"

"جی ہاں۔!" زیرڈا نے جواب دیا۔

"تو پھر وہیں چلتے ہیں۔" زاہد نے وین کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا "اور جاوید تم جانتے ہو اس کا باس کون ہے... راجرپال سی آئی اے کے ایجنٹ! اسی کا یہ ہنگامہ کھڑا کیا ہوا ہے۔"

"اوہ۔"

"ہاں! کلارا کے فلیٹ پر میری ملاقات ہو چکی ہے۔"

یہ کہہ کر زاہد نے جاوید سے سارا واقعہ بیان کر دیا اور پھر پوچھا۔

"لیکن تم اس کے جال میں کیسے پھنس گئے؟"

"کیا بتاؤں زاہد صاحب۔!" جاوید دھیرے سے بولا "وہ لڑکی تو بہت ہی چلتی ونا نکلی۔ اس پر پہلے ہی راجرپال کا بہت گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ شاید دونوں ساتھ ہی رہتے تھے۔ کلارا میرے ساتھ کبھی تفریح کے لئے بھی جاتی تھی تو اس امید پر جاتی تھی کہ شاید وہ میری زبان سے کوئی کام کی بات اگلوانے میں کامیاب ہو جاتی ہے گی تاکہ وہ فوراً راجر کو بتا دے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا کہ اس کے تعلقات راجرپال سے ہیں تو اسے ایسی چال بتاتا کہ زندگی بھر ننگی کا ناچ ناچتی رہتی۔ راجر کے اشارے پر ہی کلارا نے مجھے اپنے فلیٹ میں دعوت دی تھی۔ جہاں راجر کے آدمیوں نے مجھے اغوا کر لیا۔

اسی وقت وین شلوز گیٹ کے کیبن کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

* * * * *

زاہد کے اشارے پر زیرڈا نے جاوید کو وین سے اتار دیا۔

ہوٹل کی عمارت سنسان پڑی تھی۔ تینوں چلتے ہوئے اندر پہنچے۔ زیرڈا نے ایک کیبن کا قفل کھولا۔ زاہد اور جاوید اس کے پیچھے کیبن میں داخل ہو گئے۔

"کرسی پر بیٹھ جاؤ زیرڈا!"

جب زیرڈا کرسی پر بیٹھ گیا تو زاہد نے جاوید سے کہا۔

"تم اس پر نگاہ رکھنا۔ میں وین سے چھٹکارا حاصل کر کے ابھی آتا ہوں!"

"بے فکر رہیں! اب یہ مکھی بھی اڑاتے ہوئے گھبرائے گا۔" جاوید بولا تھا۔

زاہد دروازے سے باہر نکل آیا۔

وین لے کر زاہد تقریباً دو میل آگے نکل گیا۔ اس نے وین ایک جگہ چھوڑی اور وہاں سے ٹیکسی پکڑ کر پھر شلوز گیسٹ واپس آ گیا۔

کیبن میں جاوید اسی طرح زیرڈا کو گھورتے ہوئے بیٹھا تھا جس طرح وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ اس نے جاوید سے پوچھا۔

"تم نے اس سے کچھ معلوم کیا۔۔۔؟"

"نہیں! آپ ہی پوچھیے" جاوید بولا "اس نے مجھے بہت مارا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہیں میں انتقام میں اسے قتل ہی نہ کر دوں؟"

کرنل زاہد زیرڈا کو گھورتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا، اور تحکمانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"دیکھو زیرڈا۔۔۔! اب ہم تم سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اگر تم نے اپنی زبان نہیں کھولی تو پھر ہم تمہاری بوٹی بوٹی تک الگ کر دیں گے۔۔۔۔"

"تت۔۔۔۔ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو۔۔۔؟" زیرڈا غرایا۔

"زاہد صاحب! یہ بہت شریف آدمی ہے۔ جب تک آپ اس کا ایک دانت نہیں توڑیں گے اور ایک ناخن نہیں اکھاڑیں گے۔ یہ کچھ نہیں بولے گا۔" جاوید بولا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں تم کس سے الجھ رہے ہو؟" زیرڈا کہنے لگا۔

"میرا باس اوسلو کا سب سے بڑا اور خطرناک آدمی ہے۔ وہ تم لوگوں کے پرزے ہوا میں بکھیر دے گا!"

"کون ہے تمہارا باس۔۔۔؟"

"طراف سارے کا نام اوسلو کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ سب لوگ اس کے نام سے کانپتے ہیں۔" زیرڈا غراتے ہوئے بولا تھا۔

"اور راجر پال سے تمہارے باس کا کیا تعلق ہے جس کے اشارے پر جاوید کو اغوا کیا گیا تھا؟" زاہد نے پوچھا۔

"راجر نے میرے باس کو اس کام کے لیے ایک موٹی رقم دی تھی!"

"راجر چن لیاؤ کے چکر میں کیوں ہے۔۔۔"

اس بات کا زیرڈا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا اب تم خود کو سنبھال سکتے ہو۔۔۔" زاہد نے گھوم کر پوچھا۔۔۔

"بالکل۔۔۔" جاوید بولا۔

"تو ذرا ان حضرات کو تو دیکھو۔۔۔"

جاوید اپنی جگہ سے اٹھا اور زیرڈا کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت اتنے خوفناک تاثرات تھے کہ زیرڈا کپکپا کر رہ گیا اور اس کے چہرے سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ جاوید نے بغیر سوچے سمجھے ریوالور کی نال کا وار زیرڈا کے جبڑے پر کر دیا رخسار کٹنے سے زیرڈا کا چہرہ بھی خون سے تر ہو گیا۔

جاوید نے مارنے کے لئے پھر اپنا ہاتھ اٹھایا۔

"نہیں۔۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔" زیرڈا خوف سے گھگھیایا۔۔۔

"میں بتاتا ہوں۔۔۔ سب بتاتا ہوں!"

چن لیاؤ کے فلیٹ میں مہاتما بدھ کا ایک مجسمہ ہے۔ راجر اسے چوری کروانا چاہتا ہے۔ وہ اس مجسمے کے بدلے طراف سارے کو پچاس ہزار ڈالر دینے کا سودا طے کر چکا ہے!"

زاہد اور جاوید ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے اگر یہ سچ تھا تو راجر کو معلوم تھا کہ مجسمے میں مائیکرو فلم چھپی ہوئی ہے تو پھر اسے مقامی غنڈوں کی مدد سے چوری کروانے کی کیا ضرورت تھی۔ چن لیاؤ ان کا اپنا آدمی تھا وہ مجسمہ ویسے بھی حاصل کر سکتے تھے۔ زاہد نے سوچا اور پھر زیرڈا سے بولا۔

"راجر ہم لوگوں سے کیا چاہتا ہے۔۔؟"

"وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آپ لوگ چن لیاؤ میں مجسمے کی وجہ سے دلچسپی لے رہے ہیں یا اور کوئی وجہ ہے۔ ویسے اسے خوف ہے کہیں آپ لوگ پہلے ہی مجسمہ پر ہاتھ صاف نہ کر دیں؟"

"اب راجر کہاں ہے۔۔؟"

"وہ کلارا کے فلیٹ پر ہی ہو سکتا ہے۔۔" زیرڈا نے جواب دیا۔

"ویسے وہ جاوید کو ہٹانے سے پہلے یہاں آیا تھا!"

کلارا کے فلیٹ سے تو وہ بھاگ کر آیا تھا۔ زاہد بولا۔۔۔

"بتاؤ اب راجر کہاں ہو سکتا ہے؟" زیرڈا خاموش رہا۔

"جاوید اس سے پتہ معلوم کرو!" زاہد بولا۔

جاوید کا ریوالور والا ہاتھ پھر اٹھا تو زیرڈا ایک دم چیخ پڑا۔

"نہیں۔۔۔۔ نہیں مجھے مت مارو۔ میں بتاتا ہوں۔ راجر میرے

باس کے پاس ہوگا۔"
"فرانٹ سائڈ کے پاس۔؟"
"ہاں" زبیرڈا روہانسی آواز میں بولا" میرا باس مجھے جان سے مارڈالے گا۔"
"گھبراؤ نہیں، اسے خبر نہیں ہوگی کہ ان کا پتہ تم نے بتایا تھا۔"
زاہد نے کہا" ہاں اب پتہ بتاؤ۔"
"جوزف گیٹ کے چوراہے کے پاس فلیٹ نمبر ۱۲ میں" زبیرڈا بتانے لگا" یہ ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ باس وہاں اکیلا رہتا ہے۔"
زاہد نے زبیرڈا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونستے ہوئے کہا" ہم تمہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اگر تمہارا پتہ جھوٹا ثابت ہوا تو پھر ہم واپس آکر تمہاری وہ خبر لیں گے کہ تمہارے خاندان والوں کی روحیں بھی کانپ جائیں گی۔ آؤ جاوید چلیں۔"

* * * * *

بارہ نمبر کا تنہا مکان اس وقت اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور سارے علاقے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔
زاہد نے جاوید کے ساتھ اس پرانے طرز کے مکان کے اردگرد ایک چکر لگایا لیکن اندر کہیں بھی زندگی کے آثار نہیں دکھائی دیئے پھر وہ عمارت میں داخل ہو گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور دبے ہوئے تھے۔
کچن کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس لئے زاہد کو کچن میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ جاوید کو بھی اس نے اندر کھینچ لیا۔
اندر سے انہیں دھپ دھپ کی آواز آتی ہوئی سنائی دی۔
کچن سے نکل کر وہ ہال میں پہنچے۔ بائیں جانب ایک دروازہ دکھائی دیا۔ وہ اس دروازے میں داخل ہوگئے۔ یہ کسی راہ داری کا راستہ تھا۔ یہ راستہ دراصل ایک تہہ خانہ کا راستہ تھا وہاں ہونیوالی تیز روشنی میں انہوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا دو آدمی پھاوڑے سے ایک گڑھا کھود رہے تھے۔
زاہد کچھ اور آگے بڑھا۔
اور تب اسے وہ آدمی بھی دکھائی دے گیا جو زینے کی طرف پشت کئے کھڑا تھا اور اس نے لمبا گاؤن پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور بھی دبا ہوا تھا لیکن اس سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے قدموں میں راجر پڑا ہوا تھا۔
زاہد نے دیکھا راجر کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا بھی ٹھونسا ہوا تھا لیکن اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔
"راجر کی قبر کھودی جا رہی ہے۔" جاوید نے زاہد کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں اسے بچانا چاہیئے۔" زاہد بولا۔
"نہیں، نہیں کیا فائدہ۔!" جاوید بڑبڑایا" ہمارا ایک دشمن ہی کم ہوگا۔۔"
اگر یہ مر گیا تو ہمیں یہ کبھی نہیں معلوم ہو سکے گا یہاں وہ کیا کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ بعد میں اس کی جگہ کوئی نیا ایجنٹ آجائے گا جسے ہم پہچانیں گے بھی نہیں صرف راجر ہی ہمیں بہت سی معلومات بہم پہنچا سکتا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" جاوید نے گردن ہلائی" آپ گاؤن والے کو دیکھئے میں ان دونوں گورکنوں کا کفن تیار کرتا ہوں۔"
"او کے۔" زاہد نے سر ہلا دیا۔
دبے پاؤں وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے اور پھر زاہد کا اشارہ پاتے ہی جاوید نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔
دونوں قبر کھودنے والے گھبرا کر اپنی ہی کھودی ہوئی قبر میں جاگرے۔ گاؤن والے کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر دور جاگرا اور وہ لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گیا۔
زاہد اور جاوید دونوں راجر کے پاس پہنچے۔ جس کا چہرہ جلدی جلدی رنگ بدل رہا تھا۔ زاہد اس سے بولا۔
"کیا جہنم میں جانے کا ارادہ تھا؟"
راجر کے منہ میں چونکہ کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اس لئے وہ گھوں گھوں کر کے رہ گیا۔
"تم کلارک کے فلیٹ سے بغیر اپنی صورت دکھائے بھاگ آئے تھے۔" زاہد بولا۔
جاوید نے اس کے منہ میں سے ٹھنسا ہوا کپڑا نکالنا شروع کر دیا۔ راجر گہری گہری سانسیں لے کر اپنے آپ کو سنبھالنے لگا پھر ہانپتے ہوئے بولا۔
"کرنل! میری جان بچائی ہے اس لئے شکریہ۔؟"
"نہیں! تمہاری جان ابھی بچی نہیں ہے" زاہد نے پر اسرار لہجہ میں کہا۔
"میں نے جاوید کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے لئے مجھے افسوس ہے" راجر کہنے لگا۔
"میری تقدیر آج کل میرا ساتھ نہیں دے رہی۔ اب تک جو ہو چکا اسے بھول جاؤ کرنل! اور مجھے اس جہنم سے بچاؤ۔ پھر ہم مل کر باتیں کرلیں گے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں۔ تم چین لیاؤ سے اپنا مقصد حاصل کرنا۔ میں اپنا مطلب حل کرلوں گا۔ بالفرض اگر ہم دونوں کا مشن ایک ہی ہوا تب بھی ہم آپس میں فیصلہ کرلیں گے۔"
"ہم تمہارے مشن کے بارے میں جانتے ہیں۔" زاہد بولا۔
"کیا۔۔؟"

"ہاں! تم چن لیاؤ کے گھر سے مہاتما بدھ کا مجسمہ چوری کرنا چاہتے ہو راجر"۔

"اچھا تو یہ کہانی تمہیں ان لوگوں نے سنائی ہے جن کے ذریعے میں نے جاوید کو پکڑا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو یہی بتایا تھا" راجر کہنے لگا "کرنل! حقیقت یہ ہے کہ اس مہاتما بدھ کے بت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر تمہارا مشن اسے حاصل کرنا ہے تو میں اسے تحفے کے طور پر آپ کی نذر کر دوں گا"۔

زاہد اور جاوید دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر زاہد بولا۔

"راجر! پھر تمہارا مشن کیا ہے۔؟ تم کیوں چن لیاؤ کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔"

"پہلے مجھے آزاد کرو۔ بعد میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا"۔

"تمہارا کیا بھروسہ دوست! تم کئی بار مجھ سے فریب کر چکے ہو"۔

"نہیں میرا یقین کرو کرنل!"

زاہد نے اشارہ کیا تو جاوید نے اس کے بندھن کھول دیئے۔ راجر اٹھ کر اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر خود کو سنبھالنے لگا۔

"چلو اب شروع ہو جاؤ....؟"

"نہیں... پہلے یہاں سے تو نکلئے۔" راجر کہنے لگا "تم نے اوسلو کے سب سے بڑے بدمعاش طراف سارتر کو اس کے گھر میں گھس کر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے"۔

"اچھا چلو۔"

تینوں خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

راجر، زاہد کے ہوٹل کے کمرے میں موجود تھا۔!

ابھی تھوڑی دیر قبل وہ تینوں یہاں پہنچے تھے۔ ویٹر کافی کی ٹرے ان کے سامنے لا کر رکھ گیا تھا۔

"ہاں تو راجر! اب شروع ہو جاؤ۔" زاہد نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"یار! صبح بات کر لینا! اس وقت تو نیند آ رہی ہے۔" راجر بولا۔

جاوید نے راجر کی طرف گھور کر دیکھا اور اس نے اپنی گود میں رکھا ہوا ریوالور اٹھا کر اس کی نال کا رخ راجر کی طرف کر دیا۔

"اچھا تو سنیئے! میرے ملک کو یہ خبر ملی تھی کہ یہاں پر موجود چینی سفارتخانے کا تھرڈ سیکرٹری چن لیاؤ اپنے ایجنٹوں کی مدد سے میرے ملک میں بغاوت کرانا چاہتا ہے پھر اور خفیہ کارنامے کرانا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ چن لیاؤ ہمارے ملک کی خبریں حاصل کرنے کے لئے چین سے بے تحاشہ پیسہ منگواتا ہے جس میں سے نصف خود ہضم کر جاتا ہے اور باقی ایجنٹوں کو تقسیم کر دیتا ہے.... اس طرح چن لیاؤ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے اور رقمیں جمع کر رہا ہے۔ خیر مجھے حقیقت جاننے کے لئے یہاں بھیجا گیا ہے"۔

"یعنی تمہارے ملک میں وہ بغاوت کرنا چاہتا ہے"۔

"جی ہاں۔" راجر بولا "اس کے علاوہ میں یہ بھی چیک کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اتنی دولت جمع کر کے کیا کرنا چاہتا ہے"۔

"ہو سکتا ہے وہ دولت خوب جی کھول کر خرچ کر رہا ہو اور اس کے پاس کچھ بھی نہ بچا ہو"۔

"یہ ناممکن ہے، وہ دولت اپنے ریٹائرڈ ہونے کے بعد خرچ کرنا چاہتا ہو گا اور اس کے ریٹائر ہونے میں اب تھوڑے ہی سال باقی ہیں"۔

"ممکن ہے ایسا ہو۔" زاہد بولا "لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ اس نے وہ ساری رقم اپنے پاس ہی رکھ چھوڑی ہو"۔

"اور کہاں چھپا سکتا ہے"۔ راجر نے کہا۔

"خیر تم نے چن لیاؤ کی دولت ہضم کرنے کے لئے کیا کاروائی کی ہے۔" زاہد بولا "لگتا ہے تمہارا مقصد اس کی دولت پر قبضہ جمانا بھی ہے۔"

راجر یہ سن کر دھیرے سے مسکرایا۔ پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگا۔

"آپ لوگوں کی طرح میں نے بھی اپنے کام کی ابتداء وہیں سے کی جہاں سے آپ نے کی ہے۔ کلارا بہت ہی شوخ و شریر اور مردوں کی بھوکی لڑکی ہے۔ مجھے اس کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے کوئی پریشانی نہیں ہوئی"۔

"ہوں۔" جاوید غرایا تھا "یہاں آ کر ایک لڑکی مشکل سے ملی تھی، لیکن تم نے پہلے ہی اس پر قبضہ جما لیا"۔

"جل رہے ہو۔؟" راجر ہنسا۔ "خیر تو میں نے کلارا سے ایک دن پوچھا تھا کہ وہ چن لیاؤ کے گھر میں کوئی ایسی جگہ بتا سکتی ہے جہاں کافی موٹی رقم چھپائی جا سکے۔ وہ وہاں کی ہاؤس کیپر تھی۔ ایسی کونسی جگہ ہو گی جہاں اس کی نگاہیں نہ پہنچتی ہوں اس نے مجھے کئی جگہوں کے نام بتلائے لیکن مجھے ان میں سب سے زیادہ ایک ہی جگہ پسند آئی"۔ "وہ کون سی جگہ؟"

"وہ جگہ چن لیاؤ کے بیڈ روم میں ایک مہاتما بدھ کا بہت بڑا مجسمہ تھی اور کلارا کا بیان تھا کہ چن لیاؤ نے وہ مورتی کمرے کی سجاوٹ کے لئے وہاں رکھ چھوڑی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہتی تھی کہ مجسمے کا سر باقی دھڑ سے الگ ہو جاتا ہے۔ بس،

دھڑ کے ساتھ یوں کسا ہے جیسے اپنی چوڑیوں پر کس کر پیچ کس جاتا ہے۔"

"اسے یہ کیسے معلوم ہوا ؟" زاہد بولا۔

کلارا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک دن جب بیڈ روم میں گئی تو اچانک اس کی نظریں مجسمے پر پڑیں تو اس نے مجسمے کا سر دھڑ سے کچھ ٹیڑھا پایا۔ اگر وہ پورا مجسمہ ایک حصہ میں ہوتا اس کا سر کیسے گھوم سکتا تھا۔ شاید چن لیاؤ کی جلد بازی سے سر ترچھا رہ گیا تھا۔ دوسرے دن کلارا کو مجسمے کا سر پھر اپنی اصلی حالت میں ملا تھا۔"

"اس کے بعد کیا ہوا ۔ ؟"

"اس کے بعد میں نے کلارا کی مدد سے چن لیاؤ کے فلیٹ کے دروازوں کی چابیوں کے ڈپلی کیٹ بنوا لئے اور آنے والے اتوار کا انتظار کرنے لگا۔"

"کیوں اتوار کا دن کیوں منتخب کیا تھا ؟" زاہد نے پوچھا۔

"کیونکہ وہ چھٹی کا دن تھا۔" راجر کہنے لگا۔ "اور اس دن چن لیاؤ اپنے دوستوں کے ساتھ کسی نہ کسی پارٹی میں شامل ہوا کرتا تھا اور رات گئے واپس آیا کرتا تھا۔"

"اور اس وقت فلیٹ خالی ہوتا تھا ۔ کیوں ۔ ؟" زاہد مسکرایا تھا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

راجر دھیرے سے مسکرایا اور کافی کا کپ خالی کرتے ہوئے بولا۔

"بالکل خالی تو نہیں ۔ چن لیاؤ کا منیجر و ملازم وہاں رہتا تھا۔" راجر کہنے لگا۔ "اب آنے والا اتوار ہی سارے راز پر سے پردہ ہٹا دے گا۔ میں نے فلیٹ میں داخل ہونے کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔"

"کیا طراف سائرے سے گٹھ جوڑ کر کے ۔ ؟"

"جی ہاں ! اس سے میں نے یہی کہا تھا کہ چن لیاؤ کے گھر سے مجھے مہاتما بدھ کا وہ مجسمہ چوری کرنا ہے ۔" راجر بتانے لگا "حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے مجسمے کی نہیں اس کے اندر پوشیدہ دولت کی ضرورت تھی۔ جو میں ایک سوٹ کیس میں بھر کر وہاں سے صاف نکال لے جاتا۔"

"وہ لوگ تمہاری طرف سے مشکوک نہیں ہو جاتے جب تم وہ مجسمہ نہیں چراتے اور سوٹ کیس میں مال لے کر چلتے۔"

"نہیں ! انہیں تو اپنے معاوضہ سے مطلب تھا جو میں ادا کرنے والا تھا۔"

"وہ دولت دیکھ کر اپنی نیت بدل لیتے تب ؟"

"تو ہو سکتا ہے وہ مجھے قتل کر دیتے اور ساری دولت خود ہضم کر جاتے۔ لیکن میں ایسی نوبت نہیں آنے دیتا۔ میں انہیں دولت کی بھنک بھی نہیں پڑنے دیتا میں نے بڑے بڑوں کو چلایا ہے تو پھر وہ کس گنتی میں تھے۔"

"پھر طراف سائرے تمہارے خلاف کیوں ہو گیا ؟" زاہد بولا

"وہ مجھے اپنے تہہ خانے میں زندہ دفن کرنا چاہتا تھا۔"

"اس نے میرے ساتھ چال چلنے کی کوشش کی تھی۔" راجر کہنے لگا "اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اس مہاتما بدھ کے مجسمے میں ایسی کیا بات ہے کہ جسے حاصل کرنے کے لئے میں اسے اتنی بھاری رقم پیش کر رہا ہوں۔ میں نے اسے بہت ٹالنا چاہا لیکن وہ کرید کرید کر یہی پوچھتا رہا کہ مجسمے کا راز کیا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ مجسمے کی ایک تاریخی حیثیت ہے کوئی نوادرات کا شوقین اسے بھاری رقم میں خرید سکتا ہے۔ وہ حرام زادہ کسی ماہر سے اس کے بارے میں تحقیق کرنے پہنچ گیا اور وہاں سے سن آیا کہ اسے تو لاکھوں روپے میں فروخت کیا جا سکتا ہے، واپس آکر وہ مجھ سے کہنے لگا کہ وہ طے شدہ معاوضہ نہیں لے گا بلکہ مجسمے کی آدھی قیمت مجھ سے وصول کرے گا۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا اور ہمارا جھگڑا اتنا بڑھا کہ اس نے مجھے تہہ خانے میں دفن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن عین موقع پر آپ آ گئے کرنل اور مجھے بچا لیا۔"

"تم ہمارے چکر میں کیوں پڑ گئے تھے ۔ ؟" زاہد نے سوال کیا۔

"جب میں نے آپ لوگوں کو چن لیاؤ میں دل چسپی لیتے ہوئے دیکھا تو میرے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے۔" راجر کہنے لگا۔ "پہلے تو میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ آپ لوگوں کو بھلا چن لیاؤ سے کیا دل چسپی ہو سکتی ہے۔ اپنے مشن کی کامیابی کے لئے اب یہ جاننا میرے لئے بہت ضروری ہو گیا تھا، کہ آپ لوگوں کا مشن کیا ہے۔ اس کے لئے میں نے کلارا کو استعمال کیا اور جاوید کو دعوت دلوائی۔ وہاں میں نے جاوید کو طراف سائرے کے آدمیوں کے ذریعے اغوا کرا لیا۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہی ہے ؟"

"بس یہ تھی کہانی ۔ ؟" جاوید بولا۔

"ہاں اب آپ لوگ بتایئے کہ آپ کا مشن کیا ہے ۔ ؟" راجر نے پوچھا۔

"نہیں ! ہم یہ نہیں بتا سکتے ۔"

"کرنل ! مجھے اتنا ہی بتا دیجئے کہ آپ چن لیاؤ کی دولت کے چکر میں نہیں ہیں۔ اگر آپ کا مشن یہ نہیں ہے تو پھر آپ جو چاہیں کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"اچھا تو پھر سنو، تمہارے چن لیاؤ کی دولت سے ہمیں کوئی بھی دل چسپی نہیں ہے ! اب تو خوش ۔" زاہد بولا۔

"تھینکس گاڈ ۔۔!" راجر نے اطمینان کا گہرا سانس لیا تھا" اب میں مطمئن ہوں کہ ہمارے مشن ایک نہیں ہیں۔ پھر تو آپ کو میری مدد کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے کرنل"

"کیا مطلب ۔۔؟"

"مطلب یہ کہ میں تنہا اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا" راجر کہنے لگا ۔ "اب تو یہاں کے بدمعاشوں سے مدد لینے کا مطلب اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ ایسی حالت میں آپ کے علاوہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا ۔۔"

"لیکن راجر، ہم آپ کی مدد کیوں کرنے لگے ۔۔" زاہد بولا "ہم نے تمہاری جان بچا دی، یہی احسان کیا کم ہے ۔۔"

"اگر آپ نے میری مدد کی تو میں بھی آپ کے کام آ سکتا ہوں"

"تم .... تم ہمارے کیا کام آ سکتے ہو؟"

"کرنل! میرے پاس چن لیاؤ کے فلیٹ کی چابیاں موجود ہیں، اُن کے بغیر آپ عمارت میں داخل نہیں ہو سکتے" راجر بولا

زاہد نے سوالیہ نظروں سے جاوید کی طرف دیکھا ۔۔۔ جاوید جلدی سے بولا "مسٹر راجر..... ! راجر، تم اس وقت ہمارے قبضہ میں ہو۔ ہم آسانی سے تم سے وہ چابیاں حاصل کر سکتے ہیں"

"تم ٹھیک کہتے ہو کیپٹن ۔۔!" راجر بولا "میں زندہ بھی تمہاری وجہ سے ہوں ..... آپ لوگ ہی میری زندگی کے مالک ہیں۔ چابیاں ویسے بھی میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا"

یہ کہہ کر راجر نے اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا، اور زاہد کے سامنے رکھ دیا۔

"راجر پال ۔۔!" زاہد اس سے بولا "فی الحال تم یہیں آرام کرو، کل صبح میں تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا"

"آل رائٹ ۔۔"

"اور سنو، ہم سے کوئی چال چلنے کی کوئی کوشش مت کرنا"

"آپ بے فکر رہیں کرنل ! اور جو کچھ ہو چکا ہے، اسے بھول جائیں"

"زاہد صاحب ۔۔" اچانک جاوید جلدی سے بولا "ہم ایک بہت ضروری بات تو بھول ہی گئے"

"وہ کیا ۔۔؟"

"ہم نے راجر پال کی تلاشی نہیں لی ہے"

"نہیں کیپٹن ۔۔! ایسا کرنے میں اُلٹا میرا ہی نقصان ہوگا" راجر نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ لوگوں کی مدد سے تو میں اپنا مشن کامیاب بناؤں گا ۔۔"

"خوشامد خوب کر لیتے ہو" جاوید نے بولا۔

"آپ کو میری باتوں کا یقین نہیں آ سکتا۔ میں کیسے یقین دلاؤں"

"اچھا ! اچھا ! اب آرام کرو۔ ہم باری باری جاگ کر تمہاری نگرانی کرتے رہیں گے" زاہد نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

* * * * *

دوسری صبح ناشتے کے بعد راجر نے اپنا سگار سلگاتے ہوئے کہا ۔۔

"کرنل ! آپ نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ۔۔؟"

"میرا خیال ہے کہ ہم تمہاری مدد قبول کر لیں ۔۔" زاہد بولا۔ حالانکہ کیپٹن جاوید اس کی مخالفت کر رہا ہے"

"تھینکس کرنل ۔۔!" راجر کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

"لیکن اس کے ساتھ ایک شرط بھی ہے"

"وہ کیا ۔۔؟"

"چن لیاؤ کے فلیٹ سے تم جتنی دولت حاصل کرو گے، اس میں سے نصف تم ہمارے حوالے کر دو گے ۔۔"

راجر کا چہرہ راکھ کی طرح سپید پڑ گیا۔ وہ جلدی سے کہنے لگا۔ "کرنل یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ دولت حاصل کرنا ہی میرا مشن ہے۔ اگر آپ نے ان میں سے حصہ بٹا لیا، تو میں کامیاب کیسے کہا سکتا ہوں"

"دیکھو راجر! ابھی دولت کا صحیح اندازہ نہیں کہ کتنی ہے، وہ ایک کروڑ بھی ہو سکتی ہے۔ اور پچاس لاکھ بھی۔ اس لئے جتنی رقم ہم آپس میں تقسیم کریں، تم اپنے حصے کی رقم ہی اپنے آفیسرز کو بتانا کہ چن لیاؤ کے فلیٹ سے بس یہی برآمد ہوئی ہے"

"مم ... مگر ۔۔؟"

"اگر مگر کچھ نہیں ۔۔" زاہد کہنے لگا "یہ نصف رقم بھی ہم تمہیں اپنی طرف سے لے جانے دیں گے۔ ورنہ تم تو ختم ہی ہو چکے ہو۔ اور اگر تم نے زیادہ بکواس کی تو پھر ہم اس میں سے تمہیں ایک پائی بھی نہیں دیں گے"

"آپ اس رقم کا کیا کریں گے ۔۔؟"

"اپنے دشمنوں کو امن کی راہ سے ہٹانے ہی صرف کریں گے ۔۔" زاہد کہنے لگا "امن جو ساری دنیا کیلئے ضروری ہے"

"آل رائٹ کرنل ! مجھے منظور ہے"

"اور ہاں اپنے مشن کے دوران تم ہر وقت ہماری نگرانی میں رہو گے اور تم نے اگر ذرا بھی شرارت کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام بہت بُرا ہوگا ۔۔"

"او کے سر ۔۔"

اس کے بعد زاہد نے ہیڈ کوارٹر کو فون کر کے اپنے لغل والاغالی

کمرہ راجر پال کیلئے بک کرادیا اور اسے اس میں منتقل کر دیا اور ویٹروں کو لمبی ٹپ دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ ہر وقت راجر پر نگاہ رکھیں گے۔

شام کے وقت زاہد جاوید کنسلے کرچن لیاڈ کے فلیٹ کا چکر لگانے گیا، اور دو گھنٹے بعد واپس آکر انہوں نے راجر کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ نہ تو اپنے روم سے باہر نکلا اور نہ کوئی اس سے ملنے آیا۔ نہ کوئی فون آیا اور نہ وہ کہیں گیا تھا۔ راجر نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا جس سے اس پر شبہ بڑھ جاتا۔

رات میں زاہد نے راجر کو بھی ڈنر میں اپنے ساتھ شامل کیا۔ یہ ڈنر ان لوگوں نے ہوٹل کے ہال میں لیا تھا۔

اس کے بعد سونے کے لئے وہ لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

رات کو تقریباً ڈھائی بجے زاہد کی آنکھ کھلی۔ پہلے وہ باتھ روم میں گیا اس کے بعد اسے راجر کا خیال آیا۔ وہ اپنے کمرے میں سے نکلا۔ گیلری میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا راجر کے روم کے پاس پہنچ گیا۔

زاہد نے جھک کر چابی کے سوراخ پر اپنی آنکھ لگا کر راجر کے کمرے میں جھانکا، اندر اسے نیم تاریکی میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس نے دروازے کے ہینڈل گھما کر دروازے کو دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا۔

شاید وہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔

زاہد نے دھیرے دھیرے دروازہ کھولا۔ گیلری کی روشنی اب کمرے میں پہنچنے لگی تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور راجر کے بیڈ کی طرف دیکھا..... لیکن راجر کا بستر خالی پڑا ہوا تھا۔

زاہد اندر داخل ہو کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا وارڈروب میں اس کا وہ سوٹ لٹکا ہوا تھا جو اس نے ڈنر کے وقت پہنا تھا اور کمرے میں راجر کے جوتے بھی موجود تھے لیکن خود راجر کا کہیں پتہ نہ تھا۔

باتھ روم بھی خالی پڑا تھا۔

زاہد نے فوراً فون کا ریسیور اٹھایا اور آپریٹر سے پوچھا۔

"کیا مسٹر راجر باہر گئے ہیں؟"

"نو سر۔" جواب ملا۔

"او۔ کے۔" زاہد نے گہری سانس لے کر ریسیور رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

راجر کی اچانک گمشدگی ایک حیرت انگیز واقعہ تھی۔

زاہد کے چہرے پر فکر مندی کے آثار پھیل گئے وہ مایوس ہو کر راجر کے کمرے سے نکلا اور جاوید کو مطلع کرنے کے لئے اپنے روم کی طرف بڑھا۔

اچانک گیلری میں واقع آخری روم کا دروازہ کھلا اور اس میں سے راجر باہر نکلا اور اطمینان سے آگے بڑھنے لگا۔

زاہد فوراً ہی کمرے کے اندر ہو گیا تھا۔

کمرے کی روشنی گیلری میں پڑ رہی تھی جو راجر کو دور سے بھی دکھائی دے سکتی تھی اور وہ یہ جان سکتا تھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس لئے زاہد نے فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر بتی بجھا دی۔

زاہد اندھیرے میں کھڑا دیکھتا رہا۔ راجر نہایت اطمینان سے چلتا ہوا آیا اور آکر اپنے دروازے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو کر دیکھنے لگا وہ ننگے پاؤں تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

زاہد پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر اس نے ٹیبل لیمپ کا رُخ اونچا اٹھا دیا۔

دوسرے ہی لمحہ راجر کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر پہنچ گیا۔ اور لیٹ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

اسی وقت زاہد نے ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کر دیا۔ راجر بری طرح اچھل پڑا تھا اور اس کا منہ خوف سے کھل گیا تھا۔

"ہیلو دوست! میں ہوں زاہد۔؟"

"اوہ، آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

"پونے تین بجے ہیں۔" زاہد بولا "اور تمہیں سیر سپاٹے سوجھے ہیں۔"

"ہاں بس یوں ہی چلا گیا تھا۔"

"ننگے پاؤں!"

"تو کیا ہوا دوست۔" راجر نے کہا۔

"میں نے تمہیں آخری والے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔" زاہد بولا "وہاں کون ہے۔؟"

"کوئی ایسا شخص نہیں جو آپ کے لئے فائدہ مند ہو۔"

"تمہارا اس سے کیا تعلق ہے۔؟"

"کرنل میں سچ کہہ رہا ہوں وہ آپ کے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔" راجر نے کہا۔

"اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں خود جا کر اس کمرے میں دیکھونگا۔" زاہد نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کرنل سنیئے تو۔"

زاہد رُک گیا اور گھوم کر بولا۔

"سناؤ۔؟"

"کرنل صاحب! عورت میری کمزوری ہے۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔" زاہد بولا "اتنی جلدی تم نے کسی عورت کو بھی تلاش کر لیا۔؟"

"مجھے ایک ویٹر نے بتایا تھا کہ ایک سیکس کی بھوکی عورت اس کمرے میں رہتی ہے۔ میں نے آزمایا۔ بات سو فیصد سچی نکلی۔" راجر شدید لہجے میں بولا۔ "آپ چاہیں تو آپ بھی موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

"شکریہ... مجھے عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" زاہد بولا۔
"اب میں سونے جارہا ہوں۔ تم دروازہ بند کرلو۔"

راجر نے گردن ہلائی تو زاہد کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے راجر نے دروازہ بند کر دیا۔ زاہد ایک لمحے کے لئے گیلری میں کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ اس روم کی طرف بڑھا جس سے اس نے راجر کو نکلتے دیکھا تھا۔

اس کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ زاہد نے چابی کے سوراخ پر آنکھ لگا کر اندر جھانکا تو ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ اندر بستر پر ایک انگریز عورت بے لباس حالت میں لیٹی ہوئی تھی۔

زاہد مطمئن ہو کر لوٹ آیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اتوار کو جاوید نے ایک گاڑی کرائے پر حاصل کر لی۔
یہ ایک ویگن تھی جو جاوید نے لا کر ہوٹل کے پارکنگ شیڈ میں کھڑی کر دی تھی۔

اب وہ رات ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

تقریباً بارہ بجے کرنل زاہد کے ساتھ جاوید اور راجر ہال ہوٹل سے باہر نکلے۔ تینوں خاموشی سے ہوٹل سے نکل آئے۔

"جاوید! ویگن نکال لاؤ۔" زاہد بولا

جاوید پارکنگ شیڈ کی طرف چلا گیا۔ زاہد اور راجر کے ہاتھوں میں ایک ایک سوٹ کیس دبا ہوا تھا جو اندر سے بالکل خالی تھے، ان دونوں سوٹ کیسوں میں چن لیاؤ کے فلیٹ سے ملنے والے روپوں کو سمیٹنے کے لئے انتظام کیا گیا تھا۔

"ایک ہی سوٹ کیس کافی تھا کرنل۔" راجر نے کہا تھا۔

"نہیں! دوسرا بھی کارآمد ثابت ہوگا۔"

"شاید وہ آپ کے اپنے لئے ہے۔"

"راجر! زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔"

راجر خاموش ہو گیا۔

اسی وقت ایک سیاہ رنگ کی چمکدار نئی گاڑی وہاں آکر رکی جسے ایک باوردی ڈرائیور چلا رہا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور گاڑی میں سے روبھر نے باہر قدم رکھا۔ اس کے پیچھے ایک نہایت حسین لڑکی بھی نکلی جو اس کا بازو تھام کر اس کے ساتھ چلنے لگی۔

"یہ کون ہے...؟" راجر نے زاہد سے پوچھا۔ جو روبھر کو تکے جا رہا تھا۔"

"یہ مسٹر روبھر تھے۔ فرانس کے نوادرات کے شوقین کروڑ پتی۔"

زاہد سے پہلے گاڑی کا ڈرائیور بول پڑا۔ "آج واپس فرانس جا رہے ہیں، ان کا اپنا ایک ذاتی جہاز بھی موجود ہے۔"

"وہ یہاں کب سے ہیں...؟" زاہد نے پوچھا۔

"چار پانچ روز ہوگئے ہیں۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

زاہد یہ سن کر حیران رہ گیا۔ حیرت کی بات بھی تھی۔ روبھر اتنے دنوں سے یہاں تھا۔ لیکن زاہد کی اس پر نگاہ نہیں پڑی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"روبھر کس کمرے میں ٹھہرے ہیں؟"

"جناب یہ مجھے نہیں معلوم۔"

اسی وقت جاوید ویگن نکال لایا۔ زاہد اور راجر اس میں سوار ہو گئے۔ جاوید سیدھا چن لیاؤ کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔

جاوید نے تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ویگن چن لیاؤ کے فلیٹ سے ایک فرلانگ پہلے روک دی اور تینوں پیدل ہی چن لیاؤ کے فلیٹ کی طرف چل پڑے۔

اسی وقت پولیس کی گاڑی ان کے قریب سے گزری۔ لیکن وہ لاپرواہی سے آپس میں باتیں کرتے ہوئے چن لیاؤ کے فلیٹ تک پہنچ گئے۔

صرف دوسری منزل پر ایک بلب روشن تھا یا پھر پورچ میں باقی اور کسی حصے میں روشنی نہیں ہو رہی تھی۔

وہ نیگرو کا کمرہ ہے۔" راجر نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت شاید وہ اپنے کمرے میں موجود ہے۔"

تینوں خاموشی سے عمارت کی پشت پر پہنچے۔ پچھلی جانب بھی ایک کمرے میں انہیں روشنی دکھائی دی۔ وہ کمرہ نچلی منزل پر تھا۔ اس لئے اس کی کھڑکی میں سے جھانکنا آسان تھا۔

زاہد نے نہایت احتیاط سے اندر جھانکا وہاں ایک شخص اندر بیٹھا وہسکی پی رہا تھا...؟

"یہ چن لیاؤ کا ڈرائیور ہے۔" راجر نے کہا۔ "گھر خالی ہونے کی وجہ سے شاید آج یہیں ٹھہر گیا ہے۔ اس سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔"

زاہد کھڑکی سے دور ہٹ گیا اور دوبارہ عمارت کا چکر لگایا اب نیگرو باڈی گارڈ کے کمرے کی روشنی بھی بجھ چکی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

زاہد نے نقلی چابی سے پچھلا دروازہ کھول لیا اور اندر داخل ہو گیا۔

اس کے پیچھے سوٹ کیس لئے جاوید اور راجہ تھے۔ زاہد نے سب سے پہلے ڈرائیور کے کمرے میں پہنچ کر اسے چیک کیا۔ وہ نشے میں دُھت ہو کر بے سدھ ہو گیا تھا۔

جاوید نے باہر نکل کر اس کے کمرے کی کنڈی لگا دی۔

پھر زاہد ان دونوں کے ساتھ دوسری منزل پر واقع نیگرو کے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نیگرو اندر بے خبر سو رہا تھا۔ تینوں نے اسے وہیں دبوچ لیا اور فوراً اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر باندھ دیا گیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے ساری عمارت کا چکر لگا کر جائزہ لیا، نیگرو اور ڈرائیور کے علاوہ وہ فلیٹ میں اور کوئی موجود نہیں تھا اور اب انہیں ان دونوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

پھر وہ جن لیاؤ کے بیڈروم کی طرف بڑھے۔

وہ کمرہ مقفل تھا، زاہد نے اسے بھی نقلی چابی سے کھول لیا۔ تینوں اندر داخل ہوئے اور زاہد نے سوئچ آن کر کے کمرے میں روشنی کر دی۔ تینوں کی نگاہیں ایک ساتھ مہاتما بدھ کے اس مجسمے پر پڑی تھیں۔ جو ایک چبوترے پر کھڑا ہوا تھا۔

"راجہ" زاہد کہنے لگا۔ "اگر اس مورتی کا سر اپنے پینچوں پر گھوم کر علیحدہ نہ ہوا تو پھر میں تمہارا سر علیحدہ کر دوں گا۔"

"کرنل: میری معلومات غلط ثابت نہیں ہو سکتیں۔"

"چلو آگے بڑھو۔"

راجہ نہایت اطمینان سے آگے بڑھا اور سوٹ کیس نیچے رکھ کر چبوترے پر چڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے مجسمے کا سر گھمانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن سر ٹس سے مس نہ ہوا۔ راجہ گھبرا کر اپنی پوری طاقت سے اس کا سر گھمانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور اچانک مہاتما بدھ کا سر ایک جانب گھوم گیا۔

زاہد اور جاوید آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے رہے۔ راجہ اب سر کو کئی چکر دے کر کھول رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سر، دھڑ سے علیحدہ ہو گیا۔

راجہ نے اس وزنی سر کو نیچے رکھ دیا اور خود اُچک اُچک کر کھلے دھڑ کے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا پھر وہ خوشی سے چلایا۔

"مال اندر ہے۔"

راجہ نے اس کے سوراخ میں ہاتھ ڈال دیا اور جب باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ڈھیر سارے نوٹ دبے ہوتے تھے۔

پھر وہ ایک اسٹول اٹھا لایا اور اس پر چڑھ کر کھلے مجسمے کے اندر سے نوٹ نکال نکال کر زاہد اور جاوید کو دینے لگا۔

وہ دونوں انہیں سوٹ کیس میں بھرنے لگے۔

چند لمحوں میں ہی ایک سوٹ کیس دنیا بھر کے نوٹوں سے لبالب بھر گیا۔ زاہد نے راجہ سے پوچھا۔

"ابھی اور کتنا روپیہ باقی ہے۔"

"ابھی دو چار بنڈل اور باقی ہیں۔" راجہ نے جواب دیا۔

"کیوں نہ انہیں جن لیاؤ کے لئے چھوڑ دیا جائے۔"

"چھوڑ دو۔" زاہد نے کہا "اب جگہ بھی نہیں ہے۔"

"دوسرا سوٹ کیس جو ہے۔"

"نہیں۔ وہ مجھے اپنے کام کے لئے چاہئے۔"

راجہ اسٹول سے نیچے کود گیا۔ زاہد نے نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس بند کر دیا اور اس کے بعد اس نے مہاتما بدھ کے مجسمے کا سر اٹھا کر دوسرے خالی سوٹ کیس میں رکھ کر بند کر لیا۔

"اچھا! تو یہ تھا آپ کا مشن کرنل۔" راجہ بولا "آپ کو مجسمے کے سر کی ضرورت تھی۔ آخر اس میں کیا بات ہے؟"

"یو شٹ اپ۔" جاوید دھاڑا۔

"آل رائٹ۔" راجہ خاموش ہو گیا۔

جاوید نے مہاتما بدھ کے سر والا سوٹ کیس سنبھالا اور زاہد نے نوٹوں والا۔ اور تینوں چل پڑے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر راجہ اچانک ٹھٹک کر رک گیا، اور کہنے لگا۔

"کرنل: ہم سے زیادہ بیوقوف کون ہو سکتا ہے جو باقی نوٹوں کے بنڈل چھوڑے جا رہا ہے۔ ابھی ہماری جیبوں میں جگہ ہے۔"

"اب چھوڑو بھی راجہ۔"

"نہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" راجہ نے کہا اور واپس گھوم گیا وہاں وہ دوبارہ چبوترے پر چڑھ گیا اور مجسمے کے خول میں سے نوٹوں کے بنڈل نکال کر اپنے کوٹ کی جیبوں میں ٹھونسنے لگا۔

راجہ نے دوبارہ ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت کھلونے جیسا ریوالور آ گیا۔

زاہد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے زاہد نے جاوید کو اشارہ کرتے ہوئے سوٹ کیس نیچے رکھا اپنا ریوالور نکال لیا، جاوید نے بھی بہت پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اور اپنا ریوالور نکال لیا۔

اسی لمحے راجہ نے دو فائر کئے۔

زاہد کے ساتھ جاوید بھی لہرا کر نیچے گرا۔ اسی وقت راجہ چبوترے سے چھلانگ لگا کر باہر کی طرف بھاگا۔

باہر سے کسی گاڑی کے آ کر رکنے کی آواز کے ساتھ کسی عورت نے کہا۔

"تم نے گولی چلنے کی آوازیں سنی تھیں؟"

"تم نشے میں معلوم ہوتی ہو۔" کسی مرد نے جواب دیا۔

"نہیں اندر چل کر دیکھو۔"

راجر نے دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور زاہد کے بے حس و حرکت جسم کے اوپر سے چھلانگ مار کر باہر گیلری میں نکل آیا، اور پھر عمارت کی پشت کی طرف بھاگنے لگا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ عمارت سے باہر تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

راجر کافی دیر تک بھاگتا رہا۔

اس کے مضبوط ہاتھوں میں دونوں سوٹ کیس دبے ہوئے تھے اور اب وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کار کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دونوں سوٹ کیس گاڑی میں پھینکے اور اس پر پڑی ترپال ہٹانے لگا۔ یہ ایک مرسڈیز گاڑی تھی، راجر نے اپنی جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

پھر وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے سمندر کی طرف جانے لگا۔

سمندر کے کنارے کنارے بڑھتے ہوئے وہ ایک اجاڑ اور ویران علاقے میں پہنچ گیا۔ وہاں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ راجر نے گاڑی ایک جگہ روک دی اور باہر نکل آیا۔

کار کی ڈگی کھول کر اس نے اس میں سے دو نمبر پلیٹیں نکالیں اور آگے پیچھے سے لگی ہوئی پہلی والی نمبر پلیٹیں اکھاڑ دیں اور ان کی جگہ نئی پلیٹیں لگا دیں۔ نئے نمبر پلیٹوں کے مطابق اب وہ چینی سفارت خانے کی گاڑی تھی۔

کار کی پرانی نمبر پلیٹوں کو اس نے وہیں ریت میں دبا دیا۔

اس کے بعد راجر نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ وہ بہت بڑی کار تھی۔ اس کی اگلی اور پچھلی نشست کے درمیان کافی جگہ موجود تھی۔ راجر نے انگلیوں سے ٹٹول ٹٹول کر کار کے فرش پر بچھا قالین نما موٹا کپڑا اٹھایا تو اس کے نیچے ایک ربڑ کی تہہ نکل آئی۔ اس نے اسے بھی علیحدہ کر دیا۔

اب کار کا فرش صاف دکھائی دینے لگا تھا۔

راجر نے پیچ کش کی مدد سے وہاں لگے کچھ اسکرو ڈھیلے کر دیئے پھر تھوڑی دیر بعد لوہے کی ایک پوری شیٹ کار کے فرش سے جدا ہو گئی۔ اس کے ہٹتے ہی فرش میں اتنا بڑا سوراخ دکھائی دینے لگا جس میں دونوں سوٹ کیس آسانی سے آسکتے تھے۔

یہ راجر کی مخصوص گاڑی تھی جسے اس نے اپنے ڈھنگ سے بنوایا تھا اور اسے اس نے پہلے سے ہی چن لیاؤ کی کوٹھی کے قریب کھڑا کر دیا تھا۔

دونوں سوٹ کیس سوراخ میں رکھنے کے بعد اس نے دوبارہ پھر سب کچھ برابر کر دیا۔ اب کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کار میں کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔ مطمئن ہو کر وہ پھر گاڑی میں بیٹھا، اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

وہاں سے راجر انٹرنیشنل ٹیلی گراف آفس پہنچا، وہاں سے اس نے نیویارک میں اپنے ڈائریکٹر کو تار بھیجا جس پر صرف ایک لفظ لکھا ہوا تھا۔

"یس۔"

یہ ایک مکمل کوڈ ورڈ جملہ تھا جس کا مطلب تھا کہ چن لیاؤ کے متعلق رقم کی بے ایمانی کے سلسلہ میں جو رپورٹ تھی وہ بالکل صحیح تھی اور وہ سارا مال اس نے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔۔۔ اس کا مشن کامیاب رہا تھا۔

وہ دوبارہ پھر چل پڑا۔۔۔ فتح کی چمک اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی اور ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔ وہ خوش تھا کہ اس نے نہ صرف بازی جیت لی تھی بلکہ کرنل زاہد کو بھی ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دیا تھا۔

اس نے بھاگتے وقت چن لیاؤ کی آواز سنی تھی۔ وہ حیران تھا کہ چن لیاؤ اتنی جلدی دعوت میں سے کیوں آ گیا تھا۔۔۔ اسی گھبراہٹ میں وہ یہ بھی نہیں دیکھ سکا کہ کرنل زاہد اور کیپٹن جاوید فوراً ہی مر گئے تھے یا ان میں کچھ جان باقی تھی؟

وہ سیدھا گیبل گیٹ پہنچا جہاں اس نے گیبل ہوٹل میں اپنے لئے ایک کمرہ لیا۔ اور نہایت اطمینان سے آ کر اس کمرے میں سو گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

دوسرے دن راجر نے اپنے لئے پانی کے جہاز.... "کراؤن پرنس ہیرالڈ" میں ڈنکیل جانے کے لئے سیٹ بک کرائی۔

جس طرح کا مال اس کے پاس تھا اس کی وجہ سے وہ کسی ہوائی جہاز میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے ڈپلومیٹ والی مرسڈیز گاڑی کا انتظام کیا تھا "کراؤن پرنس ہیرالڈ" میں کار سمیت سوار ہوا جا سکتا تھا۔

سترہ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ جرمنی کے ساحل کیل میں پہنچ جانے والا تھا اور وہاں سے وہ آسانی سے اپنے ملک کی طرف روانہ ہو سکتا تھا۔

شام کو وہ ہوٹل سے نکلا اور اپنی کار سمیت "پرنس ہیرالڈ"

نامی جہاز پر سوار ہو گیا۔

راجر کا ڈپلومیٹنگ پاسپورٹ اور کار کا نمبر پلیٹ ہر جگہ اس کے لئے آسانی پیدا کرتے جا رہے تھے۔

اگلے دن دوپہر سے پہلے وہ کیل کے ساحل پر موجود تھا۔

وہاں سے وہ کار میں سڑک کے راستے فرانس کے لئے روانہ ہوا، اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس لئے وہ اطمینان سے سفر کر رہا تھا۔

تین دن راجر کو فرانس پہنچنے میں لگے۔ وہاں اس نے ہوٹل جارج ففتھ تلاش کیا، جہاں اسے معلوم ہوا تھا کہ روہمر رہتا تھا

"مسٹر روہمر ہیں؟" اس نے استقبالیہ کلرک سے پوچھا۔

"نہیں! وہ لندن گئے ہیں۔"

"کب واپس آئیں گے؟"

"یہ معلوم نہیں، آپ کون ہیں؟"

"میرا نام راجر پال ہے۔"

"اوہ راجر۔۔! آپ کے لئے مس فلورنس کا پیغام ہے کہ آپ انہیں کسی بھی وقت روہمر کے کمرے میں مل سکتے ہیں۔"

"او، کے۔۔۔" راجر نے کہا "کیا مجھے روم مل سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد راجر کو ہوٹل میں ایک روم مل گیا۔ وہ باتھ روم میں گھس کر نہانے لگا۔

پندرہ منٹ بعد وہ تیار ہو کر روم سے باہر نکلا اور نہایت اطمینان سے فلورنس سے ملنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

* * * *

زاہد نے کراہ کر کروٹ بدلی۔

راجر کی چلائی ہوئی گولی اس کی بیلٹ کی بکل سے ٹکرائی تھی پھر بلیڈ کی طرح اس کی دائیں طرف کی پسلیوں کا گوشت کاٹتی ہوئی گزر گئی تھی۔

باہر سے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔

زاہد پر بے ہوشی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے بہت مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال رکھا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور اپنی پوری طاقت صرف کر کے اٹھ کھڑا ہوا، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ دوبارہ فرش پر لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گیا۔

باہر قدموں کی چاپ اب گہری ہوتی جا رہی تھی۔

زاہد نے ایک بار پھر ہمت کی اور دانت بھینچ کر کمرے کے دروازے کا سہارا لے کر دوبارہ دھیرے دھیرے اٹھنے لگا اس کا لباس خون سے بھیگ گیا تھا کھڑے ہو کر اس نے گہری گہری سانسیں لیں اور ہمت کر کے ایک ایک قدم بڑھاتا آگے بڑھا۔ اور غور سے جاوید کی طرف دیکھنے لگا۔

جاوید فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور اس کے اردگرد خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ایسا لگتا تھا جیسے جاوید ختم ہو چکا ہو۔۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اسے جاوید کے ہونٹوں کے کناروں پر خون کے بلبلے سے اٹھتے دکھائی دیے۔

اس کا مطلب تھا کہ ابھی وہ زندہ تھا اور سانس کیساتھ اس کے منہ سے خون بھی آ رہا تھا جو بہت خطرناک بات تھی۔

قدموں کی آواز اب بالکل قریب آ گئی تھی۔

زاہد نے نیچے پڑا ہوا اپنا ریوالور اٹھا لیا۔ اس کے سارے جسم میں درد کی ناقابلِ برداشت لہریں اٹھ رہی تھیں۔

اچانک دروازے پر ایک شخص آ کھڑا ہوا۔۔ زاہد نے اپنی بند ہوتی آنکھوں کو کھول کر اسے دیکھا اور پہچان لیا وہ چن لیاؤ تھا۔۔

پھر اس سے پہلے کہ چن لیاؤ کچھ کہتا، زاہد نے اپنے ریوالور کا رخ اس کی جانب کر دیا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

چن لیاؤ پہلے تو زاہد کو کھڑا گھورتا رہا۔ پھر اس کی نظریں پھسلتی ہوئی فرش پر پڑے جاوید پہ جا کر ٹک گئی تھیں۔ پھر بولا۔

"کیا مر گیا۔۔؟"

"نہیں۔۔"

"اور تمہاری حالت بھی اچھی نہیں ہے۔" چن لیاؤ بولا۔

"تم کون ہو اور وہ کون ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔۔" زاہد کے منہ سے بہت مشکل سے نکل پایا۔ تکلیف ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گئی تھی۔

دفعتاً چن لیاؤ کی نظریں کمرے کے اندر مہاتما بدھ کے بے سر کے مجسمے پر پڑیں اور دوسرے ہی لمحہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ایک لمحے کے لئے زاہد کو لگا جیسے وہ ابھی گر پڑے گا۔۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ اچھل کر مجسمے کی طرف بھاگا۔

زاہد نے پاؤں کی ایک زبردست ٹھوکر مار کر دروازہ بند کر دیا۔ خود اس کے ساتھ پیٹھ لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

چن لیاؤ پاگلوں کی طرح اسٹول پر چڑھ کر مجسمے کے اندر اپنے ہاتھ کو ادھر ادھر گھمانے لگا اور دوسرے ہی لمحہ اسے حقیقت کا علم ہو گیا اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے زاہد کی طرف گھوم کر کہا۔

"مم۔۔۔ میری دولت کون لے گیا۔۔؟"

"جو بھی لے گیا ہے میں اسے جانتا ہوں۔" زاہد بولا "وہ کہاں جا سکتا ہے۔ مجھے اس کا بھی علم ہے۔ لیکن ابھی میرے پاس کہانی سنانے کا وقت نہیں ہے۔ پھر کسی موقع پر سب کچھ بتا دوں گا۔"

"تم... تم کیا چاہتے ہو؟"

"ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔" زاہد نے کہا "میں تمہیں تمہاری ساری دولت واپس دلوا دوں گا۔ لیکن تمہیں میرے ساتھی کی جان بچانا ہوگی۔ تم یہاں کسی ایسے ڈاکٹر سے ضرور واقف ہوں گے جو اس حادثے کی اطلاع پولیس تک نہ پہنچاتے اور میرے ساتھی کو بھی بچا لے۔"

"لیکن اس کی حالت بہت خطرناک ہے یہ تو ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی مر جائے گا۔"

"مسٹر چن لیاؤ! اگر میرا ساتھی مر گیا تو پھر ہمارا معاملہ بھی ختم ہو جائے گا، پھر تمہیں زندگی بھر یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ تمہاری دولت کون لے گیا۔ کہاں لے گیا؟"

"میں اپنی دولت کی خاطر سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔" چن لیاؤ نے کہا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد زاہد کہنے لگا۔

"بہت ممکن ہے میرا ساتھی موت سے بچ جائے، جتنی دیر ہو گی۔ اس کی زندگی بچنے کا چانس اتنا ہی کم ہو جائے گا اور اتنا ہی چانس تمہاری دولت ملنے کا بھی ختم ہو جائے گا۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم معاہدے سے پھر نہیں جاؤ گے۔" چن لیاؤ بولا۔

"تمہیں صرف میری زبان پر ہی یقین کرنا پڑے گا دوست۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"کچھ بھی ہو سکتا ہے،" زاہد کہنے لگا "تمہاری دولت تمہیں، واپس دلانے کے علاوہ میں تمہیں ایک راز بھی بتا سکتا ہوں جس سے تم اپنی جان بچا سکتے ہو۔"

"وہ کون سا راز ہے؟" چن لیاؤ نے چونک کر پوچھا۔

"وقت آنے پر بتا دوں گا۔" زاہد نے کہا "اب تم جلدی ڈاکٹر بلانے کے لئے کچھ کرو۔ ورنہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

"آل رائٹ! مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔" چن لیاؤ نے کہا۔ "میں ابھی ایک ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

"اور سنو! کوئی دھوکہ دینے کی کوشش مت کرنا۔" زاہد نے اس سے کہا۔ "اگر تم نے کوئی شرارت کی تو پھر تم بھی نہیں بچ سکو گے۔"

چن لیاؤ نے زاہد کو گھورا پھر کوئی جواب دیئے بغیر فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے جلدی جلدی ڈاکٹر کو ہدایات دیں۔ پھر ریسیور رکھ کر زاہد سے بولا۔

"ڈاکٹر ابھی پہنچ رہا ہے۔"

"او۔کے۔"

چن لیاؤ جاوید کے قریب جا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے بعد کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے اسے ابھی یہاں سے ہٹانا مناسب نہیں ہے زخم خطرناک معلوم ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اور ہاں تمہارے ساتھ میں نے کسی لڑکی کی آواز بھی سنی تھی جسے تم نے ڈارلنگ کہا تھا۔"

"وہ ڈرائنگ روم میں ہے۔"

"لڑکی کون ہے؟" زاہد نے سوال کیا۔

"کوئی نہیں۔"

"تو پھر اسے یہاں سے بھیج دو۔"

"آل رائٹ!"

"اور سنو، تمہارا نیگرو باڈی گارڈ اپنے کمرے میں بندھا پڑا ہے۔ اگر تم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہو تو جا کر اس کو آزاد کر دو۔ لیکن اسے خبردار کر دینا کہ وہ کوئی چال چلنے کی کوشش نہ کرے۔"

"ٹھیک ہے۔" چن لیاؤ نے گردن ہلائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

زاہد کی کمر جواب دیتی جا رہی تھی۔ وہ دو قدم آگے بڑھا۔ لیکن اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا اور نیچے گر کر بے ہوش ہو گیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

زاہد کتنی دیر بے ہوش رہا اسے معلوم نہیں۔ لیکن ہوش میں آتے ہی اس کی نگاہیں سب سے پہلے اس طرف گئیں جہاں جاوید پڑا ہوا تھا۔

"لیکن اب جاوید وہاں نہیں تھا۔؟"

اچانک زاہد نے گڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اسی وقت کسی نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ زاہد نے اپنی آنکھیں گھمائیں۔ چن لیاؤ اس کے سرہانے کھڑا ہوا تھا اور ڈاکٹر دور کھڑا انجکشن تیار کر رہا تھا۔

"وہ... مم... میرا ساتھی کہاں ہے؟" زاہد کے منہ سے نکلا۔

"وہ برابر والے کمرے میں ہے۔" چن لیاؤ بولا "گھبراؤ نہیں اطمینان سے لیٹے رہو۔"

"اب وہ کیسا ہے؟"

چن لیاؤ نے کچھ نہیں کہا اور ڈاکٹر کی طرف دیکھا، ڈاکٹر زاہد کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"میں نے گولی نکال کر زخم کی ڈریسنگ کر دی ہے، اس لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے خون کافی نکل چکا ہے اور وہ کافی کمزور ہو گیا ہے۔ بس یہ رات اس پر بھاری ہے۔ ممکن ہے مجھے اس کا آپریشن بھی کرنا پڑے۔"

زاہد گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری حالت بھی کم خطرناک نہیں۔ مجھے ڈر ہے، کہیں تمہاری پسلی نہ ٹوٹ گئی ہو۔"

"اوہ۔۔!"

ڈاکٹر اس کی ڈریسنگ پہلے ہی کر چکا تھا۔ جاتے ہوئے زاہد سے کہنے لگا۔

"صبح تک تمہارا جسم سخت ہو جائے گا۔ لیکن تم مرو گے نہیں سمجھے۔"

زاہد صرف مسکرا دیا تھا۔

* * * * *

زاہد کافی دیر تک سوتا رہا

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں بالکل تنہا تھا۔ اس کی نگاہیں اچانک کمرے کے گوشے میں رکھے ہوئے دو سوٹ کیسوں پر پڑیں جنہیں دیکھ کر وہ ایک دم چونک پڑا۔ وہ اس کے اور جاوید کے سوٹ کیس تھے۔ جو ان کے ہوٹل سے یہاں آ گئے تھے۔

انہیں منگوانے والا شاید چن لیاؤ ہی تھا۔

زاہد پڑا ہوا اس کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ چن لیاؤ کمرے میں داخل ہوا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"گڈ مارننگ مسٹر زاہد۔"

"اچھا تو تمہیں میرا نام معلوم ہو گیا۔" زاہد نے پوچھا۔

"آج ہی معلوم ہوا ہے۔" چن لیاؤ بتانے لگا "میں نے تمہارے اور تمہارے ساتھی کے خون آلودہ کپڑے تباہ کروا دیئے ہیں تمہارے کپڑوں سے جو چیزیں برآمد ہوئی تھیں۔ تب مجھے تمہارا اور تمہارے ساتھی کا نام معلوم ہوا۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ اب جاوید کی طبیعت کیسی ہے؟" زاہد نے پوچھا۔

"اب خطرے سے باہر ہے۔ زخم دھیرے دھیرے ٹھیک ہو جائے گا۔" چن لیاؤ بتانے لگا۔ "ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اسے کسی نرسنگ ہوم میں داخل ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ یہاں اس کی صحیح طور پر دیکھ بھال نہیں ہو سکتی۔"

"پھر۔" زاہد نے پوچھا۔

"میں ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں جا کر انتظام کر سکتا ہوں، جہاں اس کا علاج بہتر طور پر ہو سکتا ہے۔" چن لیاؤ بولا۔

"وہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟"

"خطرے والی بات ہوتی تو میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دیتا"

"بہت خوب" زاہد دھیرے سے بولا۔ "تم بہت ہی تکلیف اٹھا رہے ہو ہمارے لئے؟"

"اس کی بھی ایک وجہ ہے۔" چن لیاؤ کہنے لگا "مجھے اپنی زندگی بھر کی جمع کی ہوئی دولت کی فکر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی جان کی بھی فکر ہے جس کے بارے میں تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اسے بچا سکتے ہو۔"

"چن لیاؤ! میرا ریوالور تمہارے پاس ہے۔؟"

"میں نے اسے میز کی دراز میں ڈال دیا ہے۔" چن لیاؤ بولا "جاوید کا ریوالور بھی اسی میں ہے۔"

"ٹھیک ہے!"

"مسٹر زاہد! اب تم مجھے وہ کہانی سناؤ جسے سنانے کیلئے کل تمہارے پاس وقت نہیں تھا۔" چن لیاؤ بولا "مجھے بہت زیادہ اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔"

"کیا تم نے راجر پال کا نام سن رکھا ہے؟" زاہد نے سوال کیا۔

"نہیں۔۔ یہ کون ہے؟"

"وہ سی آئی اے کا ایجنٹ ہے اور وہی ساری دولت پر ہاتھ صاف کر گیا ہے۔"

"نہیں۔۔۔؟"

"یہ حقیقت ہے دوست۔" زاہد بولا "ان لوگوں کو تمہاری ساری باتوں کا علم ہے اور تمہاری ناجائز طریقے سے جمع کی ہوئی دولت کا بھی، اب وہ تمہارے آقاؤں کو اس کی رپورٹ بھجوا کر تمہارا پتہ صاف کروا دیں گے۔"

چن لیاؤ کا رنگ دھلے ہوئے کپڑے کی مانند سفید پڑ گیا اور اس کے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔

"نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔"

"چن لیاؤ فکر مت کرو، فی الحال تمہاری زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔" زاہد بولا "تمہیں کوئی بھی غیر ملک میں قتل کر کے اسکینڈل کھڑا کرنا نہیں چاہے گا۔ اگر وہ لوگ یہ چاہتے تو اب

تک تم زندہ نہیں ہوتے ۔"

"اوہ ۔ !"

"میرے خیال تمہیں واپس چین بلا کر تمہارا کورٹ مارشل کر دیا جائے گا۔"

"نہیں ۔"

"اگر تم چاہو تو چین واپس جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"پھر میں کہاں جاؤں گا۔ اب تو دولت بھی میرے پاس نہیں ہے۔"

زاہد نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

"چن لیاؤ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری دولت تمہیں واپس دلاؤں گا مجھے خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ راجہ اوسلو سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔"

"کہاں ۔"

"فرانس ... " زاہد نے اطمینان سے کہا" اب تم میرا ایک کام کرو کہ پیرس تک کی ایک سیٹ بک کروا دو میرے لئے۔"

"کب کے لئے ؟"

"آج ہی کی ... رات کی سیٹ مل جائے تو اچھا ہے۔"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو مسٹر زاہد" چن لیاؤ جلدی سے بولا "تم زخمی ہو اور سفر کرنے کے قابل نہیں ہو۔"

"فکر مت کرو، میں ٹھیک ہوں" زاہد بولا" اگر میں اٹھ کر چل پھر سکوں گا تو سفر کیوں نہیں کر سکوں گا۔"

یہ کہہ کر زاہد نے اٹھ کر چلنے کی کوشش کی، لیکن وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ درد سے اس کا سینہ پھٹنے لگا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے کسی نے اس کے اوپر منوں کا بوجھ لاد دیا ہو۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ چن لیاؤ نے اسے فوراً تھام کر آہستگی سے دوبارہ بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔ "دیکھا، میں نے کہا تھا تم سفر کے قابل نہیں ہو۔"

"خیر آج نہیں، لیکن کل کے لئے میری سیٹ ضرور بک کرا دو۔"

"کیا کل تک تمہارا زخم ٹھیک ہو جائے گا ؟"

"ہونا ہی چاہیئے" زاہد نے کہا۔ اگر میں فوراً ہی یہاں سے روانہ نہیں ہوا تو راجہ ہمیشہ کے لئے تمہاری دولت سمیت غائب ہو جائے گا۔ ڈاکٹر سے کہنا ۔ "مجھے کوئی ایسی دوا دے جس سے چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں ۔"

"میں ڈاکٹر سے کہہ دوں گا۔"

"ہاں ایک بات یاد آ گئی ۔" زاہد اچانک بولا" مجھے بتایا گیا تھا کہ اتوار کی رات تم کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے اور صبح تک واپس آنے والے نہیں، لیکن پھر تم آدھی رات کو کیسے واپس لوٹ آئے تھے ؟"

"بات یہ ہوئی کہ کسی وجہ سے پارٹی کو جلدی ختم کرنا پڑا۔ اس لئے میں واپس آ گیا تھا" چن لیاؤ نے جواب دیا۔" کیا تم تنہا پیرس جا کر راجپال سے میری رقم واپس چھین لو گے ؟"

"ہاں، مع سود کے" زاہد بولا۔

"کیا مطلب ۔ ؟"

"ایک بات اور ۔" چن لیاؤ بولا" مجھے مہاتما بدھ کے مجسمے کا سر کہیں دکھائی نہیں دے رہا وہ کہاں گیا؟"

"اسے بھی راجہ اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ لیکن اب اسی سر کی وجہ سے تمہیں تمہاری دولت واپس ملے گی۔"

"آل رائٹ ۔ ! میں اب کچھ نہیں پوچھوں گا" چن لیاؤ خاموش ہو گیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اگلے دن چن لیاؤ نے زاہد کو آ کر بتایا۔

"جہاز میں کوئی سیٹ نہیں مل رہی ہے۔ اگلے دو روز تک ساری سیٹیں بک ہیں ۔ اب کیا کروں ... مسٹر زاہد آپ ٹرین سے جا سکتے ہیں ۔"

"وہ کیسے ۔ ؟"

"یہاں سے آپ کوپن ہیگن جایئے اور وہاں سے نارتھ ۔ ایکسپریس پکڑ کر سیدھے پیرس پہنچ سکتے ہیں ۔" چن لیاؤ بولا۔

"جی نہیں شکریہ ۔" زاہد نے کہا" میں پلین سے ہی جاؤں گا۔"

"او۔ کے ۔ پھر میں جس دن کی بھی ٹکٹ دستیاب ہوگی خرید لوں گا ۔"

"تھینکس ۔" زاہد خاموش ہو گیا۔

اس کا اندازہ تھا کہ راجہ چار پانچ روز سے پہلے پیرس نہیں پہنچ پائے گا۔ کیوں کہ نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس لے کر وہ ہوائی جہاز میں سفر نہیں کر سکتا تھا، اس لئے وہ خشکی کے راستے یا سمندر کے راستے پیرس پہنچے گا، اور چار پانچ روز سے پہلے نہیں پہنچ سکے گا۔"

زاہد کو صرف ایک فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں راجہ یہ عقلمندی نہ کرے کہ نوٹوں کا سوٹ کیس، کہیں چھپا کر صرف مجسمے کے سر والا سوٹ کیس پیرس لے جائے اور وہاں اپنا کام ختم کر کے دوبارہ اوسلو واپس آ جائے۔

زاہد کی مرضی سے جاوید کو نرسنگ ہوم میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا لیکن خطرے سے

باہر ہو چکا تھا۔

اگلے دو دنوں تک زاہد کی حالت بھی پہلے سے کافی سنبھل گئی تھی، وہ آسانی سے چلنے پھرنے لگا تھا۔

جس دن چن لیاؤ نے پیرس کا ٹکٹ لا کر دیا تو اس نے زاہد کو یہ بھی بتایا کہ پیکنگ سے اس کے نام تار آیا ہے۔

"کیا لکھا ہے ۔؟" زاہد نے پوچھا۔

"فارن سیکرٹری نے مجھے فوراً پیکنگ بلایا ہے" چن لیاؤ بولا" اگلے ہفتہ مجھے منسٹری میں رپورٹ پیش کرنا ہے"

"کوئی وجہ بھی تو لکھی ہوگی ۔؟" زاہد بولا۔

"ہاں! مجھے کسی دوسرے ملک میں سیکنڈ سیکرٹری بنایا جائے گا"

"مبارک ہو، ترقی مل رہی ہے"

"بے شک! مجھے سوٹ کر کے ترقی دی جائے گی ۔" چن لیاؤ زہر خند کرتے ہوئے بولا۔

"چن لیاؤ گھبراؤ نہیں۔ ایک ہفتہ سے قبل ہی تمہاری دولت تمہیں واپس مل جائے گی۔ پھر جہاں تم خود کو محفوظ سمجھو، وہیں چلے جانا"

"مسٹر زاہد! میں اب آپ پر بھروسہ کرنے لگا ہوں"

"شکریہ"

"میں رات کو آپ کو ائیر پورٹ پر چھوڑ آؤں گا مسٹر زاہد" چن لیاؤ نے کہا اور کمرے سے رخصت ہو گیا۔

٭ ٭ ٭ ٭

ٹھیک رات کے نو بجے زاہد کا جہاز پیرس پہنچ گیا۔ ائیر پورٹ سے نکل کر اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور سیدھا جارج ففتھ ہوٹل کے لئے روانہ ہو گیا۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر اس نے روہمر کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ وہ دو تین دن سے ہوٹل میں موجود نہیں ہیں۔ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

زاہد نے گہرا سانس لیا تھا۔

روہمر کے باہر ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ابھی راجہ پال کا کام نہیں ہوا ہوگا۔ پھر اس نے کاؤنٹر کلرک سے راجہ پال کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا کہ اس نام کا کوئی آدمی وہاں نہیں ہے۔

زاہد خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ راجہ پال ابھی پیرس پہنچا ہی نہ ہو۔ بہت ممکن تھا کہ وہ کسی دوسرے نام سے ہوٹل میں مقیم ہو۔

زاہد نے اپنے لئے ہوٹل میں ایک کمرہ بک کرایا۔ یہ کمرہ اس نے ہوٹل کے سامنے والے حصے میں خاص طور پر پسند کیا تھا، ویٹر اسے تیسری منزل کے روم میں چھوڑ کر چلا گیا۔

دوسری صبح زاہد نے راجہ پال کو ایک مرسیڈیز میں آتے دیکھا۔ گاڑی سے اتر کر راجہ ہوٹل کی کافی شاپ میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد راجہ نے کسی کو فون کیا اور اس کے بعد ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ اس نے ایک بار پھر مرسیڈیز سنبھال لی تھی۔

زاہد سوچنے لگا کہ راجہ کیوں آیا تھا اور پھر واپس کیوں چلا گیا۔ لیکن پندرہ منٹ بعد راجہ دوبارہ ہوٹل میں واپس آگیا۔ زاہد نے سکون کا گہرا سانس لیا۔

راجہ اس وقت ہاتھ میں سوٹ کیس لٹکائے وارد ہوا تھا۔ لیکن اب اس کی مرسیڈیز نہیں دکھائی دے رہی تھی زاہد نے اسے کاؤنٹر پر اپنے لئے کمرہ بک کراتے ہوئے دیکھا۔ زاہد نے سوچا کہ شاید وہ گاڑی کہیں چھوڑ آیا ہو۔ زاہد نے سوچتے ہوئے اپنا سگار سلگایا، اور گہرے گہرے کش لگانے لگا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد راجہ پال پھر اسے دکھائی دیا، لیکن اس وقت وہ تنہا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔

زاہد نے اس لڑکی کو فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے اس نے روہمر کے ساتھ دیکھ رکھا تھا۔

دونوں بار میں داخل ہو گئے۔

زاہد تیزی سے باہر نکلا اور ایک ویٹر کو ایک نوٹ کی ٹپ دیتے ہوئے بولا۔

ابھی جو لڑکی اس امریکن کے ساتھ بار میں گئی ہے، وہ کون ہے ۔؟"

" وہ ... وہ مادام فلورنس ہے جناب، مسٹر روہمر کی سیکرٹری" ویٹر نے آنکھ مارتے ہوئے جواب دیا" اس کے علاوہ بھی بہت کچھ"

"مسٹر روہمر ابھی آئے نہیں؟"

"جی ابھی نہیں ۔"

" وہ کون سے کمرے میں رہتے ہیں" زاہد بولا

" ان کا کوئی روم نہیں ہے جناب ۔" ویٹر نے کہا" وہ ہوٹل کے ٹاپ فلور پر واقع سب سے شاندار سوٹ میں رہتے ہیں جس میں شاندار چار کمرے ہیں"

" اوہ! اچھا کیا تم میرا ایک کام کر سکتے ہو" ۔ زاہد بولا۔ "میں روم ۵۳۲ میں ہوں جب روہمر صاحب آئیں تو مجھے مطلع کر دینا"

" بہت اچھا سر ۔"

زاہد آگے بڑھ گیا اور ہوٹل میں ادھر ادھر گھومتا ہوا ٹاپ فلور پر پہنچ گیا جہاں روہمر کا چار کمروں والا سوٹ تھا۔ وہاں اسوقت

کوئی نہیں تھا۔ زاہد نے اِدھر اُدھر دیکھا اور چپکے سے سوٹ میں گھس گیا، اور اس کا خوب اچھی طرح جائزہ لینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔

٭٭٭٭٭

اچانک زاہد کے کمرے پر دستک ہوئی۔

زاہد نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو وہی ویٹر اس کے سامنے کھڑا تھا جسے اس نے ٹپ دی تھی۔

"سر! مسٹر روہمر آ گئے ہیں۔"

"کب سے۔؟"

"ابھی دس منٹ پہلے۔"

زاہد نے اسے ایک نوٹ نکال کر دیا۔ ویٹر سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد زاہد نے گھڑی دیکھی، رات کے نو بجے تھے۔ وہ کمرے سے باہر نکلا اور لفٹ کے ذریعے ٹاپ فلور پر پہنچ گیا۔

زاہد لفٹ سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا سوٹ سی کی طرف بڑھا اور سوٹ سی میں داخل ہو کر اس کی بالکنی میں پہنچا اور ریلنگ پر چڑھ کر برابر والی بالکنی میں کود گیا، ہلکی سی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔

وہ چند لمحوں تک کھڑا آہٹ لیتا رہا پھر دروازہ کھول کر آہستہ سے اندر داخل ہوا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن باتھ روم میں شاور چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے کوئی نہا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شاور کی آواز آنا بند ہو گئی۔ اندر ایک دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ پھر ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ جس کا جواب روہمر کی آواز نے دیا۔ اس کے بعد قدموں کی چاپ اس طرف آنے لگی جہاں زاہد کھڑا ہوا تھا۔

زاہد نے ادھر ادھر دیکھا اور جلدی سے وارڈروب میں گھس گیا اور اس طرح اس کا دروازہ بند کیا کہ ہلکی سی جھری باقی رہی اور وہ باہر کا منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔

فلورنس گنگناتی ہوئی اندر آئی اور فرج سے شراب کی بوتل نکال کر اسی طرح واپس چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد زاہد بھی وارڈروب سے باہر نکل آیا اور بلی کی سی چال سے دروازے تک پہنچا اور جھانک کر دوسرے کمرے میں دیکھنے لگا۔

روہمر اور فلورنس قریب بیٹھے ہوئے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں شراب پی رہے تھے اور دھیرے دھیرے باتیں کرتے ہوئے ہنس رہے تھے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

فلورنس اپنی جگہ سے اُٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ زاہد خاموش کھڑا رہا۔ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ کون آیا ہے؟

"ہیلو... آؤ۔ آؤ۔" روہمر جلدی سے بولا۔

"گڈ نائٹ سر۔" آواز راجر پال کی تھی۔

فلورنس راجر کے لئے پیگ بنانے لگی۔

"کہیئے، ہمارا کام ہوا یا نہیں۔؟" روہمر نے سوال کیا۔

"بالکل۔!"

"مجسمے کا سر لے آئے ہو۔؟"

"جی ہاں وہ میرے پاس ہے۔" راجر پال نے جواب دیا۔

"بہت خوب" روہمر نے قہقہہ لگایا۔ "اور ان دونوں بے وقوف جاسوسوں کا کیا حال ہے؟"

"دونوں جہنم رسید ہو چکے ہیں۔"

"اوہ! بے وقوف کہیں کے۔" روہمر نے کہا "تم ان دونوں کو دھوکہ دینے میں کیسے کامیاب ہو گئے؟"

"وہ سب تمہارے دیئے گئے ریوالور کی وجہ سے کرشمہ ہوا مسٹر روہمر۔" راجر بولا "وہ دونوں مجھے بالکل احمق اور غیر مسلح سمجھتے تھے۔ لیکن میں نے ایسی چال چلی کہ بازی جیت لی" فلورنس کھلکھلا کر ہنسی۔

"مسٹر روہمر!" راجر پال دھیرے سے بولا "آپ نے مجسمے کے بدلے مجھے پانچ لاکھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"بالکل کیا تھا۔ وہ میں تمہیں ضرور دوں گا۔" روہمر نے جواب دیا۔ اور گھوم کر فلورنس سے بولا "فلوری! مسٹر راجر کیلئے پانچ لاکھ لے آؤ۔"

"تیار ہیں جناب۔" فلورنس نے کہا اور اُٹھ کر ایک بریف کیس اٹھا لائی جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اس نے اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

٭٭٭٭٭

اچانک راجر پال نے وہسکی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں روپیہ اس طرح نہیں چاہتا۔؟"

"ہائیں... پھر کیسے چاہتے ہو تم۔؟" حیرت سے روہمر نے پوچھا۔

راجر پال نے نہایت اطمینان سے پیگ ختم کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ رقم امریکن ڈالروں کی شکل میں امریکہ میں ہی ملنی چاہیئے۔"

"یہ انتظام بھی ہو جائے گا" روہمر بولا۔ "لیکن مجسمے کا سر

مجھے کب ملے گا؟"

"وہ میں اسی وقت آپ کو پیش کر سکتا ہوں۔"

"لیکن مسٹر راجر پال بات یہ ہے کہ..."

"نہیں۔ مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے جناب۔" راجر اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے بولا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ساتھ کوئی دھوکہ بازی نہیں کریں گے۔ کیونکہ بغیر سر حاصل کئے آپ کا اتنی بھاری رقم میرے سامنے لا رکھنا آپ کی ایمان داری اور نیک نیتی کا ثبوت ہے۔"

"شکریہ۔"

"میں امریکہ پہنچکر تار بھیجدوں گا تب آپ میری رقم مجھے روانہ کر دیجیئے گا۔"

"آل رائٹ مسٹر راجر۔"

"اچھا میں ابھی مجسمے کا سر لے کر حاضر ہوتا ہوں۔" راجر پال اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

زاہد دروازے کی آڑ میں کھڑا سب کچھ سُن رہا تھا، اس نے پھر اندر جھانکا تو راجر وہاں سے جا چکا تھا۔

زاہد چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اپنا ریوالور نکالا، اور دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

"ہیلو مسٹر روہمر۔؟"

روہمر نے چونک کر آواز کی طرف دیکھا تھا اور زاہد پر نگاہیں پڑتے ہی اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیلتی چلی گئی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے شراب کا گلاس اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے فرش پر گرا اور ٹوٹ گیا۔

فلورنس کا منہ شدید حیرت سے کھل گیا تھا۔

دونوں ظاہر کو گھورے جا رہے تھے جو ریوالور تھامے ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

"تت... تم... تم زندہ ہو..." روہمر کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی "لیکن راجر کہتا تھا کہ تم مر چکے ہو۔"

"میں آسانی سے مرنے والا نہیں دوست۔" زاہد بولا "فلورنس جاؤ جا کر دروازہ بند کر دو۔"

فلورنس نے سوالیہ نظروں سے روہمر کی طرف دیکھا۔؟

"روہمر۔" زاہد غراتے ہوئے بولا "اپنی محبوبہ کو کچھ عقل سکھاؤ، میں کوئی بات دوبارہ نہیں دہراؤں گا۔"

"فلورنس جاؤ جا کر دروازہ بند کر دو۔" روہمر نے لڑکی کو اشارہ کیا۔

فلورنس نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور کھڑی ہو گئی۔

زاہد نے روہمر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اب میں جو کچھ بھی پوچھوں اس کا بالکل صحیح جواب دینا۔ بتاؤ تم راجر پال سے کیسے ٹکرائے تھے؟"

"کوپن ہیگن میں تمہارے ساتھ ملاقات ہونے کے بعد میں نے تمہاری نگرانی کروانی شروع کر دی تھی۔" روہمر کہنے لگا۔ "ان لوگوں نے مجھے رپورٹ دی کہ تم اوسلو میں چن لیاؤ کے پیچھے پڑے ہوئے ہو، میں فوراً سمجھ گیا کہ مہاتما بدھ کا سر چن لیاؤ کے قبضہ میں ہے۔ پھر مجھے رپورٹ ملی کہ ایک پارٹی اور چن لیاؤ کے پیچھے پڑی ہے اور تم دونوں کی آپس میں چل رہی ہے۔ میں نے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا اور اوسلو پہنچ گیا۔ اس وقت راجر تمہارے قبضہ میں پہنچ چکا تھا اور تمہارے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور میں بھی وہیں پر تھا۔

"ساتویں منزل کے آخری والے کمرے میں۔" زاہد نے کہا "بے شک!"

"اور فلورنس بھی تمہارے ساتھ تھی اور میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ فلورنس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔"

"وہ فلورنس ہی تھی۔" روہمر نے جواب دیا۔

"پھر میں نے راجر پال سے مجسمے کے سر کے سلسلے میں بات کی۔" روہمر کہنے لگا۔ "میں نے آدھی رات کو راجر پال کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے تفصیل کے ساتھ بات چیت کی۔ اس نے کہا کہ اگر اسے ریوالور مل جاتے تو وہ تمہیں اور تمہارے ساتھی کو صاف دھوکا دے سکتا ہے۔ میں نے اپنا ریوالور اس کے حوالے کر دیا اور اس کے سامنے وہی آفر دہرا دی جو میں تمہارے سامنے رکھ چکا تھا۔"

"بہت خوب۔ اس کے بعد کیا ہوا۔"

"پھر راجر میرے کمرے سے باہر نکلا تو گیلری میں قدم رکھتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کے کمرے کی بتی جل رہی ہے اور اسے ایک سایہ چھت پر کھڑا دکھائی دیا جو پلک جھپکنے میں غائب ہو گیا۔ راجر فوراً سمجھ گیا کہ اس کے کمرے میں تم یا تمہارا ساتھی ہی ہو سکتا ہے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے یہ بات مجھے بھی بتا دی۔ میں نے ہی اسے اس مسئلہ کا حل بتا دیا کہ اسے تم سے کیا کہنا چاہیئے۔ اس نے عورت والا قصہ بیان کر دیا۔"

واقعی اس وقت مجھے یقین آگیا تھا۔" زاہد بولا "بعد میں جب میں نے تصدیق کے لئے چابی کے سوراخ میں سے جھانکا تو میں بالکل ہی مطمئن ہو گیا تھا۔"

مجھے اس بات کا احساس تھا کہ تم ضرور کمرے میں جھانک کر

معلوم کرنے کی کوشش کرو گے۔ اس نے خود جا کر باتھ روم میں چھپ گیا۔"

"میں سمجھ گیا" زاہد بولا۔ "اب یہ بتاؤ راجر نے مجسمے کا سر کہاں رکھا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم، لیکن وہ اسے لینے گیا ہے۔" روہمر نے جواب دیا۔ "کرنل! اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

زاہد نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

"روہمر؟" کچھ دیر بعد زاہد بولا۔

"ہوں۔"

"کیا تم اتنے ہی احمق ہو کہ راجر یا مجسمے کے سر کے لئے اپنی اور اس لڑکی کی زندگی خطرے میں ڈالو گے؟"

"کیا مطلب۔؟"

"مطلب یہ کہ راجر ابھی مجسمے کا سر لے کر یہاں آ رہا ہے۔" زاہد کہنے لگا۔ "تم دونوں کو اس کے ساتھ اسی طرح پیش آنا ہے، جس طرح اب تک آتے رہے ہو۔ اگر دروازہ کھلنے کے بعد راجر نے کمرے میں قدم رکھنے کی بجائے فرار ہونے کی کوشش کی تو میں فوراً سمجھ جاؤں گا کہ تم دونوں میں سے کسی نے اسے اشارہ کر دیا ہے۔ اور میں پھر انجام کی پروا کئے بغیر تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔"

"او۔کے کرنل! جیسا تم کہو گے، ہم ویسا ہی کریں گے۔"

"شاباش۔"

اسی لمحہ دروازہ پر دستک دی گئی۔ زاہد نے روہمر سے اشارہ کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"جا کر دروازہ کھولو اور اسے اندر آنے دو، روہمر اگر تم نے ذرا سی بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو میں فوراً سب کو ختم کر دوں گا۔"

یہ کہہ زاہد صوفے کے پیچھے چھپ گیا اور روہمر دروازہ کھولنے آگے بڑھا۔ فلورنس کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گئی تھی۔

"مسکراؤ۔" زاہد نے اسے گھورا۔

فلورنس نے زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کر لی۔ اس وقت تک روہمر جا کر دروازہ کھول چکا تھا۔

دروازے پر سوٹ کیس لئے راجر کھڑا تھا۔

"لو، میں مہاتما بدھ کا سر لے آیا ہوں۔" راجر اندر آتے ہوئے بولا۔

"شکریہ۔" روہمر نے سوٹ کیس سنبھال لیا۔ "آؤ، بیٹھو۔"

راجر پال آگے بڑھا۔ وہ اس صوفے کی طرف بڑھا جس کے پیچھے ریوالور لئے زاہد بیٹھا تھا۔

"آؤ ڈیئر راجر پال۔" زاہد فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

راجر سناٹے میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیل کر رہ گئیں۔

"تت... تم...؟"

"ہاں، تمہاری بدقسمتی سے ہم دونوں بچ گئے۔"

"نہیں...!" راجر کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ "میں... میں نے تو..."

"شٹ اپ۔" زاہد نے غرا کر کہا اور پلٹ کر روہمر سے بولا "تم سوٹ کیس ادھر لاؤ۔"

روہمر سوٹ کیس لئے زاہد کے قریب پہنچ گیا۔

"سوٹ کیس کھولو اور بتاؤ سر ہے یا نہیں؟"

روہمر نے سوٹ کیس کھولا مجسمے کا سر موجود تھا۔ زاہد نے کہا۔

"چیک کر کے بتاؤ یہ سر اصلی ہے؟"

روہمر کو خود کام کرنا پڑ رہا تھا اس نے کافی مشقت کے بعد سوٹ کیس میں سے مجسمے کا سر نکال کر میز پر رکھا اور نہایت باریکی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

"کیا رہا...؟"

"سر اصلی ہے کرنل۔" روہمر نے جواب دیا۔

زاہد نے گردن ہلائی اور راجر کی طرف دیکھا جو اپنی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ زاہد بولا۔

"نہیں! اب تمہارا فرار ہونا ناممکن ہے اور ویسے بھی میرا نشانہ کم ہی خطا ہوتا ہے۔"

"نہیں، تم مجھے اس ہوٹل میں نہیں مار سکتے۔ لوگ جمع ہو جائیں گے اور ہو سکتا ہے، پولیس کی گولی سے تمہارا کام تمام ہو جائے۔"

"تم میری فکر مت کرو ڈیئر۔" زاہد بولا "یہ بتاؤ دوسرا سوٹ کیس تم نے کہاں چھپایا ہے؟"

راجر پال نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"مجھے معلوم ہے وہ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہوگا جہاں تم نے مجسمے والا سوٹ کیس رکھا ہوگا۔ وہیں وہ بھی ہوگا؟"

"کرنل، مجھے کچھ نہیں معلوم۔" راجر پال جھلا کر بولا "تمہیں مجسمے کا سر چاہیئے وہ تمہیں مل گیا۔ اسے لے کر بھاگ جاؤ۔"

"لیکن وہ رقم...؟"

"اچھا اس میں سے میں تمہیں نصف دولت دے دوں گا۔ یہ سر بھی لے جاؤ... اب تو خوش...؟"

"اور تمہیں زندہ چھوڑ دوں کیوں۔"

"اگر نہیں چھوڑو گے تو تمہیں دولت والا سوٹ کیس کبھی نہیں مل سکتا۔"

"آل رائٹ۔" زاہد اس کے قریب پہنچ کر بولا "اپنے جوتے اتارو۔"

"کیا۔؟" راجر پال اچھل پڑا تھا۔

"ہاں! جوتے تم اتارو۔"

"ہم ... مگر کیوں ۔"

"دیکھو راجر! مجھے مجبور مت کرو کہ تمہاری ناک توڑ دوں۔"

راجر پال گہرا سانس لے کر اپنے جوتے اتارنے کے لئے نیچے جھکا۔ زاہد کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے ریوالور کے دستے سے اس کی کھوپڑی پر ضرب لگائی۔ وہ بغیر آواز نکالے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

* * *

زاہد کچھ دیر کھڑا راجر پال کو گھورتا رہا۔

پھر وہ جھکا اور اسے گھسیٹتا ہوا باتھ روم میں لے لیا۔ راجر کے منہ سے خون رسنے لگا تھا۔

زاہد نے اس کی تلاشی لی اور چابیاں نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیں۔ اس کے بعد وہ سوٹ سے باہر نکل آیا۔

لفٹ مین، لفٹ میں موجود تھا۔ زاہد نے جیب سے ایک نوٹ لفٹ مین کو دیتے ہوئے پوچھا۔

"تم ابھی کچھ دیر پہلے مسٹر راجر کو کس منزل پر لے گئے تھے؟"

"نیچے بیس مینٹ میں۔"

"وہاں کیا ہے ۔"

"وہاں گیراج ہے جناب ۔" لفٹ مین نے جواب دیا۔

"آل رائٹ: تم مجھے بھی وہیں چھوڑ دو۔" زاہد بولا۔

لفٹ مین نے اسے نیچے پہنچا دیا۔ وہاں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ زاہد نے راجر پال کی مرسیڈیز فوراً ہی تلاش کر لی اور جیب سے چابیاں نکال کر گاڑی کی ڈگی کھولی، ڈگی خالی پڑی تھی۔

اس کے بعد زاہد دروازہ کھول کر کار کے اندر داخل ہو گیا۔ لیکن وہاں بھی اسے کوئی سوٹ کیس نہیں دکھائی دیا۔ لیکن زاہد کو پورا یقین تھا کہ سوٹ کیس گاڑی میں ہی ہونا چاہیئے۔

اچانک زاہد نے کار کو ادھیڑنا شروع کر دیا۔ اس کی تیز نگاہوں نے جلدی ہی اس جگہ کو تلاش کر لیا۔ جہاں راجر نے سوٹ کیس چھپایا تھا۔ زاہد نے سوٹ کیس نکالا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔

سوٹ کیس میں ساری رقم موجود تھی۔ اس نے سوٹ کیس بند کر کے اسے ڈگی میں رکھ دیا اور پھر نہایت اطمینان سے لفٹ کے ذریعے واپس کمرے میں پہنچ گیا۔

باتھ روم میں پہنچ کر زاہد نے پہلے راجر پال کی نبض ٹٹول کر دیکھی، نبض بہت دھیمی چل رہی تھی اور اس کے ہوش میں آنے کی فی الحال کوئی امید نہیں تھی۔

وہ واپس ڈرائنگ روم میں پہنچا اور مجسمے کا سر اٹھا کر سوٹ کیس میں بند کرنے کے بعد اس نے وہ شیشہ بھی اٹھا لیا جس سے روہیرا نے سر کا معائنہ کیا تھا اور اس کے بعد نہایت اطمینان سے وہ باہر نکل آیا۔

وہاں سے وہ سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا اور اپنا سامان سمیٹ کر اس نے کاؤنٹر پر فون کر کے اپنا بل تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور ویٹر کو طلب کیا۔

چند لمحوں بعد ویٹر سامان نیچے پہنچانے کے لئے آ گیا۔ زاہد نے نیچے کاؤنٹر پر آ کر اپنا بل چکایا اور گیراج سے مرسیڈیز نکال کر روانہ ہو گیا۔ اسے سوٹ میں بند فلورنس، روہیرا اور راجر پال کی قطعی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں سے وہ سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا اور نوٹوں والا سوٹ کیس کلاک روم میں جمع کرا دیا اور دوبارہ کار لے کر دوسرے ہوٹل میں پہنچ گیا۔

ہوٹل میں کمرہ لے کر اس نے اطمینان سے سوٹ کیس سے مجسمے کا سر نکالا اور شیشے سے اس کا معائنہ کرنے لگا۔ اسے چار گھنٹے لگ گئے، جب کہیں جا کر اسے خفیہ مائیکرو فلم کا پتہ چلا۔

وہ مائیکرو فلم مجسمے کی دائیں آنکھ میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ چھپائی گئی تھی۔

زاہد نے فلم کو ایک لفافے میں بند کیا اور اسے سیل کرنے کے بعد اپنی جیب میں رکھ کر اسی وقت وہ اپنے ملک کے سفارت خانے پہنچ کر سفیر سے ملا اور مجسمے کا سر اور فلم سونپ کر دونوں چیزیں فوراً جنرل کیو کے پاس بھیجنے کی درخواست کی۔

سفیر نے وعدہ کر لیا۔

وہاں سے زاہد سیدھا اوسلو واپس آیا۔

جاوید کو ہوش آ چکا تھا اور اس کا زخم تیزی سے بھرنے لگا تھا۔ چن لیاؤ نے اسے بتایا کہ وہ ایک ہفتہ کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔ "اوہ شکر ہے ۔"

"میرا مال کہاں ہے کرنل ۔؟" چن لیاؤ نے پوچھا۔

"مال میں نے راجر پال سے واپس لے لیا ہے اور وہ تمہیں ضرور ملے گا۔"

"مگر ہے کہاں۔"

"اپنے ساتھ لانے میں زبردست خطرہ تھا۔ اس لئے اسے جمع کرا آیا ہوں، یہ رہی رسید۔"

"کرنل آپ کا بہت بہت شکریہ۔" چن لیاؤ بولا "اب میں اوسلو کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ [illegible] گا۔"

"آل رائٹ ۔" زاہد مسکرایا۔

اس کے بعد زاہد کی ملاقات جاوید سے ہوئی۔ دونوں گرمجوشی سے ملے۔ زاہد نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"ہمارا مشن کامیاب ہوا جاوید! ۔"

"وہاں کیا ہے۔"

"وہاں گیراج ہے جناب۔" لفٹ مین نے جواب دیا۔

"آل رائٹ۔ تم مجھے بھی وہیں چھوڑ دو۔" زاہد بولا۔

لفٹ مین نے اسے نیچے پہنچا دیا۔ وہاں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ زاہد نے راجر پال کی مرسیڈیز فوراً ہی تلاش کرلی اور جیب سے چابیاں نکال کر گاڑی کی ڈگی کھولی۔ ڈگی خالی پڑی تھی۔

اس کے بعد زاہد دروازہ کھول کر کار کے اندر داخل ہوگیا لیکن وہاں بھی اسے کوئی سوٹ کیس نہیں دکھائی دیا۔ لیکن زاہد کو پورا یقین تھا کہ سوٹ کیس گاڑی میں ہی ہونا چاہیے۔

اچانک زاہد نے کار کو ادھیڑنا شروع کردیا۔ اس کی تیز نگاہوں نے جلدی ہی اس جگہ کو تلاش کرلیا۔ جہاں راجر نے سوٹ کیس چھپایا تھا۔ زاہد نے سوٹ کیس نکالا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ سوٹ کیس میں ساری رقم موجود تھی اس نے سوٹ کیس بند کر کے اسے ڈگی میں رکھ دیا اور پھر نہایت اطمینان سے لفٹ کے ذریعے واپس کمرے میں پہنچ گیا۔

باتھ روم میں پہنچ کر زاہد نے پہلے راجر پال کی نبض ٹٹول کر دیکھی نبض دھیمی چل رہی تھی اور اس کے ہوش میں آنے کی فی الحال کوئی امید نہیں تھی۔

وہ واپس ڈرائنگ روم میں پہنچا مجسمے کا سر اٹھا کر سوٹ کیس میں بند کرنے کے بعد اس نے وہ شیشہ بھی اٹھالیا جس سے روہمر نے سر کا معائنہ کیا تھا اور اس کے بعد نہایت اطمینان سے وہ باہر نکل آیا۔

وہاں سے وہ سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا اور اپنا سامان سمیٹ کر اس نے کاؤنٹر پر فون کر کے اپنا بل تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور ویٹر کو طلب کیا۔ چند لمحوں بعد ویٹر سامان نیچے پہنچانے کے لیے آگیا۔ زاہد نے نیچے کاؤنٹر پر آ کر اپنا بل چکایا اور گیراج سے مرسیڈیز نکال کر روانہ ہوگیا۔ اسے سوٹ میں بند فلورنس، روہمر اور راجر پال کی قطعی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں سے وہ سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا اور نوٹوں والا سوٹ کیس کلاک روم میں جمع کرادیا اور دوبارہ کار لے کر دوسرے ہوٹل میں پہنچ گیا۔

ہوٹل میں کمرہ لے کر اس نے اطمینان سے سوٹ کیس سے مجسمے کا سر نکالا اور شیشے سے اس کا معائنہ کرنے لگا۔ اسے چار گھنٹے لگ گئے جب کہیں جا کر اسے خفیہ مائیکرو فلم کا پتہ چلا۔

وہ مائیکرو فلم مجسمے کی دائیں آنکھ میں نہایت خوب صورتی کے ساتھ چھپائی گئی تھی۔

زاہد نے فلم کو ایک لفافے میں بند کیا اور اسے سیل کرنے کے بعد اپنی جیب میں رکھ کر اسی وقت وہ اپنے ملک کے سفارت خانے پہنچ کر سفیر سے ملا اور اسے مجسمے کا سر اور فلم سونپ کر دونوں چیزیں فوراً جنرل کیو کے پاس بھیجنے کی درخواست کی۔

سفیر نے وعدہ کرلیا۔

وہاں سے زاہد سیدھا اوسلو واپس آیا۔

جاوید کو ہوش آچکا تھا اور اس کا زخم تیزی سے بھرنے لگا تھا۔ چن لیاؤ نے اسے بتایا کہ وہ ایک ہفتہ کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوجائے گا۔ "اوہ شکر ہے۔"

"میرا مال کہاں ہے کرنل؟" چن لیاؤ نے پوچھا۔

"مال میں نے راجر سے واپس لے لیا ہے اور وہ تمہیں ضرور ملے گا۔"

"مگر ہے کہاں۔"

"اپنے ساتھ لانے میں زبردست خطرہ تھا۔ اس لیے اسے جمع کرا آیا ہوں۔ یہ رہی رسید۔"

"کرنل آپ کا بہت بہت شکریہ۔" چن لیاؤ بولا۔ "اب میں اوسلو کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ جاؤں گا۔"

"آل رائٹ۔" زاہد مسکرایا۔

اس کے بعد زاہد کی ملاقات جاوید سے ہوئی۔ دونوں گرمجوشی سے ملے۔ زاہد نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"ہمارا مشن کامیاب ہوا جاوید!"

☆☆

کہتے ہیں جس کو عشق

خواجہ احمد عباس

ترقی پسند مصنفین کی کہانیوں میں عشق ومحبت کا عنصر بہت کم ہوتا ہے۔ جو کہانی پڑھو وہ خون، پسینے، شراب قے اور پیپ سے لت پت نظر آتی ہے۔ ہر طرف آہیں اور کراہیں نہیں تو انقلابی نعرے ضرور سنائی دیتے ہیں اور تو اور کرشن چندر کو بھی "پورے چاند کی رات" میں کسی دلکش رومانی منظر کے بجائے "مہالکشمی کا پل" نظر آتا ہے۔ عصمت چغتائی کا ریشمی "لحاف"، کیڈل کورٹ" کے نیچے بیٹھتے ہوئے موچی کی گندی گڈری میں تبدیل ہوچکا ہے۔

خواجہ احمد عباس پر بھی یہ شکایت عائد ہوتی ہے کہ وہ بھی رومان سے پہلو تہی کرنے کے مجرم ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عاشق معشوق نظر نہیں آتے۔ زیر نظر کہانی میں انہوں نے دو رومان سے بھرپور کردار تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان پر [illegible] کے نام جو شکایت [illegible] ہے کہ ترقی پسند افسانہ نگار محبت کی کہانی نہیں لکھتے

پورے چاند کی رات میں میں نے ان دونوں کی ملاقات کرائی۔ پورے چاند کی رات...... جب چاندنی ہر حساس دل میں سوئی ہوئی محبت کو گدگدا کر بیدار کرتی ہے۔ شباب کے چہرے پر نور کا غازہ ملتی ہے حسن کو خود بیں اور خود آرا اور عشق کو متوالا اور بدہوش بنا دیتی ہے۔ اس وقت ماحول میں شعریت گھلی ہوتی ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں پر چاندنی کی لطیف چادر ڈھک جاتی ہے۔ اور ہر طرف محبت کے نغمے گونجتے سنائی دیتے ہیں۔

اور اس رات کو جب میرے نرمل کی بانسری کی تان فضا میں گونجی اور آشا اس کے جادو بھرے ان دیکھے تاروں سے کھنچی ہوئی اپنے گھر سے باہر نکل آئی تو مجھے ایسا لگا کہ میرے فن کا تخلیقی مقصد پورا ہو چکا ہے۔ اب کہانی دونوں خود لکھیں گے۔ اب آشا نرمل سے پوچھے گی۔ ”مسافر تمہاری بانسری کسے آواز دے رہی ہے؟ اور نرمل جواب دے گا۔ ”تمہیں سندری اور کسے؟“ اور تمہید کے بعد اقرار محبت ہوگا۔ عہد و پیان باندھے جائیں گے۔ ہجر و وصال کے تذکرے چھڑیں گے۔ اور جیسے پورے چاند کی رات ڈھلتی جائے گی ان دونوں کی لازوال محبت جوان ہوتی جائے گی۔

مگر آشا نے کہا۔ ارے او! یہ کیا بے وقت کی راگنی چھیڑی ہے تو نے؟ سونے بھی دے گا یا رات بھر بانسری ہی بجاتا رہے گا؟“

اور نرمل نے جواب دیا۔ ”چل چل بڑی مہارانی آئی کہیں کی۔ دیکھتی نہیں پریکٹس کر رہا ہوں۔“

”پراکٹس؟“ آشا نے انگریزی کا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔ ”وہ کیا بلا ہے۔“

”اری مشق کر رہا ہوں بانسری بجانے کی۔ نہیں تو بینڈ میں کیسے کام ملے گا۔“

بینڈ کا نام سن کر آشا کی دلچسپی جاگ اٹھی۔ ”تم بینڈ بجاتے ہو، سچ مچ؟“

”بینڈ نہیں بجاتا۔ بینڈ میں بانسری بجاتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ پیسے ملتے ہیں۔ سوا روپیہ روز۔“

”ڈھول کیوں نہیں بجاتے؟“

”ڈھول بجانے والے کو دو روپے روز ملتے ہیں اس لیے ڈھول بینڈ ماسٹر کا سالا بجاتا ہے۔“

مجھے غصہ آ رہا تھا کہ چاندنی رات بیکار ڈھلتی جا رہی ہے اور یہ لوگ محبت بھری باتیں کرنے کے بجائے آنے پیسوں کا حساب لگا رہے ہیں۔ میں نے موسیقی کے جادو سے رومانی ماحول پیدا کرنے کے لیے ایک بار بانسری نرمل کے ہونٹوں سے لگا دی اور ایک نئی فلمی دھن فضا میں گونج اٹھی۔

”آشا بولی۔“ مجھے یہ بانسری کی ریں ریں بالکل نہیں بھاتی۔“

”پھر کون سا باجا اچھا لگتا ہے؟ ہارمونیم؟“

”اونہو۔“

”پھر کیا؟ سارنگی؟ ستار؟“

”اوں ہو۔ مجھے تو گراموفون اچھا لگتا ہے جیسا ہمارے برابر کے پڑوسی تھانیدار کے گھر میں ہے۔ جیسا ریکارڈ جی چاہا چڑھا لیا۔“

”یہ نیا تھانیدار کیسا آدمی ہے؟“

”اچھا ہے بے چارہ جب مانگو ہمیں اپنا گراموفون بجانے کو دے دیتا ہے۔ اس کے پاس ریڈیو بھی تو ہے۔“

”پر تھانیدار کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آیا۔ تنخواہ تو سوا سو ہی ملتی ہوگی۔“

”پھر بھگوان اوپر کی آمدنی بھی تو دیتا ہے...... تمہارے بینڈ میں اوپر کی آمدنی نہیں ہوتی؟“

”ہوتی ہے جب کبھی کسی کی شادی میں جاتے ہیں تو کبھی کبھی ہر ایک کو چونی اٹھنی انعام مل جاتی ہے...... تمہاری شادی ہو چکی ہے؟“

آشا نے جواب نہیں دیا۔ شرما کر سر جھکا لیا۔ مگر اس پر چاندنی کا جادو کام کر رہا تھا۔ اور اس کا دل نہ جانے کیوں دھڑک رہا تھا۔

”نہیں ہوئی؟ تو اچھی بات ہے؟“

آشا نے سر اٹھا کر شرارت سے نرمل کی طرف میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

’’کیوں، اچھا کیا ہے۔ اس میں؟‘‘
اور میں نے سوچا ’’اب اچھا موقع ہے نرمل کو اپنی محبت کا اظہار کرنے کا۔‘‘ مگر اس نے جواب دیا۔ اس لیے کہ جب تیری شادی ہوگی اور برات میں ہمارا بینڈ آئے گا تو تیرا دولہا مجھے انعام دے گا۔ اس سے زیادہ اچھی بات کیا ہوسکتی ہے؟‘‘
’’چل ہٹ آشا نے کہا...... اور بھاگ کر اپنے گھر لوٹ آئی۔
جب نرمل نے اپنے دوستوں سے آشا کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا۔ ابے دماغ خراب ہوا ہے۔ اس لونڈیا کے باپ کو بھی دیکھا ہے۔ چاول کے بلیک مارکیٹ میں ہزاروں کما رہا ہے۔ وہ بھلا بینڈ والے سے کیوں شادی آشا کی شادی کرنے لگا؟‘‘
’’پھر ذات پات کا فرق بھی تو ہے...... تم ٹھہرے راجپوت، اور وہ ہے بنیا وہ بھی جینی‘‘
’’اور ہم سے پوچھو تو بڈھا لونڈیا کی بات کب کی پکی کر چکا ہے۔ میں نے تو سنا ہے اگلے مہینے شادی بھی ہونے والی ہے۔‘‘
’’کس کے ساتھ۔‘‘
’’یہ نیا تھانیدار جو آیا ہے۔‘‘
’’پر وہ تو رنڈھا ہے اور بالوں میں خضاب لگاتا ہے۔‘‘
’’اس سے کیا تھانیدار تو ہے۔‘‘
نرمل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بانسری منہ سے لگا کر جیسا بے قرار ہے آئی بہار ہے۔ کی لے بجانے لگا۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہے۔ مجنوں اور ہیر رانجھا کی طرح میری پریم کہانی کا اختتام بھی ٹریجڈی پر ہوگا۔
اور اگلے مہینے جب تھانیدار اپنے بالوں اور مونچھوں میں خوب خضاب لگا کر دولہا بنا اور گھوڑے پر چڑھ کر بارات ساتھ لے کر چلا تو آگے آگے بینڈ چل چل رے نوجوان کی دھن بجا رہا تھا۔ اور نرمل حسب معمول بانسری بجانے میں مشغول تھا اس کے چہرے پر یاس کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور وہ اپنے خیالات میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ ’’چل چل رے نوجوان‘‘ سے بھٹک کر اس کی بانسری سے ’’آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کے رہ گیا کی نے نکلنے لگی۔ جب جھانجن والے نے اسے ٹوکا اور پوچھا۔ ارے نرمل تجھے کیا ہوگیا ہے۔ آج؟‘‘ تو وہ بولا۔ ’’میں بڑا پریشان ہوں یار۔ ماں بیمار ہے اور ڈاکٹر نے نسخہ لکھ دیا ہے مہنگا۔ دوا آتی ہے پونے دو کی اور شام کو ملیگا صرف سوا روپیہ یہی سوچ رہا تھا کہ باقی آٹھ آنے کہاں سے آئیں گے۔‘‘
پر مجھے یقین تھا کہ یہ بات صرف ٹالنے کے لیے نرمل کہہ رہا تھا۔ ورنہ دراصل اس کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ آشا کے بیاہ کی وجہ سے اور جب بینڈ ماسٹر نے دھن بدلی تو میں نے سوچا واہ واہ کیا کلاسیکی ٹریجڈی ہے۔ کہ معشوق کی برات جا رہی ہے اور عاشق اس برات میں جھوم جھوم کے ناچو آج گاؤ خوشی کے گیت کی دھن بانسری بجا رہا ہے۔
پھیروں کے وقت جب آشا سرخ ریشمی ساڑی میں لپٹی۔ زیوروں سے لدی پھندی۔ منڈپ کے بیچ میں آگ کے پاس لا کر بٹھائی گئی۔ تو مجھے یقین تھا کہ وہ نرمل کی ناکام محبت کو یاد کر کے رو رہی ہوگی۔ کون جانتا ہے۔ زہر کھانے والی ہوگی۔ گھونگٹ کی وجہ سے چہرہ تو دکھائی نہ دیتا تھا۔ مگر اس کے مہندی لگے پیروں پر جب چند قطرے گرے تو اس کے سوا کیا سوچا جا سکتا تھا۔ کہ یہ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ہیں۔ جو آنسوؤں کی شکل میں ٹپک رہے ہیں، پر جب اس کی سہیلی نے مذاق کرتے ہوئے گھونگٹ اٹھایا تو وہ دیکھا کہ کپڑوں اور زیوروں کی گرمی کی وجہ سے آشا کو سخت پسینہ آ رہا ہے۔ اور یہ پسینے کے قطرے تھے۔ جو اس کے ماتھے اور گالوں پر سے ٹپک رہے تھے۔ اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنی سہیلی کے کان میں کہا ’’ارے میری یہ انگوٹھی تو دیکھ اصلی ہیرا ہے۔ اصلی۔‘‘
’’عورتیں تو ہمیشہ بے وفا ہوتی ہیں۔ میں نے سوچا۔ آشا کو دیکھو۔ وہاں وہ نرمل اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو سنبھالے خون کے آنسو رو رہا ہے اور یہ کمبخت ادھر ہیرے کی انگوٹھی پا کر پھولی نہیں سما رہی ہے۔ اور یہ نہیں سمجھتی کہ اسے چند سکوں کے عوض ایک بڈھے بدصورت آدمی کے ہاتھ بیچ دیا گیا ہے۔

پر جب باہر جا کر دیکھا کہ وہ دوسرے بینڈ والوں کے ساتھ وہ نرمل بھی اطمینان سے بیٹھا لڈو کھا رہا ہے۔ وہی لڈو جو آشا اور تھانیدار کی شادی میں تقسیم ہو رہے تھے اور جن کی مٹھاس میں نرمل کی محبت کے لیے زہر ہی زہر بھرا ہوا تھا۔ تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی یہی نہیں بلکہ وہ ہنس کر کہہ رہا تھا۔ "یار لڈو اچھے ہیں۔" پھر میں نے سوچا شاید یہ زہر خند ہے۔" دل رو رہا ہے۔ لب مسکرا رہے ہیں۔" اس قسم کا کلاسیکی المیہ منظر مگر اگلے لمحے تھانیدار پھیروں سے فارغ ہو کر اپنی خضاب شدہ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا باہر آیا اور بینڈ والوں کو آٹھ آٹھ آنے تقسیم کرنے لگا۔ جب نرمل کی باری آئی تو مجھے امید تھی کہ وہ ہرگز اپنے رقیب روسیاہ کے ہاتھوں سے یہ بھیک قبول نہ کرے گا ممکن ہے کہ پیسے منہ پر پھینک کر دے مارے۔ ممکن ہے کہ ایک شاعرانہ طنز بھرے جملے کے ساتھ واپس کر دے۔ مثلاً جہاں آپ دنیا کی اتنی بڑی دولت سمیٹے لیے جا رہے ہیں وہاں یہ آٹھ آنے بھی آپ ہی رکھیے۔" مگر مشکل سے ایک سیکنڈ کی خفیف سی ہچکچاہٹ کے بعد نرمل نے تھانیدار کے ہاتھ سے چمکتی ہوئی اٹھنی لے لی اور سلام کرتے ہوئے کہا۔ بھگوان آپ کا سہاگ قائم رکھے۔ تھانیدار صاحب۔" اور جب وہ چلا گیا تو اپنے ایک دوست سے مخاطب ہو کر بولا۔ "چلو بھئی اب ماں کے لیے بازار سے دوا تو آ جائے گی۔"

میں نے جا۔ لعنت ہو ان گھٹیا پریمیوں پر یہ تو رومیو جیولیٹ اور مہیوال کی روایات پر چلنا تو الگ دیو داس اور پاروتی کے نقش قدم پر بھی نہ چل سکے۔" اور اس لمحے میں نے اپنی تخیل کی تلوار سے ان دونوں کو ختم کر دیا۔ اور ایک نئے نرمل اور نئی آشا کو جنم دیا۔

اس بارے میں نرمل اور آشا کو بنگال میں جنم دیا۔ سنہرا بنگال ٹیگور کا وطن تمدن، آرٹ اور ادب کا گہوارہ جہاں شاعری بچوں کو گھٹی میں ملتی ہے جہاں دھان کے سرسبز کھیتوں میں چوڑے چکلے دریاؤں کے کنارے تاڑ کے جھنڈوں میں رومان پلتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ ایک پریم کہانی کے لیے اس سے زیادہ موزوں ماحول بھلا اور کہاں ہو سکتا ہے؟

نرمل اور آشا ایک ہی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ گاؤں کی گلیوں میں ساتھ ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے۔ گاؤں کے دوسرے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ مل کر زمیندار کے باغ میں وہ کچے پکے آم توڑتے پھر کائی اور کنول کے پھولوں سے ڈھکے تالاب میں انہیں دھوتے مزے لے لے کر کھاتے کبھی کبھی نرمل آشا کے ہاتھ سے آدھا چسا ہوا آم چھین کر خود چوسنے لگتا۔ اور پھر اسے آم کی کھٹاس میں بھی ایک عجیب مزا آتا۔ جیسے آشا کی ساری مٹھاس ہونٹوں کے ذریعے آم کے رس میں گھل گئی ہو۔ اور وہ شرارت بھری کن انکھیوں سے آشا کی طرف دیکھ کر کہتا۔ "آشو آم بہت میٹھا ہے۔"

اور آشا جھینپ کر ایک کچی امبی نرمل کی طرف پھینک کر کہتی جاہ۔ وشٹو کو تھا کا" (چل ہٹ شریر کہیں) کا مگر نرمل آشا کی شرمیلی نگاہوں میں محبت کا پیغام پا لیتا۔

بڑی احتیاط سے میں نے اس معصوم محبت کو سینچا پروان چڑھایا جوان کیا۔ اس بار میں نے ان کو ایک ہی ذات کے گھرانوں میں پیدا کیا تھا۔ گوت بھی الگ الگ تھی تا کہ ان کی محبت کو شادی کی منزل تک پہنچنے میں کوئی سماجی رکاوٹیں حائل نہ ہوں آشا کے ماں باپ نرمل کو پسند کرتے تھے اور نرمل کے ماں باپ آشا کو بیاہ کی بات چل رہی تھی کہ......

بارش کی کمی وجہ سے فصلیں جل گئیں۔ رہا سہا اناج چور بازاری سیٹھوں کے گوداموں میں پہنچ گیا۔ کسانوں کے گہنوں پاتے۔ برتن بھانڈے۔ یہاں تک کہ زمینیں بھی مہاجن کے ہاتھوں گروی ہو گئیں۔ جب کھانے کو دھان نہ رہے تو پتوں، گھاس اور جڑوں پر گزارہ کرنے لگے۔ جب ہر قسم کی سبزی سوکھ گئی تو سب نے گاؤں چھوڑ کر شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے سوچا مصیبت میں محبت معراج کمال کو پہنچتی ہے۔ اس آڑے وقت میں نرمل اور آشا کی محبت ہی ان کو سہارا دے گی۔ بھوک میں پیاس میں غریب الوطنی میں وہ جہاں اور جس حال میں ہوں گے محبت کا چراغ ان کی زندگی کو منور رکھے گا۔

مگر جب سے کال پڑا نرمل اور آشا اور ان کے گھر والوں کے میل جول میں وہ پہلی سی بات نہ رہی اول تو دن بھر نرمل بے چارہ اپنے گھر والوں کے لیے گھاس اور پتے اور جنگلی بیر تلاش کرتے نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرتا۔ شام کو جب گھر آتا تو بھوک اور تھکن سے اتنا نڈھال کہ بس لیٹتے ہی سو جاتا۔ مگر نیند بھی ٹھیک طرح نہ آتی۔ بھوکے پیٹ میں آنتوں کا کھچاؤ سونے نہ دیتا۔ پھر بھی کمزوری کے باعث نیم مدہوشی سی طاری رہتی۔ عجیب عجیب خواب نظر آتے۔" خواب پہلے بھی آتے تھے۔ آشا کے خواب مگر اب اس کے سپنوں میں گرم گرم بھات کے پہاڑ نظر آتے۔ دودھ کے دریا اور رس گلوں کے مینار، آشا نظر نہ آتی۔

ان دنوں وہ دونوں اکیلے مل جاتے تو کوئی ڈھنگ کی بات نہ کر پاتے۔

"کہو آشا کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں۔"

"کیا کھاتے ہیں تمہارے والے آج کل؟"

"جو بھی مل جاتا ہے۔"

"سنا تم نے سب شہر جانے کی بات کر رہے ہیں۔"

"ہاں اور کیا ہو سکتا ہے۔"

ایک بار نرمل کی تھکی ہوئی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے ایک پرانی چمک جاگ اٹھی اور اس نے آشا سے کہا۔ "شہر ساتھ ہی چلنا۔ تم تھک جاؤ گی تو میں کمر پر چڑھا لوں گا۔"

اور آشا نے جواب میں وہی پرانا فقرہ دہرایا۔" وشٹو کوتھا کار۔" مگر اس بار ان الفاظ میں کوئی محبت کا پیغام نہیں تھا۔ صرف ایک عجیب تھکی ہوئی بے نیازی سی تھی۔ جیسے اب اسے اتنا سوچنے کی نہ طاقت تھی نہ پروا کہ وہ کب اور کہاں جائے گی اور کس کے ساتھ۔

اور اگلے لمحے نرمل کی تھکی آنکھوں میں بھی وہ پرانی چمک سو گئی اور اس کے پیٹ کی چبھتی ہوئی بھوک پر جاگ اٹھی۔

بھوکا کارواں چل پڑا شہر کی طرف۔

گاؤں چھوڑنے کے تیسرے دن ہی نرمل کی ماں چل بسی۔ باپ بوڑھا اور بیمار تھا۔ دوسرے گاؤں والوں سے پیچھے رہ گیا۔ اور اس کے ساتھ نرمل بھی۔ کئی میل تک نرمل باپ کو پیٹھ پر لاد کر چلا۔ مگر ایک رات کو جب انہوں نے پڑاؤ کیا اور سونے کے لیے لیٹے تو نرمل کے بھوکے پیٹ میں عجیب عجیب ڈراؤنے خیالات اٹھ کر اس کے دماغ میں آنے لگے۔ باپ بیمار ہے۔ اس نے سوچا آج نہیں تو کل ضرور مر جائے گا میں اسے کہاں کہاں لادے پھروں گا۔ اس کی وجہ سے میں قافلے سے بچھڑ گیا تو میری موت بھی یقینی ہے جیسے ہی یہ سو جائے گا میں یہاں سے چل دوں گا۔ قافلے والوں سے جا ملوں گا نہ جانے آشا کس حال میں ہے۔ شاید اسی کے باپ کے پاس دھان کے چند دانے ہوں۔ دھان، بھات، بھوک...... باپ ......دھان...... بھات......"

سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اس کا باپ مرا پڑا ہے۔ آنکھیں آسمان کو تک رہی تھیں پر نرمل کو ایسا لگا جیسے وہ اسے گھور رہی ہوں۔ تعجب اور حیرت اور غصے اور نفرت سے۔ اور وہ وہاں سے چل پڑا۔ جتنا تیز بھی اس کا بھوکا جسم گھسٹ سکتا تھا۔ اور اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ خوف اور کمزوری سے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

قافلے والوں تک پہنچنے میں اسے دو دن لگے۔ اس عرصے میں وہ مجسم بھوک بن کر رہ گیا تھا۔ ساری زمین اس کے تخیل میں ایک عظیم الشان گول روٹی بن گئی تھی۔ کمزوری اب اتنی ہو گئی تھی۔ وہ گھسٹ گھسٹ کر ہی چل سکتا تھا۔ تیسرے دن سامنے سڑک کے اگلے موڑ پر جب قافلہ جاتا نظر آ رہا تھا۔ نرمل نے سڑک کے کنارے ایک نوجوان لڑکی کو مٹی اور ریت میں لت پت پڑے ہوئے دیکھا۔ وہ یہ سوچ کر ٹھہر گیا کہ شاید یہ لڑکی مر چکی ہو یا کم سے کم بے ہوش ہو اور اس کی پھٹی ہوئی ساڑی کے پلوں میں اب تک چند دانے چاول بندھے ہوئے ہوں......

لڑکی شاید مری نہیں تھی۔ کیونکہ کے سپاٹ سینے میں اب بھی کبھی کبھی سانسوں کی ہلکی سی موج اٹھتی تھی۔ اتنی ہلکی جیسے کسی تالاب کی پرسکون سطح پر ہوا کے جھونکے سے ایک خفیف سی لہر پڑ جائے۔ لڑکی کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کی مٹھیاں زور سے بھنچی

ہوئی تھیں۔ جیسے تشنج کا دورہ پڑا ہو۔ نرمل نے جلدی جلدی سے ساڑی کے پلوؤں کا جائزہ لیا کھانے کی کوئی چیز کہیں بندھی ہوئی نہ ملی۔ پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ شاید آس پاس کچھ پڑا ہوا ہو۔ مگر وہاں سوئے سڑک کے کنارے کی دھول کے اور کچھ نہیں تھا۔ مہین ریتیلی دھول جو اس لڑکی کے الجھے ہوئے بالوں میں اٹی ہوئی تھی۔ جس کا غازہ اس کے پیلے سوکھے ہوئے پچکے ہوئے گالوں پر لگا ہوا تھا ''ہنہ مرنے دو اسے۔ اور چلو۔'' نرمل نے سوچا اور اس کے بھوکے پیٹ انتڑیوں نے یاد دلایا کہ اسے فوراً کہیں نہ کہیں کھانے کی کوئی چیز تلاش کرنی چاہیے۔ چاہے وہ کسی درخت کے پتے ہی کیوں نہ ہوں۔ گھاس ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی مرا ہوا پڑا ہی کیوں نہ ہو؟ مگر جاتے جاتے اس نے گھوم کر ایک نظر پھر اس بیہوش لڑکی پنڈلی نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا جیسے اس نے اس لڑکی کو پہلے کہیں دیکھا ہے...... وہ اس کے دماغ کے پردے پر ایک دھندلی سی تصویر کیوں ابھر رہی تھی؟ اتنی دھندلی کہ وہ اسے پہچان نہ سکتا تھا۔ اس کے کانوں میں دور سے کسی مانوس نام کی ہلکی ہلکی گونج کیوں سنائی دے رہی تھی؟ جیسے کسی دوسرے دنیا سے آواز دے رہا ہوں اور یہ اس کے اپنے دل کی دھڑکن کیوں تیز ہو گئی تھی؟ بھوک کی شدت سے اس پر دل کا دورہ پڑ رہا تھا۔ یا اس لڑکی سے اس کا اپنا تعلق تھا؟ یہ لڑکی کون ہے؟ کیا میں نے پہلے اسے کہیں دیکھا ہے؟ کہاں؟ کب؟ دھندلے دھندلے سوالیہ نشان اس کے شعور میں ابھرتے رہے۔ مگر جلد ہی اس کے بھوکے پیٹ کا بنیادی سوالیہ نشان ان سب سوالوں کو سمیٹتا ہوا اس کے شعور پر۔ اس کے دل و دماغ اور روح پر چھا گیا اور اس لمحے سڑک کے کنارے پڑی ہوئی وہ لڑکی اسے اتنی ہی اجنبی اور بیکار اور غیر متعلق لگی۔ جیسی سڑک کے کنارے پڑے ہوئے پتھر یا وہ سوکھے ہوئے پیڑ جن کی شاخوں پر سے ہریالی کی آخری کونپل بھی نوچ لی گئی تھی۔ اپنے بدن کو گھسیٹتا ہوا نرمل پھر چل کھڑا ہوا......

اور میں چلا تارہ گیا۔ ارے نرمل تو کہاں جا رہا ہے ؟ یہ تیری آشا ہے جو سڑک کے کنارے بھوک سے بے ہوش پڑی ہے۔ تیری آشا۔ تیری محبوبہ وہی آشا جس کے ساتھ لے کر تو زمیندار کے باغ سے کچے پکے آم توڑ کر لاتا تھا۔ اور پھر تم دونوں ان آموں کو کنول کے پھولوں سے ڈھکے ہوئے تالاب میں دھوتے تھے اور تو آشا کے ہاتھ آدھا چسا ہوا آم چھین کر خود چوسنے لگتا تھا۔ اور پھر اسی آم کی کھٹاس میں تجھے ایک عجیب مزا آتا تھا۔ جیسے آشا کی ساری مٹھاس ہونٹوں کے ذریعے آم کے رس میں گھل گئی ہو...... کیا تو اسے نہیں پہچانتا؟ کیا تو نے اپنی محبت اپنی جوانی اپنے بچپن سب کو بھلا دیا ہے؟''

مگر نرمل نے جواب نہ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ سیدھا چلتا رہا۔ میرے آواز دینے پر بھی وہ نہ رکا میں چلایا۔ مگر اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ میں نے چیخ کر کہا۔

''میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ ٹھہر جا اپنی محبوبہ کو گود میں اٹھا۔ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں میں اپنے پیار بھرے لبوں سے جان ڈال دے۔ اسے کندھے پر اٹھا کر لے چل اس کے بغیر تیری زندگی بیکار ہے اس لیے کہ وہ تیری محبوبہ ہے۔ تیری جان ہے۔

تیرے دل کی دھڑکن ہے۔ تیرے سپنوں کی رانی ہے...... اگر مرنا ہے تو تم دونوں کو ہم آغوش ہو کر ساتھ ہی مرنا چاہیے۔ تاکہ تمہاری موت بھی امر ہو جائے۔ لیلیٰ مجنوں کی طرح شیریں فرہاد اور سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھا کی طرح......

مگر نرمل نے میری ایک نہ سنی۔ چاولوں کے چند دانوں کے پیچھے وہ اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر اسے بھلا کر چلا گیا۔ میں پھر چلایا اور غصے میں میری آواز کانپ رہی تھی ''نرمل ٹھہر تو میری مخلوق ہے۔ میں تیرا خالق ہوں۔ میں نے تجھے اپنے تخیل سے پیدا کیا ہے۔ تو میرا حکم نہ ٹال سکتا۔''

مگر نرمل نے اپنے خالق کی پکار بھی نہ سنی اور اسے روکنے کے لیے مجھے اس کے پیچھے دوڑنا پڑا۔

جب میں ہانپتا کانپتا اس کے قریب پہنچا تو نرمل

موٹر میں بیٹھتے ہوئے چند سفید پوش آدمیوں سے کھانے کے لیے بھیک مانگ رہا تھا۔
"بابو جی...... ذرا سا بھات دے دو نہیں تو مر جاؤں گا۔"
یہ دیکھ کر غصے اور نفرت اور شرم سے کانپ اٹھا۔ میری مخلوق، اشرف المخلوقات ...... اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے کیا میں نے اس کے ضمیر میں غیرت اور خودداری اور عزت نفس کے بیش بہا، انسانی جوہر نہ رکھے تھے؟ میں نے ڈانٹ کر کہا۔
"نرمل ...... تجھے شرم نہیں آتی۔ چاول کے چند دانوں کے لیے بھیگ مانگ رہا ہے۔ کہاں ہے تیری خودداری؟"
نرمل نے میری طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ مگر اس کی گڑگڑاہٹ میں میرے سوال کا جواب بھی تھا۔
"بابو جی دیا کرو...... پانچ دن کا بھوکا ہوں۔"
اور میں نے ڈانٹ کر کہا۔ بھوکا ہوا تو کیا ہوا۔ ایک بہادر اور خوددار انسان کی طرح جان دے دے، مگر بھیگ مت مانگ۔ بھوک تیری خودداری، تیری عزت نفس اور تیری انسانی عظمت کو نہیں کچل سکتی۔"
اور اس بار اس کی گڑگڑاتی ہوئی آواز میں میرا جواب بھی تھا۔
"بھوک بری بلا ہے، بابو جی۔"
موٹر میں بیٹھے ہوئے سفید پوش آدمیوں نے تھیلے سے ایک سوکھی ہوئی ڈبل روٹی نکالی اور نرمل کو دے دی۔
اور اس کے پاتے ہی نرمل کی بجھی ہوئی آنکھوں میں زندگی آ گئی۔ اس نے روٹی کو کوئی بار چھو کر دبا کر سونگھ کر دیکھا جسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ یہ سچ مچ کھانے کی ڈبل روٹی ہے۔ راستے کا پتھر نہیں ہے جسے اس نے بھوکے کتے کی طرح اس نے دانتوں سے ایک بڑا سا ٹکڑا توڑا اور اسے جلدی جلدی چبا کر دیکھا۔ تب جا کر اسے اطمینان ہوا۔ کہ یہ سچ مچ ڈبل روٹی ہی ہے۔ اور پھر دفعتاً وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اور اسے سجدہ کرتے دیکھ کر موٹر والے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اور میں شرم سے پانی پانی ہو گیا کہ میری مخلوق جسے میں نے خدا سے ٹکر لینے کے لیے تخلیق کیا تھا۔ آج انسان کو سجدہ کر رہی ہے۔
اور پھر موٹر والوں میں سے ایک موٹے چیچک منہ داغ والے آدمی بھینگی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہوئی اور اس نے نرمل کو اشارے سے پاس بلا کر کہا "ایک بات تو بتلاؤ"
نرمل روٹی چباتے ہوئے بولا۔ "جو کہو بابو جی۔ تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تمہاری کیا سیوا کر سکتا ہوں؟"
بھینگی آنکھوں نے نظر ادھر ادھر دوڑائی اور سڑک کو سنسان پا کر نرمل سے پوچھا۔ کوئی کام کی لڑکی دیکھی ہے آس پاس؟ ذرا جوان سی۔"
اور اس سے پہلے کہ میں اسے چلا کر ہوشیار کر سکوں نرمل کا جواب اس کی زبان سے نکل چکا تھا۔ ہاں بابو جی ایک دیکھی تو ہے پیچھے کوئی میل بھر پرے سڑک کے کنارے پڑی ہے بے ہوش پر جلدی کرو کہیں مر نہ جائے۔"
اور پلک جھپکتے وہ موٹر گرداڑاتی ہوئی غائب ہوئی۔
اب تو میں غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ "اے ذلیل انسان۔ مجھے شرم آتی ہے کہ تو میرے تخیل کی تخلیق کی ہے۔ جانتا ہے یہ لوگ کون ہیں؟ اور کیوں جوان لڑکیوں کی تلاش میں پھر رہے ہیں؟ جانتا ہے تو نے کیا کیا ہے؟ ایک سوکھی ہوئی ڈبل روٹی کے بدلے تو نے آشا کی لاج بیچ دی ہے۔ تو نے اپنی عزت آبرو اور انسانیت بیچ دی ہے۔"
مگر نرمل سوکھی ہوئی روٹی کو چبانے میں اتنا مصروف تھا کہ اس نے میری باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔ ہاں میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ جیسے جیسے روٹی اس کے چپکے ہوئے پیٹ میں جا رہی تھی۔ اور جیسے جیسے اس کی سکڑی ہوئی سوئی ہوئی سوکھی ہوئی انتڑیاں پھر سے جاگ رہی تھیں نرمل کی آنکھوں میں سے وہ غیر انسانی وحشت دور ہوتی جا رہی تھی۔
اس کا احساس جاگتا جا رہا تھا۔ اور اس کے تحت الشعور سے یادیں، اس طرح سر اٹھا رہی تھیں۔ جیسے کوئی حسینہ انگڑائی لے کر کسمساتی ہوئی اٹھتی ہے جیسے

اس کی آشا......

آشا!

آشا!

اوہ بھگوان! آشا!

روٹی کے آخری لقمے کے ساتھ ایک بھیانک خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا۔

"نہیں نہیں!" اس کے دل نے آواز دی "ایسا نہیں ہوسکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا! کبھی نہیں!...... کبھی نہیں......"

وہ مڑ کر پیچھے بھاگنے ہی والا تھا کہ ادھر سے وہی موٹر لوٹتی ہوئی نظر آئی۔ چار سفید پوش آدمی اور ان کے ساتھ ایک خاک آلود چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی جوان لڑکی۔

آشا! آشا!" وہ چلایا جب موٹر اس کے پاس سے گزری اور وہ اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ "کیا ہے؟" ایک سفید پوش نے اس سے پوچھا۔ جب وہ ہانپتا ہوا موٹر کے پاس پہنچا اور ایک لمحہ کے لیے نرمل کوئی جوب نہ دے سکا۔

لڑکی کو ہوش آچکا تھا۔ وہ ایک سوکھی ہوئی ڈبل روٹی کا ٹکڑا آہستہ آہستہ چبا رہی تھی۔ اس کی توجہ تمام تر روٹی پر تھی۔ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی اس بھیک منگے کی طرف نہ دیکھا۔ جو پاگلوں کی طرح "آشا، آشا" چلاتا ہوا موٹر کے پیچھے دوڑتا آیا تھا اور وہ یہ دیکھتی بھی کیوں؟ اس کا نام آشا تھوڑا ہی تھا۔ اس کا نام تھا کیا؟ اس کا کوئی نام تھا بھی؟ اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اور نہ اسے کوئی پروا تھی۔ اس وقت روٹی کے سوا دنیا کی کوئی چیز اہمیت نہ رکھتی تھی۔

"آشا۔ بالآخر نرمل چلایا۔" موٹر سے نیچے اتر آؤ یہ برے لوگ ہیں تمہیں بیچ ڈالیں گے۔ آؤ آشا! میرے ساتھ آؤ۔ ہم دونوں اکٹھے چلیں گے۔"

لڑکی نے ایک پل کے لیے نرمل کی طرف دیکھا۔ مگر اس کی وحشت بھری بجھی ہوئی آنکھوں میں پہچان کی کوئی چمک پیدا نہ ہوئی۔ پھر وہ اپنے برابر سفید پوش کی طرف مڑی اور اس سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"تم مجھے نہیں پہچانتی، آشا تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ نرمل ہوں۔ نرمل یاد نہیں۔ ہم دونوں ایک ہی گاؤں میں پیدا ہوئے؟ یاد نہیں ہم ساتھ ہی کھیلا کرتے تھے؟ یاد نہیں اہم اکٹھے ہی زمیندار کے باغ میں آم توڑ کر لایا کرتے تھے۔ اور انہیں تالاب میں دھو کر چوستے تھے اور جب میں تمہارے ہاتھ سے آدھا چوسا ہوا آم چھین کر خود چوسنے لگتا......؟

لڑکی نے کہا۔ ایک عجیب مری ہوئی آواز میں جیسے اس کی آواز نہ ہو۔ "جارے...... جارے...... آمی کی جانوں؟" اور موٹر دھول اڑاتی ہوئی غائب ہوگئی۔

پلک جھپکتے میں میرے تخیل نے ان دونوں کو فنا کردیا۔ "بھلا یہ بھی کوئی عشق ہوا؟"

میں نے سوچا "اس بار نرمل اور آشا کو ایسے ماحول میں پیدا کروں۔ جہاں وہ عشق کی روایات کو پوری طرح نبھا سکیں۔"

میں نے فیصلہ کرلیا کہ چونکہ بھوک محبت کی قاتل ہے۔ اور بے زر عشق "ٹیں ٹیں" ہوتا ہے۔ اس لیے اس بار نرمل اور آشا کو ایسے گھرانوں میں پیدا کیا جائے جہاں ان کی محبت کو افلاس اور قحط کا شکار نہ ہونا پڑے۔ بلکہ ان کی محبت کو پروان چڑھنے کے لیے ہر قسم کی آسانی اور آسائش مہیا ہو۔ یہاں تک کہ وہ ہر قسم کی اقتصادی ضروریات اور مشکلات سے بے نیاز ہو کر محبت اور صرف محبت پر اپنی تمام توجہ صرف کرسکیں۔

میں نے آشا کو ایک لکھ پتی سیٹھ کے ہاں پیدا کیا اور نرمل کو دوسرے لکھ پتی کے ہاں۔ نرمل کو آکسفورڈ یونیورسٹی، پیرس کے ناچ گھروں اور نیویارک کے نائٹ کلبوں میں تعلیم دلائی۔ آشا کو نینی تال کے ایک انگریزی اسکول، ٹیگور کے شانتی نکیتن اور بمبئی کے تاج محل ہوٹل کے بال روم میں اپنی تعلیم اور شخصیت کی تکمیل کرنے کا موقع دیا۔ پھر آشا کو "اعلیٰ تعلیم" کی غرض سے فرانس، سوئیزرلینڈ اور انگلستان کی سیر کرنے کو بھیجا۔ اور واپسی سفر میں ان دونوں کی ملاقات ایئر انڈیا انٹرنیشنل کے ایک ہوائی جہاز میں کرائی۔

لندن سے جب ہوائی جہاز روانہ ہوا تو ایک خوب صورت لڑکی کو اکیلا بیٹھے دیکھ کر مسکرایا اور دوسری سیٹ خالی نہ ہونے کا بہانہ کرتے ہوئے اپنے بہترین اکسفورڈ نیم امریکی لہجے میں آشا سے کہا۔ ”اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ کے برابر والی سیٹ پر میں بیٹھ جاؤں۔

آشا نے ایک نظر نرمل کے پاس پونڈ والے بڑھیا سوٹ پر ڈالی اور کہا ”ہاں، ہاں کیوں نہیں بڑے شوق سے۔“

”میرا نام نرمل کمار کارا بھائی۔“ نرمل نے لیپ، اسٹریپ (Lapstap) باندھتے ہوئے کہا۔

”اور میرا نام آشا آلو والا ہے۔“

”ہاؤ ڈیو ڈو مس آلو والا۔“ پلیز ڈ ٹو میٹ یو۔“

”شیک ہینڈ کرتے ہوئے آشا کی نازک نرم اور سرخ پالش کیے ہوئے ناخن والی انگلیوں نے نرمل کے ہاتھ میں ضرورت سے قدرے زیادہ گرمجوشی اور بے تکلفی محسوس کی مگر سوسائٹی میں ایسی باتوں کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔ ایسے ہی مسئلوں پر تعلیم حاصل کرنے تو وہ ولایت آئی تھی۔

”تو آپ، کارا بھائی کاٹن ملز والے کارا بھائی ہیں۔“

”جی ہاں یا یوں سمجھ لیجیے کہ میں ان کا چھوٹا بیٹا ہوں۔ اور آپ تو یقیناً سیٹھ آلو والا کی پتری ہیں۔“

”تو کیا آپ پتا جی کو جانتے ہیں؟“

”لیجیے ایسا بھی کوئی ہے جو ہندوستان کے Potatoking کے نام سے واقف نہیں ہے۔“

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ ہوائی جہاز نے لندن کی ایئرپورٹ کو ہی نہیں English Channai کو بھی کافی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اور اب فرانس کے سرسبز میدان نیچے نظر آرہے تھے۔ پھر نرمل نے کہا آپ انڈیا ہاؤس کی پارٹی میں شاید نہیں آئیں۔

ورنہ پہلے ہی ملاقات ہوجاتی۔

”جی میں اس وقت سوئیزرلینڈ میں تھی۔“

”کہاں؟ جنیوا؟“

”جی نہیں۔ انٹرلاکن۔“

”بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔ میں تو سال میں کم از کم دو ہفتے انٹرلاکن میں ضرور گزارتا ہوں۔“

”اس سال تو آپ نہیں آئے؟“

”جی ہاں۔ اس کا افسوس ہے۔ بات یہ ہے کہ میں امریکہ گیا تھا۔ صرف تین ہفتے کے لیے مگر وہاں دو ہفتے ٹھہرنا پڑا......“

”جنیوا اور روم کے درمیان جب ان کا ہوا جہاز اطالوی کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ نرمل نے کہا۔ ”سردی بہت ہوگئی ہے آپ یہ کمبل ٹانگوں پر ڈال لیجیے۔“

”آپ کو بھی تو سردی لگ رہی ہوگی۔ آپ بھی لیجیے۔“

”نرم کمبل کے نیچے ان کے گھٹنے ایک دوسرے کو اتفاقیہ چھو گئے اور پھر الگ نہ ہوئے۔

”اگر آپ کی آنکھوں کو یہ لائٹ بری لگ رہی ہو تو بجھا دوں؟“

”ہوائی جہاز کے کیبن میں ایک لطیف اندھیرا چھا گیا اور دور نیچے برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں چاندنی رات میں سیلانی بادلوں سے آنکھ مچولی کرتی رہیں۔

نہ جانے کیسے آشا کا نرم و نازک ہاتھ نرمل کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔

”یہ کون سی خوشبو ہے جو آپ نے بالوں میں لگائی ہے؟“ نرمل نے آشا کے کان میں کہا۔

”میں نے نہ آج بالوں میں تیل لگایا ہے اور نہ کوئی سینٹ ہی استعمال کیا ہے۔“

”دجبھی خوشبو اتنی مست کرنے والی ہے۔“

”تو آپ بن پ یے بھی مست ہوجاتے ہیں۔“

”ہاں بھگوان بھلا کرے مرار جی ڈیسائی کا، اس شراب بندی کے زمانہ میں کم سے کم عشق کے نشہ پر ابھی پابندی نہیں لگی۔

"آپ بہت شریر ہیں۔"
"نہیں یقین مانیے میں بہت شریف ہوں۔ مگر کیا کروں آپ بہت خوب صورت ہیں۔"
جب ہوائی جہاز روم پہنچا اور کیبن میں روشنی کی گئی۔ تو دوسرے مسافروں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ آشا لپ اسٹک دوبارہ لگا کر اپنا میک اپ درست کر رہی ہے۔
مسافر اتر کر کافی پینے ریستوران میں گئے تو معلوم ہوا کہ موسم خراب ہونے کی وجہ سے جہاز آگے نہیں جائے گا۔ رات انہیں روم کے کسی ہوٹل میں گزارنی پڑے گی۔
نرمل پہلے بھی کئی بار اس ہوٹل میں ٹھہر چکا تھا۔ منیجر اسے پہچانتا آنکھ کا صرف ایک ہے اشارہ کافی ثابت ہوا اور نرمل آشا کو برابر برابر کے کمرے مل گئے۔ جن کے درمیان دروازے کی چٹخنی صرف نرمل کی طرف تھی۔ ابھی آشا نے رات کے کپڑے بدلے ہی تھے کہ دروازہ کھلا اور شاپین کے دو گلاس لیے نرمل داخل ہوا۔
"ہیلو ڈارلنگ" صرف دس گھنٹے میں مس آلو والا آشا اور آشا سے ڈارلنگ!
"ہیلو"
"میں نے سوچا سونے سے پہلے ایک آخری جام ہو جائے۔ کل تو بمبئی جا کر پھر سمندر کا پانی ہی پینا ہے۔"
"مگر بس ایک جام۔ میں زیادہ نہیں پیتی۔"
"تمہارا جام صحت۔"
"اور یہ تمہارا"
"اور یہ محبت کی اس یادگار رات کے نام۔"
اور اگلی رات کو بمبئی پہنچتے پہنچتے وہ دونوں عشق کی تمام منزلیں طے کر چکے تھے جنہیں قدیم صدیوں کے عاشق ومعشوق برسوں میں طے نہ کر پاتے تھے۔
"ایئرپورٹ پر جب وہ اپنی اپنی موٹروں میں بیٹھنے لگے تو نرمل نے کہا۔" چیریو آشا جلد ملیں گے۔"
اور آشا نے کہا۔ ضرور ضرور چیریو نرمل، فون کرنا۔"
"موٹریں روانہ ہو گئیں اور میں نے سوچا یہ ہے سچا عشق۔ نہ بک بک نہ جھک جھک بس عشق، اب یہ دونوں روز ایک دوسرے سے تاج میں گرین میں، چاندنی رات میں جوہو کے ساحل پر ملیں گے۔ عشق ومحبت کی باتیں کریں گے۔ ان کے درمیان نہ کوئی سماج دیواریں کھڑی کر سکے گی اور نہ ہی مفلسی اور بھوک ان کو جدا کر سکے گی۔ ان کی محبت آزاد ہے۔ اور اس لیے اٹل امر ہے یہ پریم کہانی ضرور کامیاب اختتام پر پہنچ کر رہے گی۔
مگر آشا گھر پہنچی تو اس کا استقبال کرنے کے لیے پتا جی، ماتا جی اور بھائی بہنوں کے علاوہ ادھیڑ عمر اور گنجے سر کے سیٹھ لال چند کمال چند بھی تھے جو Potatoking کے پارٹنر تھے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے آشا سے ہاتھ ملایا۔ اور اس کے ہاتھ کے دباؤ میں بھی آشا کو کسی قدر اسی بے تکلفی کا اندازہ محسوس ہوا جو نرمل کے شیک ہینڈ میں تھا مگر لال چند کمال چند کے ہاتھ عمر بھر روپے گنتے گنتے سخت اور کھردرے ہو گئے تھے۔ اور ان کی چبھنے والی ہڈیوں کے دباؤ میں جوانی کا شارہ نہیں تھا۔ بڑھاپے کی التجا تھی۔
اگلے روز آشا نرمل کے ٹیلیفون کا انتظار کر رہی تھی کہ اس کے باپ نے ایکسچینج جاتے جاتے اس سے کہا۔ کہ شام کو اس کی خیریت سے واپسی کی خوشی میں لال چند کمال چند نے تاج میں سب گھر والوں کو دعوت دی ہے۔ وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے۔ آشا! اور عمر بھی کوئی خاص زیادہ نہیں ہے میرے خیال میں تمہیں اس کی تجویز پر غور کرنا چاہیے۔"
آشا باپ کے سامنے خاموش رہی۔ مگر اس نے سوچا "ہنہ! کھوسٹ کہیں کا کہیں شکل تو دیکھو۔ کہاں وہ اور کہاں نرمل؟"
رات کو تاج میں ڈنر کے بعد وہ صرف اپنے باپ کو خوش کرنے کے لیے لال چند کمال چند کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے سخت کوفت محسوس کر رہی تھی۔ نرمل کو آتے دیکھ کر اس کا چہرہ ایک دم کھل گیا۔

''معاف کیجیے گا۔ ایک دوست سے مل لوں۔''
کہہ کر وہ ڈانس ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے پارٹنر کے بازوؤں سے آزاد ہو کر ناچنے والوں کی بھیڑ سے راستہ چیرتے ہوئے نکل گئی۔
مگر......مگر......یہ نرمل کے ساتھ کون تھی؟
''اوہ! ہیلو آشا، ان سے ملو۔''
ایک ادھیڑ عمر کی عوت جو پینٹ، پاؤڈر، لپ اسٹک کسی ہوئی چولی اور رنگے ہوئے بالوں کی مدد سے جوان نظر آنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور جو نرمل کی کمر میں اتنی بے تکلفی اور مالکانہ انداز سے ہاتھ ڈالے ہوئے تھی کہ ایک بھیانک شبہ آشا کے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گیا۔
فی فی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کہا۔
''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مسز کارا بھائی'' فی فی یہ سن کر ہنس پڑی۔ بدتمیزی سے کھلکھلا کر کتنے بدنما دانت تھے۔ اس کے
''اپنی دوست کی غلطی تو دیکھو ڈارلنگ'' اس نے نرمل سے کہا۔ ڈارلنگ! اس کی زبان سے یہ لفظ سن کر آشا جل ہی تو گئی۔
''آشا! تمہیں بھول ہوئی۔ یہ فی فی ہیں۔ مسز فتا کا۔ میری بیوی نہیں۔''
آشا نے فی فی فتا کا کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ مگر اس سے پہلے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کی شادی جوانی میں ایک ادھیڑ عمر کے امیر آدمی سے ہوگئی تھی۔ اس کا شوہر اب بھی زندہ تھا۔ اور بیوی کے سارے اخراجات اٹھاتا تھا مگر کئی برس سے ان کا ازدواجی رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ دونوں الگ الگ بنگلوں میں رہتے تھے۔ سیٹھ فتا کا عمر کے آخری دن کوکین کھا کھا کر گزار رہا تھا اور فی فی اپنی کھوئی ہوئی جوانی کی تلاش میں سوسائٹی کے مختلف نوجوانوں کا پیچھا کرتی رہتی تھی ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر اب کوئی شک باقی نہ رہا۔ کہ نرمل فی فی کا تازہ ترین ''مفقوح ہے'' اس لمحے میں آشا کی نہ جانے کتنی آشائیں اور امنگیں چکنا چور ہوگئیں اور عمر میں وہ پہلی بار وہ جل کر بڑی بدتمیزی سے بولی۔ ''معاف کیجیے مسٹر کارا بھائی۔ مگر میں انہیں آپ کی بیوی نہیں آپ کی ماتا سمجھی تھی۔
اور اس سے پہلے کہ فی فی اس جملے کا جواب دے سکے آشا وہاں سے اپنی میز پر واپس چلی آئی۔ آرکسٹر نے ایک اور ناچ کی دھن شروع کر دی تھی۔ او مائی ڈارلنگ!! اوہ مائی ڈارلنگ! فی فی اور نرمل ایک دوسرے کی باہوں میں جھولتے ہوئے ناچ رہے تھے نرمل کے انداز میں کسی قدر بیزاری تھی۔ مگر فی فی اس سے چپٹی ہوئی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اس سے نرمل کو چھین کر لے جائے گا۔
''نرمل کارا بھائی کو تم جانتی ہو'' آشا کے باپ نے پوچھا۔
''جی ہاں، ہوائی جہاز میں ملاقات ہوئی تھی۔ بہت دلچسپ آدمی ہے۔ باتیں خوب کرتا ہے۔''
''ہاں اب تو باتیں ہی بنا سکتا ہے؟ لال چند نے لقمہ دیا۔
''جی کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔''
تب اس کے باپ نے بتلایا کہ سیٹھ کارا بھائی نے اپنے چھوٹے بیٹے کو اس کی فضول خرچیوں اور عیاشیوں کی وجہ سے عاق کر رکھا ہے۔'' باپ کے مرنے پر بھی اس کو پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔''
''نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آشا بولی۔'' وہ رہتا تو بڑی شان سے ہے۔ ہر سال ولایت جاتا ہے۔ یہ بڑھیا کپڑے، موٹر یہ سب کہاں سے آتا ہے؟''
''کہاں سے آتا ہے؟'' لال چند کمال چند نے اپنے زرد دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے یہ الفاظ دہرائے اور پھر غیر ضروری حد تک جھک جھک کر آشا کے کان میں کہا'' بہت سے ذریعے ہیں۔ برج، فلاش، پوکر اور فی فی فتا کا۔'' اور یہ کہہ اس نے اپنے گنجے سر کا اشارہ ہال کے اس کونے کی طرف کیا جہاں نرمل فی فی کو رمیا کی چک بھریاں دے رہا تھا۔ اور آرکسٹرا کے ساتھ آواز ملا کر گا بھی رہا تھا۔ او مائی ڈارلنگ! او مائی ڈارلنگ
آشا نے لال چند کمال چند سے کہا۔'' میرا جی

متلا رہا ہے۔ شاید گرمی بہت ہے چلیے باہر سمندر کی ٹھنڈی میں کچھ دیر ٹہل لیں۔

چند دن میں ان کی Engagement کا اعلان ہوگیا۔ بڑی شاندار پارٹی ہوئی۔ لال چند کمال چند نے پچیس ہزار کی ہیروں جڑی انگوٹھی اپنی منگیتر کو تحفے میں دی نرمل بھی پارٹی میں آیا اور ایک منٹ کے لیے آشا کو اکیلا پا کر کہنے لگا۔ مبارک ہو آشا۔'' اور اس کے کان میں آہستہ سے ''جب بھی ضرورت ہو مجھے نہ بھولنا۔''

چھ ماہ بعد شادی بھی ہوگئی۔ مگر شادی کی دعوت میں نرمل نہ آیا۔ کیونکہ وہ پھر ولایت کی سیر کو گیا ہوا تھا۔ لال چند کمال چند نے بھی ہنی مون کے لیے سوئیزرلینڈ جانا طے کیا جن میں قاہرہ مصر سے روم روم سے کئی نئے مسافر ہوائی جہاز میں چڑھے مگر جب آشا اور اس کا شوہر ریستوران سے واپس ہوئے تو اور سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تھے آشا نے دیکھا کہ اگلی سیٹ جو اب تک خالی تھی ایک جوڑا آ کر بیٹھا ہے ایک مرد اور ایک لڑکی۔ مگر پیچھے سے شکلیں نظر نہ آتی تھیں۔

ایک بار پھر اطالوی ALPS کے اوپر سے ہوئی جہاز گزر رہا تھا۔ نیچے برفیلی چوٹیاں ستاروں کی مدہم روشنی میں دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ آشا نے سوچا۔ آج چاند نہیں نکلے گا۔ دل کے ساتھ میری زندگی کی روشنی بھی غائب ہوگئی۔ پیارا نرمل! لاپروا ظالم نرمل! حسن چہرے اور مضبوط بانہوں والا نرمل۔ آج نہ جانے وہ کہاں ہوگا؟ نہ جانے کس حال میں ہوگا؟ میری شادی کی خبر سے دل برداشتہ ہو کر ہی ہندوستان سے چلا آیا ہو وہ ضرور انٹرلاکن گیا ہوگا اور وہاں کی برفیلی پہاڑیوں میں مجھے بھلانے کی کوشش کر رہا ہوگا کاش اس وقت برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہوتا۔ اور......''

اگلی سیٹ سے ایک لڑکی کی آواز آئی۔ آپ بہت شریر ہیں۔''

اور پھر ایک جانی بوجھی آواز ''نہیں یقین جانیے میں بہت شریف ہوں مگر کیا کروں آپ بہت خوب صورت ہیں۔''

تیسری بار پھر مجھے اپنی مخلوق کو فنا کرنا پڑا۔ لعنت ہو ان عاشقوں اور معشوقوں پر ایک لمحہ آپ کی نظر چوکی اور وہ لگے عشق کی شاہراہ کو چھوڑ کر زندگی کی ٹیڑھی ٹیڑھی پگڈنڈیوں پر بھٹکنے۔ یا شاید عشق کو نہ بہت مفلسی راس آتی ہے اور نہ بہت امیری، بس یار میں نے نرمل اور آشا کو متوسط طبقے میں پیدا کیا۔ نرمل کو ایک دفتر میں ڈیڑھ سو کا کلرک کرا دیا۔ آشا کو صرف میٹرک تک تعلیم دلوائی۔

اس بار نرمل اور آشا بمبئی کی ایک چال میں دوسرے مالے پر رہتے تھے شام کو جب نرمل دفتر سے تھکا ہارا لوٹتا تو دور سے ہی بالکنی میں آشا کو کھڑے دیکھ کر اس کے من کی کلی کھل جاتی۔ اب اس نے شام کو سنیما جانا بھی کم کر دیا تھا۔ کہ پردے پر فلمی ستاروں کی پرچھائیں دیکھنے سے آشا کو اصلی رنگ اور روپ میں دیکھنا کہیں بہتر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آشا بھی اسے پسند کرتی ہے۔ ورنہ بلاناغہ ہر شام کو اس کے دفتر سے آنے کے وقت اپنے کمرے کے سامنے کیوں کھڑی رہتی ہے؟ نرمل اگر اپنے کمرے میں کھڑے ہو کر دیوار سے کہے کہ آج تو گھر میں شکر ہی نہیں چائے کیسے پی جائے تو آشا فوراً اپنے باپ سے کہتی'' ادا نرمل راؤ کے شکر نہیں ہے۔ ایک پیالی چائے بھجوا دوں؟'' اور اس کا باپ جو نرمل کو بہت پسند کرتا تھا۔ فوراً کہتا ہاں ہاں ضرور منجو سے کہو ایک پیالی چائے دے آئے۔ اور جب چھوٹی بہن پیالی لے کر چلتی تو آشا خواہ مخواہ چلا کر کہتی اری منجو سنبھال کر اٹھو تو پیالی ضرور گرا کر توڑے گی۔ ٹھہر مجھے دو۔'' اور پھر وہ خود پیالی لے کر جاتی۔ اور ہر بار پہلا گھونٹ پی کر نرمل کسی فلم میں سنا ہوا فقرہ ضرور دہراتا'' چائے بہت میٹھی ہے۔ آشا لگتا ہے تم نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔''

اور آشا وہاں سے جھینپ کر چلی آتی۔ اور بہن کو چلا کر کہتی نرمل راؤ چائے پی لیں تو پیالی لے آئیو۔

کہیں چائے کے ساتھ ہماری پیالی بھی ہضم کرجائیں۔"

میٹرک کا امتحان نزدیک آیا تو ایک دن اس کے باپ نے نرمل سے ذکر کیا کہ آشا تاریخ جغرافیہ میں ذرا کمزور ہے اور موقع پاکر نرمل نے کہا۔" تاریخ جغرافیہ تو بڑے ہی آسان مضمون ہیں ان ہی مضامین میں تو بی اے کیا تھا۔" اب تو آشا کے باپ کو کہنا پڑا۔ اگر تمہیں بہت تکلیف نہ ہو تو شام کو اسے گھنٹہ بھر پڑھادیا کرو۔"

اور اس دن سے تو ان دونوں کو روزانہ ملنے اور بات کرنے کا ایک باقاعدہ بہانہ مل گیا۔ شروع شروع میں تو سبق کے دوران میں آشا کی ماں یا اس کے باپ کی موجودگی ضروری تھی۔ مگر جلد ہی ہندوستان کی معدنی پیداوار اور پانی پت کی تین لڑائیوں کے ذکر سے ان دونوں کا جی اکتا گیا اور اس کے علاوہ نرمل کا رویہ اور رکھ رکھاؤ اتنا شریفانہ تھا کہ سبق کے دوران میں کسی تیسرے کی موجودگی غیر ضروری سمجھی گئی اور اس کے بعد یہ قدرتی امر تھا کہ شاہجہاں اور ممتاز محل کی تاریخی رومان میں ان دونوں کو ذاتی اور غیر تاریخی دلچسپی پیدا ہونے لگے۔ اور آب وہوا کا ذکر کرتے کرتے بات دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی نئی فلم پہنچ جائے۔ اور باتوں باتوں میں استاد شاگرد سے یہ بھی کہہ جائے کہ اس کی آنکھیں نرگس کی آنکھوں سے بھی زیادہ خوب صورت ہیں۔

پھر ایک دن ہمت کر کے نرمل بالوں میں لگانے کی موتیا کے پھولوں کی دینی لے آیا" پانچ روپے کا نوٹس بھنانا تھا۔" پھول والے کہا۔ بابو جی دو چار آنے کا ہار گجرا لو چھٹا دیے دیتا ہوں۔ سو میں نے سوچا تمہارے لیے ایک دینی ہی لے چلوں تمہارے جوڑے میں لگتی بھی بہت خوب صورت ہے۔" آشا نے پھولوں کی قوس کو اپنے گالوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کتنی اچھی خوشبو ہے۔ ان پھولوں میں رات بھر یہ مہکتے رہیں گے۔" نرمل نے بغیر کوئی فلمی مکالمہ سوچے فی البدیہ کہا۔" اور تمہیں میری یاد دلاتے رہیں گے۔" اور اس دن سے نرمل کو ہر روز ہی پانچ روپے کا نوٹ بھنانا اور چار آنے کی دینی خریدنا ضروری ہوگیا۔

جس دن آشا کے امتحان کا نتیجہ نکلا آشا کے باپ نے اکیلے میں نرمل سے کہا" تمہاری مہربانی سے ہماری آشا پاس تو ہوگئی ہے اور وہ بھی سیکنڈ کلاس میں اب تو اس کے بیاہ کی فکر ہے۔ سوچتا ہوں کہ کوئی اچھا سا بر مل جائے تو......" اور پھر کس قدر ہچکچاتے ہوئے" تم اپنی سناؤ نرمل، شادی بیاہ کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟ اور جب نرمل سوچ میں پڑ گیا تب" تم تو جانتے ہو کہ آشا کی ماں اور میں دونوں تمہیں کتنا پسند کرتے ہیں......"

نرمل نے کہا" میں اس اتوار کو گھر جارہا ہوں۔ پتا جی سے پوچھ کر سوموار کو آپ کو جواب دوں گا۔" اور میں نے سوچا چلو اس بار تو نرمل اور آشا کے عشق کی بیل چڑھتی نظر آتی ہے۔

نرمل اتوار کو اپنے گاؤں گیا۔ تو اپنے باپ سے ذکر کیا جو پچاس روپے ماہوار پر اسکول میں پڑھاتا تھا۔ یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ اور پھر بولا۔" اچھی بات ہے۔ میں دو دن کی چھٹی لے کر شہر آؤں گا اور لڑکی کے باپ سے بات چیت کروں گا۔"

نرمل بمبئی واپس آیا کہ اس نے دیکھا کہ آشا نے ہونے والے رشتے کی وجہ سے اس کے سامنے آنا اور بات کرنا بند کردیا ہے۔ شاید اس کی ماں نے منع کردیا ہو مگر اس دوری اور علیحدگی میں بھی کتنی میٹھی رومان انگیز چاشنی تھی۔ کبھی کبھار چال کے برآمدے میں دفعتاً اس کی مڈھیر ہو بھی جاتی تو آشا کے گال لاج کے مارے تمتما اٹھتے اور وہ الٹے پیروں بھاگ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیتی اور پھر جھری سے نرمل کو جھانکتی اور نرمل؟ وہ تو اپنے باپ کے آنے اور شادی کے طے ہونے اور پھر شادی ہونے کے دن گن رہا تھا۔ کتنا لطیف تھا یہ منظر۔

نرمل کا باپ آیا اور آشا کے گھر والوں نے بڑے

تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ رسمی بات چیت کے بعد نرمل کے باپ نے بیٹے کو وہاں سے اٹھ جانے کا اشارہ کردیا اور دونوں باپوں میں تخلیے میں گفتگو ہونے لگی۔

نرمل کے باپ نے دریافت کیا کہ آشا کا باپ داماد کو جہیز میں کتنا روپیہ دینے کو تیار ہے۔ آشا کے باپ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ جہیز میں تو ہم سوائے ، دو چار کپڑوں اور چھوٹے موٹے زیوروں کے کچھ بھی نہ دے سکیں گے پھر اس نے اپنی مالی مشکلات کا ذکر کیا۔ چھوٹی سی دکان وہ بھی کساد بازاری کے زمانے میں اس پر کنٹرول کی مشکلات، مشکل سے اتنے بڑے خاندان کا گزارہ ہوتا ہے۔

نرمل کے باپ نے کہا۔ ''تب تو مجھے افسوس ہے یہ رشتہ نہ ہو سکے گا۔ میری بھی اپنی کچھ ایسی ہی مجبوریاں ہیں۔''

''آشا جو کواڑوں کے پیچھے چھپی ہوئی یہ سب سن رہی تھی دھک سے رہ گئی اب کیا ہوگا؟ مگر نہیں اس کا نرمل ضرور اپنی محبت کو نبھائے گا۔ اپنے باپ کی طرح ہرگز وہ روپے کا لالچ نہیں کرے گا۔

اور رات کو جب باپ بیٹے اکیلے ہوئے اور نرمل کو اپنے باپ کے فیصلہ کا علم ہوا تو اس نے بیشک اپنی محبت نبھائی۔ اس نے باپ سے صاف صاف کہہ دیا۔ ''اب جہیز ایسے پرانے ڈھکوسلوں کو چھوڑ دیجیے اور روپوں کے لالچ میں دو زندگیوں کو تباہ نہ کیجیے۔ کیا آپ نے سانتا رام کا فلم ''جہیز'' نہیں دیکھی۔''

اس کے باپ نے جواب دیا۔ ''فلم دیکھنے کے لیے میرے پاس اتنے فالتو پیسے کہاں ہیں؟'' اور پھر اس نے بیٹے کو وہ راز کی بات بتائی جو آج تک اس سے چھپائی تھی۔ اس نے ساہوکار سے دو ہزار قرض لے رکھا تھا۔ جو بیاج ملا کر آج تین ہزار کے لگ بھگ ہو گیا۔ اور اس کی ادائیگی کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ نرمل کا بیاہ کسی ایسی جگہ کیا جائے جہاں سے جہیز میں معقول رقم ملنے کی امید ہو۔ ''تم بی اے ہو اچھی نوکری پر ہو۔ تین ہزار تو ملنا ہی چاہیے۔''

''مگر پتا جی اتنا روپیہ آپ نے قرض لیا تھ
کس لیے؟''

اور باپ کو کہنا پڑا۔ تمہاری پڑھائی کے لیے نرمل
اور کس لیے اور تم بی اے کس طرح کر پاتے؟ یہ سن کر
نرمل کے عشق کی آگ بھی ٹھنڈی پڑ گئی اور اسے کہنا پڑ
پتا جی شما کریں۔ مگر مجھے یہ سب کچھ معلوم نہ تھا۔

اگلے مہینے نرمل کی شادی اس کے گاؤں کے سنا
کی موٹی ان پڑھ بیٹی سے ہو گئی نہ نرمل نے زہر کھایا ن
آشا نے۔ جہیز میں صرف ڈیڑھ ہزار کی رقم ملی ج
ساہوکار کو دے دی گئی۔ مگر باقی رقم اور بیاج ملا کر د
ہزار کی رقم اب بھی بقایا ہے۔ آشا کی شادی ایک
غریب میٹرک پاس لڑکے سے ہو گئی جو ڈاکخانے میں
پوسٹ مین ہے۔ اور جگہ نہ ملنے کی وجہ سے فی الحال
آشا کے باپ کے پاس ہی گھر داماد بن کر رہتا ہے۔
نرمل نے لاکھ کوشش کی کہ کسی دوسری چال میں کھول
مل جائے۔ مگر آخر میں وہ اپنی بیوی کو اس چال میں
لانے پر مجبور ہوا۔ آشا اور نرمل کو بیوی دونوں میں کاف
دوستی ہو گئی ہے اور جب کام پر چلتے جاتے ہیں د
دونوں بیٹھی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ اور اپنے ہونے
والے بچوں کے لیے ننھے ننھے کپڑے سیتی رہتی ہیں۔

اور اس قطعی غیر رومانی منظر کو دیکھ کر مجھے ایک
بار اپنی مخلوق کو اپنے تخیل کی تلوار سے قتل کرنا پڑا۔

آخری بار آشا اور نرمل کو تخلیق کرنے کے بعد
میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا چاہے عشق
کریں یا نہ کریں۔ پھر میں انہیں بالکل بھول گیا۔ او
اپنی کہانیوں کے لیے دوسرے کردار تخلیق کرنے میں
مصروف ہو گیا۔

اور پھر برسوں بعد میں نے ایک بوڑھے مرد او
بوڑھی عورت کو بازار میں جاتے دیکھا مرد کے چہرے پ
جھریاں تھیں۔ اور اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ عورت
کے سفید بالوں میں چند مہندی لگی ہوئی تھی اور اس
کے ہاتھ چکی چلاتے چلاتے اور مسالا پیسنے سے سخت
اور کھردرے تھے۔ وہ دونوں بازار سے راشن او
ترکاری خرید کر گھر جا رہے تھے۔ ان کی شکلیں کا

بدل چکی تھیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو کبھی ان کو نہ پہچان سکتا مگر میں اپنی مخلوق کو کیسے بھول سکتا ہوں بوڑھے نرمل کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں راشن کے گیہوں اور چاول اور ترکاریاں بھری ہوئی تھیں۔ تھوڑی دور جا کر آشا نے کہا۔ دور جا کر آشا نے کہا۔ "لاؤ مجھے دے دو۔ تم تھک گئے ہو گے یہ کہہ کر اس نے تھیلا نرمل کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور جب ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف۔ تو ان کی آنکھوں میں محبت کی وہی چمک تھی جو تخلیق کرتے وقت میں نے ان دونوں کو عطا کی تھی۔

تو بڑھاپے تک بھی ان کی محبت مدھم نہیں ہوئی تھی؟ یہ تھا ایک سچی پریم کہانی کا معیاری انجام مگر پوری کہانی کیا تھی؟ وہ دونوں کیسے ملے؟ اور کیسے ان کی محبت پروان چڑھی تھی؟ اور کن کن مشکلات اور مصائب سے ان کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ان کے عشق کو کتنے امتحان دینے پڑے تھے۔

یہ سب معلوم کرنے کے لیے میں ان کا پیچھا کرتا ہوا گلویں گلیوں ہوتا ایک چھوٹے سے مکان پر پہنچا۔ جیسے ہی نرمل اور آشا داخل ہوئے۔ درجنوں بچوں نے چیں چیں، پیں پیں بہت دیر تک میرے کنڈی کھٹکھٹانے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

جب بچوں کا شور کسی قدم کم ہوا تب جا کر بڑھیا نے کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سنی ارے او گوپال، موہن۔ للو کوئی دیکھو دروازے پر کون ہے؟"

بچوں کے جلوس میں مجھے اس ٹوٹے ہوئے منڈھے تک لیجایا گیا جس پر بیٹھا بوڑھا نرمل کھانس رہا تھا۔ اپنی بوڑھی چندھی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے اس نے کہا۔

"بیٹھو بھائی، بیٹھو، چائے پیو گے؟"

اور بوڑھی آشا شوہر کے سامنے حقہ رکھتے ہوئے بولی ہاں ہاں کیوں نہ پئیں گے یہ بابو لوگ تو دن میں دس دس بارہ بارہ پیالیاں چائے پی جاتے ہیں۔"

"میں آپ دونوں سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں"

میں نے کہا۔

"ہاں، ہاں بھائی شوق سے پوچھو۔"

"آپ دونوں کی شادی کو کتنے برس ہوئے؟"

اپنی جھریوں کے باوجود آشا شرما گئی، جب بوڑھے نے اس کی طرف مڑ کر کہا۔ "کیوں لاجو کی اماں کتنے برس ہوئے ہیں مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کل ہی کی بات ہے۔"

"ہائے تمہیں لاج نہیں آتی، دس تو پوتے پوتیاں ہیں تمہارے۔"

پھر بوڑھے نے کہا۔ کوئی چالیس برس ہوں گے۔ بابو جی۔ مگر تمہیں ہماری شادی کی تاریخ کی کیونکر فکر پڑی؟"

میں کہنا چاہتا تھا کہ تمہارا خالق ہوں اس لیے۔ مگر پھر میں نے کہا اتنا ہی "میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ اس لیے آپ کی زندگی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔"

"کھوں! کھوں! کھوں! حقہ گڑگڑاتا، کھانستا اور ہنستا ہوا بوڑھا بولا۔" ہماری بھی کوئی زندگی ہے بابو جی پیدا ہوئے، جوان ہوئے۔ محنت مزدوری کی بچے پیدا کیے۔ اب بچوں کے بھی بچے ہو گئے بس مرنا رہ گیا ہے۔"

"نہیں، نہیں، میں یہ باتیں نہیں آپ کی محبت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" آپ اپنی بیوی سے پہلی بار کیسے ملے؟ کیسے آپ کا عشق ہوا؟"

بڑھیا نے تو شرم کے مارے اوڑھنی سر پر سرکالی اور بوڑھا غصے کے مارے مونڈھا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "محبت...... عشق......" وہ کھانستا ہو اچلایا اور یہ کیا مسخری ہے ہمارا مذاق اڑانے آیا ہے جانتا نہیں یہاں شریف آدمی رہتے ہیں یہ کہہ کر وہ غصے سے مارنے ہی والا تھا۔ کہ میں وہاں سے بھاگا اور اب تک بھاگتا ہی چلا آ رہا ہوں...... اس لیے سانس پھولا ہے۔ آپ ہی بتائیے عشقیہ کہانی لکھوں تو کیسے؟

☆☆

اپنا گھر

ش صغیر ادیب

آج کا انسان کتنا مصروف ہے اس کا اندازہ آپ میں سے ہر ایک لگا سکتا ہے ایک گھرانے کی کہانی جہاں کسی کو بھی یہ دیکھنے کی فرصت نہ تھی کہ ان کے گھر میں کون کون...... کیا کیا کررہا ہے۔ اس گھرانے کی کہانی بھی معاشرے میں موجود ہر گھر کی کہانی کہی جاسکتی ہے......؟

مضبوط مکان میں کمزور پڑتے رشتوں کی کہانی

جب کار روانہ ہوئی تو سہ پہر شروع ہو رہی تھی۔ موسم خلاف توقع بہت اچھا تھا۔ آسمان صاف تھا۔ سارے میں چمکتی دمکتی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور فضا خاصی گرم تھی۔ رام گاڑی چلا رہا تھا، سیتا اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی، جبکہ مکتا دیوی، شیام اور گیتا پچھلی سیٹ پر براجمان تھیں۔ گیتا تین سال کی تھی جبکہ شیام کا چھٹا سال شروع ہونے والا تھا۔ وہ دونوں عادت کے مطابق لڑنے جھگڑنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ وجہ وہی تھی، جس پر وہ دونوں اکثر جھگڑتے تھے یعنی سپر مین اور بیٹ مین میں سے کون زیادہ طاقت ور ہے۔ گیتا، بیٹ مین کی فین تھی جبکہ شیام کا ہیرو سپر مین تھا۔

گیتا پرجوش لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''بیٹ مین، سپر مین کو مار سکتا ہے۔''

''نو چانس۔'' شیام نے بھی اسی جوش اور یقین سے کہا۔ ''سپر مین بہت اسٹرانگ ہے، وہ بیٹ مین کو کل کرسکتا ہے۔''

مکتا دیوی افسردگی سے مسکرائیں۔ جانے آج کل کے بچے قتل، خون اور ہتھیاروں کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ شیام کے پاس جو کھلونے ہیں، ان میں بندوقیں، پستول اور ٹینک وغیرہ شامل ہیں۔ یہی حال گیتا کا ہے۔ پولیس کار، رائفل اور بیٹ مین اور نہ جانے کیا کیا۔ دونوں بھی کسی لان میں باقاعدہ جنگ کا کھیل کھیلتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گھر بناتے ہیں، پھر گنوں اور رائفلوں سے ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں۔ ڈز...... ڈز...... ڈز...... پھر کھیل میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے مرنے کا سوانگ بھی رچاتے ہیں۔

''میری گولی تمہیں لگ گئی ہے، تم مرجاؤ۔''

''اچھا......'' گیتا کہتی ہے۔ ''مگر اگلی بار تم مرنا۔''

''ٹھیک ہے۔''

گیتا آنکھیں بند کر کے گھاس پر اوندھی لیٹ کر مرجاتی ہے۔

یہ موت اور ہتھیار اور گھروں پر حملہ۔ یہ سب کیا ہے؟ کیسے کھلونے اور کھیل ہیں یہ؟ مکتا دیوی کو تعجب ہوتا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ ڈر بھی لگتا تھا۔ وہ بھی تو بچی تھیں، گو اب اس بات کو مدت بیت گئی مگر جب ان کا بچپن تھا تو وہ گڑیوں سے کھیلتی تھیں۔ ہنڈکلیا پکاتی تھیں، گڑیوں کا بیاہ رچاتی تھیں اور گھروندے بناتی تھیں، مگر آج کل کے بچے گھروندے نہیں بناتے، گھر توڑتے ہیں اور بندوقیں چلاتے ہیں...... ڈز...... ڈز...... ڈز......!!

دونوں کے لڑنے جھگڑنے کی آواز بلند ہوئی تو رام نے انہیں ڈانٹا۔

''شیام، گیتا! شور مت کرو...... دادی کو آرام کرنے دو۔'' پھر اس نے مکتا دیوی سے کہا۔ ''ماتا جی! تم آرام سے تو ہو نا؟''

''ہاں بیٹا تم فکر نہ کرو۔''

''سیتا! تم نے ماتا جی کی دوائیں تو رکھ لی ہیں نا؟'' اس نے سیتا سے پوچھا۔

''ہاں، میں نے سب چیزیں رکھ لی ہیں۔ دوائیں، مالا، رام جی کی مورتی اور رامائن۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''بس ایک چیز رہ گئی ہے۔''

''کیا؟''

''پتا جی کی تصویر۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''شیام نے اس کا شیشہ توڑ دیا تھا۔''

''کوئی بات نہیں، تصویر بعد میں آ جائے گی۔''

چند لمحے بعد مکتا دیوی نے پوچھا۔

''رام! کتنی دیر میں پہنچیں گے وہاں؟''

''ماتا جی! ذرا دور ہے۔ میرا خیال ہے، آدھا گھنٹہ لگ ہی جائے گا۔'' رام نے راؤنڈ اباؤٹ پر سرخ بتی دیکھ کر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

مکتا دیوی نے پھر کچھ کہنا چاہا، مگر ارادہ بدل دیا۔ انہوں نے ایک تھکی ہوئی سانس لی اور خالی خالی نظروں سے باہر دیکھا۔ کار اب راؤنڈ اباؤٹ کراس کر کے آگے بڑھ گئی تھی اور کشادہ سڑک پر ہموار رفتار سے رواں تھی۔ سڑک کی ایک جانب چھوٹے چھوٹے درختوں کی طویل قطار تھی۔ درختوں کے عقب میں دور تک سبزے سے ڈھکا میدان تھا جس میں کہیں کہیں اکا دکا پیڑ اور جھاڑیوں کے جھنڈ تھے جبکہ

دوسری جانب سرخ اینٹوں والے خوب صورت مکانات تھے۔ قطار اندر قطار...... سنہری دھوپ میں وہ مکان کھلونوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ مکتا دیوی ایک حسرت آمیز دلچسپی سے ان مکانوں کو دیکھتی رہیں۔ مکان، گھر، چھوٹے چھوٹے خوب صورت گھر، جن میں چھوٹے چھوٹے لوگ، چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی زندگیاں جیتے ہیں۔ گھر...... مکتا دیوی کے لیے گھر ہمیشہ ایک خواب کی مانند رہا تھا۔ ان کا سارا جیون اور جیون کا ایک ایک پل اسی خواب کی تعبیر کی جستجو میں گزر گیا تھا۔

جب تک بچپن تھا، تب تک انہیں احساس نہیں تھا کہ اپنے گھر اور کرائے کے مکان میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ان کے پتا کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے کمرے، کھپریل کی چھت، مختصر سا صحن اور چھوٹا سا آنگن۔ دروازے پر پھٹا ہوا ٹاٹ کا پردہ جھولتا رہتا۔ مکان کی حالت اور ان کے پتا کی مالی حالت میں برائے نام فرق بھی نہیں تھا کہ دونوں ہی خستہ تھیں۔ مکتا دیوی کی عمر کوئی گیارہ بارہ سال تھی، جب پہلی بار انہیں احساس ہوا کہ جس گھر میں وہ رہتی ہیں، وہ ان کا نہیں پرایا ہے۔ یہ احساس بھی ہوا کہ گھر اپنا نہ ہو تو آدمی کتنا بے وقعت ہوتا ہے اور یہ احساس اس بنا پر ہوا کہ ایک دن انہوں نے مالک مکان چوبے لال کو اپنے پتا پر ناراض ہوتے دیکھا اور سنا۔ کئی ماہ سے کرایہ ادا نہیں ہوا تھا۔ چوبے لال، لال پیلا ہو رہا تھا اور ان کے پتا جی خوشامد کر رہے تھے۔

"اگر آپ نے کرایہ جلدی ادا نہیں کیا تو سامان اٹھا کر پھنکوا دوں گا۔"

"نہیں چوبے لال جی! ایسا نہ کہیں، میں جلدی ہی کوئی بندوبست کروں گا، اطمینان رکھیں۔"

مکتا دیوی کے دل میں دراڑ پڑ گئی۔ وہ مکان جو انہیں ہمیشہ اپنا لگتا تھا، جانا پہچانا، معاً غیر محسوس ہونے لگا۔ من میں ایک آرزو ابھری۔ اپنے گھر کی آرزو۔ ایک ایسا گھر ہونا چاہیے جس کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک کیل اپنی ہو اور کبھی ایسا نہ ہو کہ کوئی چوبے لال سامان اٹھا کر باہر پھینکنے کی دھمکی دے۔ ان کے پتا کیدار ناتھ کبھی اس قابل نہ ہو سکے کہ اپنا گھر بنا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں اپنے گھر کی آرزو پختہ ہوتی چلی گئی۔ شادی ہوئی، وہ انگلستان پہنچیں۔ اپنے گھر کے خواب پھر بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ ان کے پتی گھنشیام بھی ایک سیدھے سادے آدمی تھے۔ ایک فیکٹری میں لیبر جاب کرتے تھے۔ اپنے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائی کی کفالت کی ذمہ داری بھی ان کے سر تھی۔ آمدنی کا ایک حصہ ہر ماہ نکل جاتا تھا۔ کونسل کی فلیٹ میں رہائش تھی۔ کرائے کی ادائیگی اور دیگر اخراجات کے بعد اتنا بچتا ہی نہ تھا کہ گھنشیام جی مکان خریدنے کے بارے میں سوچ بھی سکتے۔ مکتا دیوی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ گھنشیام جی انگلستان میں رہتے ہیں، ان کے مالی حالات یقیناً بہتر ہوں گے، لہٰذا انہیں مکان مل جائے گا۔ اپنا مکان، ذاتی جس کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک کیل ان کی اپنی ہوتی، لیکن یہ آرزو تشنہ ہی رہی۔

آدمی پیاسا ہو اور پانی نہ ملے تو پیاس اور بڑھتی ہے۔ منزل نظروں سے اوجھل ہو تو منزل تک پہنچنے کی تڑپ میں اور بھی شدت پیدا ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال مکتا دیوی کا تھا، جیسے جیسے وقت گزرا اور اپنے گھر کا خواب پورا ہوتا نظر نہ آیا۔ ویسے ویسے ان کی خواہش بھی بڑھتی گئی۔ کچھ بھی ہو، ایک دن وہ اپنا گھر ضرور بنائیں گی۔ گھنشیام جی ایک صابر اور قانع آدمی ہیں۔ ان کی خواہشات محدود ہیں، جو کچھ اور جتنا کچھ میسر ہے، اسی میں خوش رہتے ہیں لیکن وہ اس صورت حال کو بدل دیں گی۔ وہ ان کا حوصلہ بڑھائیں گی۔ ان کے دل میں امنگ پیدا کریں گی اور ان کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر جدوجہد کریں گی اور ایک دن...... ہاں، ایک دن اپنا سپنا ضرور پورا کریں گی۔

اپنا گھر......

گھنشیام جی نے ایک بار خود بھی کہا تھا۔ "مکان کی خواہش تو میری بھی ہے۔ سر پر اپنی چھت ہو تو

آدمی کو تحفظ کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ میرے حالات نے اب تک اجازت نہ دی مگر اب تم آ گئی ہو تو دونوں مل کر کوشش کریں گے اور بچوں کے لیے ایک گھر بنائیں گے۔“

مگر ابھی رام اور رادھا چھوٹے ہی تھے کہ گھنشیام جی مکتا دیوی کا ساتھ چھوڑ گئے۔ بیماری بظاہر معمولی تھی لیکن جان لیوا ثابت ہوئی۔ بستر مرگ پر آنکھیں بند کرنے سے پہلے انہوں نے آب دیدہ ہو کر مکتا دیوی سے کہا تھا۔

”مجھے معاف کر دینا، میں تمہیں کوئی سکھ نہ دے سکا۔“

پتی کا خیال آیا تو مکتا دیوی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی اور وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو کر بیتے دنوں کے جنگل میں گم ہو گئیں۔

☆☆☆

کار اب ایک ایسی سڑک پر چل رہی تھی جس پر دو رویہ گھنے درخت تھے۔ جن کا چھتر اسایہ کسی تجریدی تصویر کی طرح سڑک پر پھیلا ہوا تھا۔ دائیں جانب قدرے اونچائی پر مکانوں کی قطاریں تھیں، جن کے بیرونی باغیچوں پر گلاب، ڈہلیا، خوشیا اور دوسرے پودے لگے تھے۔ مکتا دیوی نے ذرا حسرت سے ان چھوٹے چھوٹے باغیچوں کو دیکھا۔ انہیں پھول پھلواری کا بھی بہت شوق تھا۔ کونسل کے فلیٹ میں کوئی باغیچہ نہیں تھا، جس میں پھول پودے لگائے جا سکتے۔ صرف ایک چھوٹی سی پختہ بالکنی تھی۔ مکتا دیوی اسی بالکنی میں چند گملے لگا کر اپنا شوق پورا کر لیا کرتی تھیں لیکن ہمیشہ سوچتی تھیں کہ جب بھی مکان لیں گی تو اس بات کا خاص خیال رکھیں گی کہ مکان میں کشادہ پائیں باغ ضرور ہوتا کہ وہ ایک خوب صورت سا باغیچہ بنائیں اور اس میں ڈھیر سارے زرد گلاب لگائیں۔ انہیں زرد گلاب بہت پسند تھے مگر یہ آرزو بھی تشنہ تکمیل ہی رہی تھی۔

یکا یک ان کی توجہ رام کی طرف مبذول ہو گئی، وہ کہہ رہا تھا۔

”ماتا جی! تم نے موسیٰ کو چٹھی لکھ دی ہے؟“

”ہاں، کل ہی تو لکھی تھی۔“ انہوں نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

”انہیں اس بارے میں تو کچھ نہیں لکھا ہے نا؟“ اس نے ”اس“ پر بطور خاص زور دیا۔

”نہیں......“ مکتا دیوی نے ٹھنڈی سانس لی۔

”اور کبھی لکھنا بھی نہیں۔“ رام نے مزید کہا۔ ”خواہ مخواہ باتیں بنائیں گے وہ لوگ۔“

مکتا دیوی چپ رہیں۔

سیتا نے اپنے شانوں تک ترشے ہوئی بالوں کو ہولے سے جھٹکا دیا۔ ”اب ان لوگوں کو یہاں کے حالات اور مسائل کے بارے میں کچھ معلوم تو ہے نہیں، وہ ان سب باتوں کو اپنی نظر سے دیکھیں گے اور بے ہودہ باتیں کریں گے۔ انہیں تو سمجھایا بھی نہیں جا سکتا۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ رام نے بیک ویو مرر میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اور ماتا جی! تم نے چاچی کو بھی چٹھی لکھی ہے؟“

”ہاں......“

”تم نے روپے کے بارے میں بھی لکھ دیا ہے؟“

”ہاں......“

”وہ شاید برا تو مانیں گی، مگر کیا کیا جائے۔ جتنا روپیہ انہوں نے مانگا تھا، اتنا بھیجنا تو ممکن نہیں تھا، اس لیے کم بھیجا ہے۔ تم نے لکھ دیا ہے نا کہ ابھی گنجائش نہیں تھی۔“

”ہاں، لکھ دیا ہے۔“ مکتا دیوی نے مدھم آواز میں کہا۔

سیتا نے ایک بار پھر اپنے سیاہ چمکیلے بالوں کو جھٹکا دیا۔ ”یہ تو واقعی بڑی مصیبت ہے، وہاں والے تو یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہاں نوٹوں کے پیڑ لگے ہیں، جب ہمیں ضرورت پڑتی ہے توڑ لیتے ہیں۔“ اس کا لہجہ کچھ اور خشک اور تیکھا ہو گیا۔

”اب انہیں کون سمجھائے کہ یہاں ہمارے سر

پر بھی دس طرح کے خرچے ہیں۔ اوپر سے بچوں کی ذمہ داری۔ اب اتنا کہاں سے لائیں کہ ان کی آئے دن کی مانگیں پوری کریں، لیکن انہیں ان باتوں سے کیا غرض۔ کبھی موسیٰ نے مانگ لیا، کبھی چاچی نے، کبھی اس نے، کبھی اس نے...... میں تو کبھی کبھی تنگ آجاتی ہوں۔"

مکتا دیوی نے سیتا کے ترشے ہوئے جدید فیشن کے بالوں، گردن میں چمکتے طلائی ہار اور کانوں میں جھولتے ہیروں کے ٹاپس کو دیکھا اور افسردگی سے مسکرائیں...... پھر انہوں نے کھڑکی سے باہر نظریں جمادیں۔ کار اب ایک موڑ پر گھوم رہی تھی۔ کونے والے مکان کا بیرونی باغیچہ خاصا کشادہ تھا۔ باغیچے کی چہار دیواری کے ساتھ ساتھ گلاب کے کئی پودے تھے، جن میں سفید، سرخ اور زرد گلاب کھلے ہوئے تھے۔ زرد گلاب...... انہوں نے پژمردگی سے سانس لی۔ گھنشیام جی تو چلے گئے تھے۔ اب مکتا دیوی تھیں اور چھوٹے چھوٹے بچے۔ رام اور رادھا اور ایک مسلسل پرکھشا میں، اس آزمائش میں ہاریں گی نہیں، لڑتی رہیں گی۔ اپنے لیے نہیں، بچوں کے لیے۔ ان کی اپنی زندگی تو محرومی اور انتظار میں بیت گئی تھی۔ محرومی کہ انہیں کچھ نہیں ملا تھا۔ ان کا ہاتھ اس بھکاری کے کشکول کی طرح خالی رہا تھا، جسے سارے دن صدا لگانے کے بعد بھیک نہ ملی ہو اور انتظار کہ کبھی تو وہ دن آئے گا، جب انہیں ان کے ایک سپنے کی تعبیر ملے گی۔ ایک گھر جو ان کا اپنا ہوگا۔ ایک ایک اینٹ، ایک ایک کیل ان کی ملکیت ہوگی اور وہ اپنی ذات کے پورے اعتماد و افتخار کے ساتھ اس گھر میں رہ سکیں گی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے بچوں کو بھی اسی محرومی اور انتظار سے دوچار ہونا پڑے چنانچہ کمر ہمت باندھی اور حالات سے لڑنا شروع کیا۔

اب دھیان آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ ان کی جدوجہد کی کہانی بائیں تئیس برسوں پر پھیلی ہوئی تھی اور اب انہیں یقین کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ اتنی لمبی مدت تک وہ حالات کے پرخار راستے پر ننگے پاؤں چلی تھیں۔ کیا واقعی؟ مڑ کر دیکھتی ہیں تو حد نظر تک زخمی پیروں کے نشان نظر آتے ہیں اور انہیں یقین آتا ہے کہ واقعی وہ اس راستے پر قدم بہ قدم چلی ہیں مگر یہ سفر آسان بہرحال نہیں تھا۔ بڑے آزار سہے تھے انہوں نے، بہت دکھ اٹھائے تھے۔ ہر شام مرتی تھیں اور ہر صبح جیتی تھیں اور ہر چند کہ مرنے اور جینے کا یہ عمل حد درجہ اذیت ناک تھا، پھر بھی انہوں نے اپنا حوصلہ نہیں ٹوٹنے دیا۔ صرف ایک مقصد کے لیے یہ کہ ان کے بچے ہیں اور بچوں کے لیے، رام اور رادھا کے لیے...... وہ وقت کی ساری بدشگونیاں اپنے سر لے لیں گی، لیکن بچوں پر آنچ نہیں آنے دیں گی۔ تعلیم تو تھی نہیں لہٰذا انہوں نے کبھی بچوں کے اسکول کے کچن میں برتن مانجھے، کبھی ہسپتال میں فرش صاف کیا۔ کبھی کپڑے سیے اور کبھی کبھی سپر اسٹور میں اٹھانے دھرنے کا کام کیا۔ بیچ بیچ میں اکثر بیکاری کا سامنا بھی ہوا۔ تب حکومت کی طرف سے ملنے والے بیکاری الاؤنس پر گزارہ کرنا پڑا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشیں اور ضرورتیں ماریں، معمولی کپڑے پہنے اور سردیوں میں صرف ایک بھدا سا کوٹ پہن کر گزارہ کیا، مگر بچوں کو کبھی کسی محرومی کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ انہیں اچھا کھلایا، اچھا پہنایا اور ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں بھی بروقت پوری کیں۔

گھر کی آرزو صبر آزما دنوں میں بھی ہر پل موجود رہی، مگر اب انہوں نے اپنی اس تمنا کا مرکز رام کو بنالیا تھا۔ رام میرا بیٹا ہے، بڑا ہوگا تو گھر خریدے گا اور میرا سپنا پورا ہوجائے گا۔ وہ رام کو دیکھتیں اور اس کے بڑھتے ہوئی قد کاٹھ پر نظر ڈالتیں تو ان کا حوصلہ اور بڑھتا۔ ہاں رام ضرور ان کی یہ حسرت پوری کرے گا، وہ کام جو ان کے پتا نہیں کرسکے، پتی سے نہ ہوسکا، وہ کام بیٹا کرے گا اور ان کا یہ خواب، جو جان کا روگ بن گیا ہے انجام کار شرمندۂ تعبیر ہوجائے گا۔ وہ سوچتیں اور خوش ہوتیں۔

وقت گزرا، قسمت نے ساتھ دیا۔ رادھا کی شادی ایک معقول گھرانے میں ہوئی، وہ اپنے پتی

کے ساتھ نا رو ے چلی گئی۔ پھر رام کی شادی ہوئی، سیتا گھر آئی۔ کچھ اور سمے بیتا۔ گھر میں شیام اور گیتا کا اضافہ ہوا اور پھر آخر کار وہ دن آیا، جب مکان خریدا گیا۔ کچھ رقم رام نے جمع کی تھی۔ کچھ جمع جتھا ان کے پاس تھا جو انہوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے برسوں میں پس انداز کیا تھا، وہ سارا انہوں نے رام کو دے دیا۔

''بس اب اور دیر کرنا مناسب نہیں، مکان لے ہی لو۔'' انہوں نے کہا تھا۔ ''بچوں کو کرائے کے نہیں، اپنے مکان میں پلنا بڑھنا چاہیے۔''

جس دن مکان کی چابی ملی، انہوں نے پہلی بار ''اپنے'' گھر میں قدم رکھا۔ وہ دن ان کی زندگی کا سب سے خوب صورت دن تھا۔ سب سے انمول اور مبارک۔ اتنا کہ ہر تہوار سے بڑا، گو بڑھاپا تھا اور ناتوانی...... پھر بھی وہ سارے گھر میں ماری ماری پھریں...... چپے چپے کو پیار سے دیکھا...... کھڑکیوں اور دروازوں پر نظر ڈالی اور ان کا من خوشی، آسودگی اور غرور سے بھر گیا۔ آخر کار ان کا خواب پورا ہو گیا تھا۔ یہ مکان ان کے بیٹے کا ہے، گویا ان کا ہے۔ اب کوئی چوبے لال دروازے پر آ کر سامان باہر پھینکنے کی دھمکی نہیں دے سکتا اور نہ کوئی کونسل مکان خالی کرواسکتی ہے۔ مکتا دیوی کو پہلی بار...... ہاں، زندگی میں پہلی بار طمانیت، افتخار اور تحفظ کا بھرپور اور بے پایاں احساس ہوا۔

پہلے سات دنوں میں ہر صبح انہوں نے معمول سے زیادہ سمے پوجا میں صرف کیا اور گھر کے لیے خیر و برکت اور اپنے بچوں کی صحت سلامتی اور ترقی و کامرانی کے لیے پراتھنا کی۔

یہ کوئی سات ماہ پہلے کی بات ہے۔

☆☆☆

یکا یک ان کی توجہ شیام اور گیتا کی طرف چلی گئی۔ ایک بار پھر ان کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا تھا اور اس بار جھگڑے کی وجہ وہ خود تھیں۔ گیتا کہہ رہی تھی کہ دادی میری ہیں جبکہ شیام کا اصرار تھا کہ دادی اس کی ہیں۔ گیتا یکا یک گھومی اور اچک کر مکتا دیوی کی گود میں بیٹھ گئی اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

''دادی! تم میری دادی ہونا......؟''

''ہاں بیٹا۔'' انہوں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''نہیں، نہیں...... تم میری دادی ہے۔'' شیام ان سے لپٹ گیا۔

''نہیں، دادی میری ہیں۔ تم الگ ہو۔'' گیتا چلائی۔

''نہیں، میری ہیں......'' شیام نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''دادی! تم بتاؤ، کس کی دادی ہو تم؟'' گیتا نے پوچھا۔

مکتا دیوی کے سینے میں کوئی شے چیخ کر ٹوٹی۔ انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔

''بیٹا! میں تم دونوں کی دادی ہوں......''

''نہیں، نہیں۔ تم میری ہو...... تم میری ہو......'' گیتا چلانے لگی۔

''نہیں، میری ہیں......'' شیام اور بھی زیادہ زور سے مکتا دیوی سے لپٹ گیا۔

یکا یک سیتا نے گردن گھما کر شیام اور گیتا کو ڈانٹا۔

''چپ رہو تم دونوں، فضول باتیں مت کرو اور الگ ہٹ کر بیٹھو۔''

مکتا دیوی نے ہولے سے دونوں بچوں کو خود سے الگ کر دیا۔

رام نے کار کی رفتار معاً کم کی۔ دائیں جانب ایک سڑک نظر آ رہی تھی۔ رام نے گاڑی اس کی طرف موڑی، پھر کوئی نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا اور کار ایک چھوٹے سے کار پارک میں روک دی۔ سامنے ایک عمارت تھی، ایک منزلہ جو دو حصوں پر مشتمل تھی۔ دائیں ہاتھ والا حصہ چوکور تھا جبکہ بائیں جانب ایک وسیع گول کمرہ تھا۔ دونوں حصوں کے درمیان فاصلے میں جو کوئی بیس فٹ تھا، ایک کشادہ

راہداری بنائی گئی تھی۔ راہداری ہی میں ایک طرف دفتر تھا اور اس سے متصل انتظار گاہ۔ دونوں بچوں کو انتظار گاہ میں بٹھایا گیا۔ پھر رام، سیتا اور مکتا دیوی دفتر میں گئے، جہاں ایک دبلی پتلی عورت نے انہیں خوش آمدید کہا۔ اس عورت کا نام پینی تھا۔ وہ ایک خوش مزاج عورت تھی، مگر اس کے چہرے سے افسردگی اور تھکن کا اظہار ہو رہا تھا، جیسے وہ وقت اور حالات سے لڑنے کا حوصلہ کھو بیٹھی ہو۔ اس نے نرم اور دوستانہ لہجے میں ان سے باتیں کیں۔

زیادہ دیر نہیں لگی، محض پندرہ منٹ میں ضروری امور طے ہو گئے، پھر اس نے رام اور سیتا سے کہا۔

''ٹھیک ہے، اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔''

جب وہ دفتر سے باہر آئے تو پینی نے مکتا دیوی سے کہا۔

''آپ میرے ساتھ آیئے۔''

مکتا دیوی نے منوں وزنی قدم آگے بڑھایا۔

پینی انہیں گول کمرے میں لے گئی۔ وہ کمرہ دراصل سٹنگ روم تھا۔ کمرے میں چاروں طرف ایک دائرے کی شکل میں آرام دہ کرسیاں اور صوفے لگے تھے، جو خاصی اچھی حالت میں تھے۔ ایک طرف ٹیلی ویژن رکھا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک میز اور چند کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر ڈامینو، تاش کی گڈی اور شطرنج کا ڈبا قرینے سے رکھا تھا۔ مکتا دیوی نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اپنے سینے کے اندر دل کو ڈوبتے ہوئے محسوس کیا۔ کمرے میں دو افراد موجود تھے۔ ایک بوڑھی انگریز عورت تھی، جو صوفے پر نیم دراز تھی اور غالباً سو رہی تھی۔ جبکہ دوسرے ایک ایشین صاحب تھے۔ سر پر ایک ململی سی ٹوپی، آنکھوں پر پلاسٹک کے سیاہ فریم کا چشمہ، چھوٹی سی داڑھی، جس کا ایک ایک بال سفید تھا، ہاتھ میں بید کی چھڑی۔ وہ ایک کرسی پر ایک جانب قدرے جھک کر بیٹھے ہوئے تھے اور مکتا دیوی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نظریں ملیں تو وہ ہولے سے مسکرائے۔

مکتا دیوی کے ہونٹوں پر بھی ایک خفیف سی افسردہ مسکراہٹ ابھری۔

پینی نے مکتا دیوی سے نرم لہجے میں کہا۔

''آپ یہاں بیٹھیے، میں ابھی آتی ہوں۔''

مکتا دیوی بیٹھی نہیں، وہ چپ چاپ کھڑی رہیں اور کھڑکی سے باہر پارک کی جانب پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہیں، جہاں رام اور سیتا اور بچے کار میں بیٹھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کار کو اسٹارٹ ہوتے اور رینگتے ہوئے دیکھا۔ کار سڑک پر آئی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ تب ہی یکایک ان کے کانوں میں آواز آئی۔

''آداب عرض بہن۔''

انہوں نے گھوم کر دیکھا۔ عمر رسیدہ ایشین بزرگ جو کرسی پر بیٹھے تھے، اب اٹھ کر چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مکتا دیوی نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''آداب......!''

''میرا نام محمد علی ہے۔'' بزرگ نے کہا اور ان کے قریب کھڑے ہو گئے۔

مکتا دیوی نے پژمردگی سے مسکرا کر سر کو جنبش دی اور بولیں۔

''مجھے مکتا دیوی کہتے ہیں۔''

مکتا دیوی نے ہونٹوں پر زبان پھیری، مگر کچھ بولی نہیں۔

قدرے توقف کے بعد محمد علی نے کہا۔

''شاید آپ کی بیٹی ہے وہ۔'' انہوں نے کار کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، بہو ہے۔'' مکتا دیوی نے جیسے سرگوشی کی۔

''اچھا...... اچھا......'' محمد علی نے ہولے سے کہا۔ ''ابھی جب آپ آئی تھیں تو میں نے راہداری میں آپ کو دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید آپ کی بیٹی اور داماد ہیں مگر...... اور وہ دونوں بچے تو بہت ہی پیارے ہیں۔'' انہوں نے رک کر افسردگی سے

سانس لی۔ ”شاید مجھے کہنا تو نہیں چاہیے، لیکن آپ خیال نہ کریں تو...... آپ کو یہاں آنے کی ضرورت کیوں پڑی؟“

مکتا دیوی نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”اصل میں گھر میں جگہ کی کمی تھی اور پھر میری بہو......“ وہ یک لخت جھجک کر چپ ہوگئیں، پھر لمحہ بھر رک کر بولیں۔ ”کچھ اور پریشانیاں بھی تھیں اسی لیے......“

”اچھا اچھا...... میں سمجھا۔“ محمد علی نے تھکے ہوئے انداز میں سر کو جنبش دی۔

”ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا کیا جائے، اختیار کی بات نہیں ہے، جگہ کم پڑجاتی ہے اور پھر بیٹا اور بہو......“ یکا یک رکے، پھر کہنے لگے۔ ”مگر بہن! آپ پریشان نہ ہوں، شروع میں جی گھبرائے گا مگر دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہوجائے گا۔ یہاں اسٹاف کے لوگ اچھے ہیں۔ خیال رکھتے ہیں اور ہاں...... دو اپنے ہم زبان اور بھی ہیں یہاں۔ میں آپ کو ملواؤں گا ان سے۔ یہ ”اولڈ پیپلز ہوم“ برا نہیں ہے، سب لوگ مل جل کر رہتے ہیں تا کہ تنہائی کا احساس زیادہ تکلیف نہ پہنچائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ جلدی ہی ہم لوگوں میں گھل مل جائیں گی۔“

مکتا دیوی نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ کار اب موڑ پر پہنچ کر دائیں جانب گھوم رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ شیام اور گیتا عقبی اسکرین سے عمارت کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ ایک نظر اور دادی کو دیکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ معاً ان کے کانوں میں دونوں بچوں کی آوازیں گونجیں۔

”دادی میری ہیں...... دادی میری ہیں......“

پھر کار نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ مکتا دیوی نے زور سے سانس لی اور ہاتھ اٹھا کر آنکھوں کی نمی خشک کی۔

پھر انہوں نے محمد علی کی طرف دیکھا۔

”اب جو بھی ہو، سمجھوتا تو کرنا ہی پڑے گا۔“ ان کی آواز سے بے بسی چھلک رہی تھی۔ لمحے بھر چپ رہیں، پھر کہنے لگیں۔ ”ویسے میرے بیٹے اور بہو نے وعدہ کیا ہے کہ پابندی سے مجھ سے ملنے کے لیے آیا کریں گے۔“

”ہاں، وہ ضرور آئیں گے اگر انہیں وقت ملا تو......“ محمد علی نے شکستہ آواز میں کہا۔

”اگر......؟“ مکتا دیوی نے سہم کر ان کی طرف دیکھا۔

”ہاں......“ محمد علی نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کی چوکھٹ کا سہارا لیا۔ ”مکتا دیوی! اس ہوم سے باہر جو دنیا ہے نا، وہ بہت زیادہ مصروف ہے۔ کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ ہر شخص بھاگ رہا ہے، اندھا دھند بھاگ رہا ہے۔ خواہشوں اور ضرورتوں کے پیچھے...... لیکن خواہشیں اور ضرورتیں ہیں کہ پوری ہی نہیں ہوتیں۔ کیسی کیسی مجبوریاں ہیں بے چاروں کی اور کیسی کیسی مصروفیات...... دوستوں سے ملنا ملانا، پارٹیاں، میٹنگیں، بیوٹی سیلون اور نہ جانے کیا کیا۔ ہر شخص تصنع اور نمائش کے جنگل میں گم ہے اور لطف یہ ہے کہ اس جنگل سے وہ باہر نکلنا بھی نہیں چاہتا بلکہ اور گم ہونا چاہتا ہے۔ ہر چند کہ اس کے پاس سب کچھ ہے، بہت کچھ ہے پھر بھی بے چارہ بے حد کنگال و قلاش ہے کہ اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ میں یہاں سات ماہ سے ہوں، میرے بیٹے نے بھی کہا تھا کہ ہفتے میں دوبارہ میرے پاس آیا کرے گا۔ دو ماہ تک اس نے اپنے وعدے کی آبرو رکھی، مگر اب مہینے میں ایک بار آتا ہے۔ کبھی کبھی صرف پندرہ منٹ کے لیے...... کیا کرے غریب، مجبور ہے۔ اسے فرصت نہیں ملتی۔“

محمد علی کی آواز دھیرے دھیرے معدوم ہوگئی۔

مکتا دیوی نے زخمی نظروں سے ان کی طرف دیکھا، انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کا دل دھیرے دھیرے ڈوب رہا ہے اور ایک آواز ان کے کانوں میں گونج رہی ہے۔

”مکتا دیوی! اب یہی تمہارا گھر ہے، جس کی کوئی اینٹ، کوئی کیل تمہاری نہیں ہے۔“

☆☆

لاٹری

ارشد جمیل

یہ ضروری نہیں کہ معاشرے میں سب ہی لوگ برائی کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ ہمارا واسطہ جن لوگوں سے پڑتا ہے۔ اس میں سے اکثریت ایسے دفاتر میں کام کرتی ہے جن کا تعلق ہمارے ہی مختلف مسائل سے ہوتا ہے اور ہم ان کی مدد لینے کے لیے مجبور ہیں۔ ایک ایسے ہی معاملے کی کہانی......!

ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہونے والے شخص کی کہانی

صبح ناشتے کی میز پر سارا خاندان اکٹھا تھا۔

چھوٹے بھائی کی آمد کی خوشی میں بڑے بھائی نے بھی دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی۔ ایک مرتبہ پھر سارے خاندان کی باتوں، قہقہوں، مسکراہٹوں اور یادوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ ناشتا بھی ہو رہا تھا اور باتیں بھی۔ برتن بھی پھیلائے جا رہے تھے اور گفتگو کا سلسلہ بھی دراز تر...... یکا یک بڑے بھائی کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ایک تاثر سا آیا، جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ چھوٹے بھائی کی نظریں بڑے بھائی کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ وہ چونک پڑا۔

"کیا بات ہے بھائی جان...... کوئی بات؟"

"ہاں...... ہاں مجھے کچھ یاد آ گیا ابھی ابھی۔ باتوں میں الجھ کر ذہن سے نکل ہی گیا تھا۔" بڑے بھائی نے کہا۔

"اچھا، وہ کیا؟" اب سب ہی بڑے بھائی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"عادل! مجھے یاد پڑتا ہے، تمہارا کچھ معاملہ تھا پیسوں کا۔"

"پیسوں کا...... وہ کیسے؟" چھوٹے بھائی نے تعجب ظاہر کیا۔

"بھئی میں تو شرمندہ ہو رہا ہوں۔" بڑے بھائی نے بولتے بولتے رک کر پہلے چھوٹے بھائی کا، پھر سب کا ایک جائزہ لیا۔ "مجھ ہی سے کچھ لاپروائی ہو گئی اور تمہارا نقصان......"

عادل نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "بھائی جان! پہیلیاں نہیں بجھوایئے، سیدھی طرح بتا دیجیے۔ ناشتا بھی ختم کرنا ہے اور آج کچھ اور کام بھی نمٹانے ہیں اور دو تین جگہ بھی جانا ہے۔"

بڑے بھائی نے چائے کا مگ دوبارہ بھرنا شروع کیا، سب بے تابی سے ان کے بولنے کے منتظر رہے۔

"اچھا تو بھئی عادل....." بڑے بھائی نے تازہ چائے کا ایک لمبا گھونٹ لیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ تمہارے کچھ ڈیفنس سرٹیفکیٹ پڑے ہوئے ہیں اور وہ ویسے ہی پڑے رہ گئے تھے۔"

عادل نے غور سے بڑے بھائی کو دیکھا۔ "کیسے سرٹیفکیٹ؟ مجھے تو کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

"تم کو بھی کہاں یاد ہوگا۔" بڑے بھائی نے آدھا مگ خالی کر کے میز پر رکھا۔ "جبکہ مجھے بھی گھر کے گھن چکروں نے یاد نہیں رہنے دیا۔ یہ سرٹیفکیٹ وہ ہیں، جو تم نے امریکا جانے سے بھی کافی پہلے لیے تھے اور جب امریکا جا رہے تھے تو مجھے دے گئے تھے۔ میں ان کو سوٹ کیس کی تہ میں رکھ کر اور ان کے اوپر اخبارات سجا کر تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ ابھی چند روز پہلے سوٹ کیس کی صفائی کی تو اس کی تہ سے یہ سرٹیفکیٹ بھی برآمد ہوئے۔"

''اچھا اچھا، وہ سر ٹیفکیٹس کہاں ہیں؟''
''میں لاتا ہوں۔'' بڑے بھائی نے اٹھ کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ چند لمحے منٹ بعد ان کی واپسی ہوئی تو ہاتھ میں تین عدد کرارے نوٹ جیسے سرٹیفکیٹ، ایک ہی نظر میں سب ہی نے دیکھ لیے تھے۔
ڈائننگ ٹیبل پر دوبارہ بیٹھ کر بڑے بھائی نے سرٹیفکیٹ میز پر پھیلائے تو معلوم ہوا کہ ایک پر دس ہزار درج ہے، دوسرے دو پر ایک ایک ہزار...... یعنی کل بارہ ہزار۔ چھوٹے بھائی سمیت سب ہی نے غور سے ان سرٹیفکیٹس کو دیکھا، سب ہی کے تجسس میں اضافہ بھی ہوا مگر چھوٹے بھائی کو اب بھی یاد نہیں آیا، اب بڑے بھائی نے ایک اور کاغذ نکالا، جو عادل کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، جس پر اسی کے دستخط بھی تھے۔ یہ ایک اجازت نامہ تھا کہ ان سرٹیفکیٹس کے پیسے میرے بڑے بھائی کو دے دیے جائیں۔ چھوٹے بھائی کو اب بھی یاد نہیں آیا کیونکہ اجازت نامے پر درج شدہ تاریخ کی رو سے بھی معاملہ بہت زیادہ پرانا ہو گیا تھا۔ چھوٹے بھائی نے سر اٹھا کر بڑے بھائی کو دیکھا۔
''اچھا صاحب! مان لیا، مگر آپ اس میں نقصان کے حوالے سے اتنے کیوں پریشان ہیں، اس میں کوئی شکوہ شکایت کی بات تو نہیں تھی؟''
''دیکھو بھئی عادل! بات یہ ہے کہ ان سرٹیفکیٹس کی انتہائی مدت ختم ہوئے بھی تین برس ہونے کو آئے ہیں، یعنی تین برس پہلے ہی مجھے ان سرٹیفکیٹس کو بھنوا لینا چاہیے تھا اور اس کی رقم وصول کر لینا چاہیے تھی، ورنہ ان کو نئے سرٹیفکیٹس میں تبدیل کروا لینا چاہیے تھا۔ اب

قصہ سارا یہ ہے کہ چونکہ میں یہ سارا معاملہ بھول ہی گیا تھا لہٰذا یہ تین سال کا جو منافع ہونے والا تھا، وہ نہیں ملے گا۔"

چھوٹے بھائی نے سر ہلایا، جیسے اب وہ کہیں جا کر کچھ کچھ معاملہ سمجھا ہو۔ پرانے کچھ سرٹیفکیٹس تھے، جو بالکل بھی اس کی یادداشت میں نہیں تھے پھر ایک دستخط شدہ اجازت نامہ موجود تھا۔ آسانی سے رقم بھنوائی جاسکتی تھی اور بات آئی گئی ہوگئی ہوتی بلکہ یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ الٹا معافی مانگی جارہی تھی کہ منافع ہی میں کمی ہوگئی۔ آخر بات کس کی تھی اور معاملہ کن لوگوں میں تھا۔ دو بھائیوں کی بات تھی، جہاں بڑا بھائی، چھوٹے بھائی سے ایک ایسی بات کی معافی مانگ رہا تھا۔ اول یہ کہ بھول ہوگئی، دوسرے اور منافع سے محروم ہوگئے۔ تیسرے یہ کہ دیر ہوجانے کی وجہ سے بھنوانے میں دشواری ہی نہ ہوجائے یعنی یک نہ شد، دو شد والی بات تھی۔

چھوٹا بھائی ابھی تک کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ آخر اپنے بڑے بھائی کو کیسے یقین دلائے کہ اس کی یادداشت میں اس معاملے کی ہلکی سی جھلک بھی موجود نہیں تھی۔ یہاں تک کہ سرٹیفکیٹس اور ہاتھ کا لکھا ہوا اجازت نامہ بھی یادداشت میں اس کو تازہ کرنے سے قاصر تھا۔ ہاں ان کاغذات کو دیکھنے کے بعد یہ بات تو سمجھ میں آجا رہی تھی کہ ایسا ہی ہوا ہوگا مگر ذہن میں اس سارے معاملے کی کوئی تصویر بن نہیں پارہی تھی۔ البتہ جو خاکہ سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک لاٹری مل گئی ہے بلکہ اس کی دہری خوشی یہ تھی کہ زندگی بھر میں کبھی بھی جو ایک دھیلے ہی کی کوئی چیز، کسی لاٹری یا مقابلے میں ملی ہو۔

یہی خیال تھا کہ انعام یا لاٹری حاصل کرنے والے دوسری ہی طرح کے لوگ ہوتے ہوں گے۔ ادھر ٹکٹ لیا، ادھر انعام نکل آیا۔

چھوٹے بھائی نے مسکرا کر اردگرد موجود افراد خانہ پر ایک نظر ڈالی، جو ابھی تک نہایت سکون اور خاموشی سے اس تمام تماشے کے نتیجے پر پہنچنے کے منتظر تھے۔ پھر بڑے بھائی پر نظریں جمادیں۔

"بھائی جان! آپ نقصان وغیرہ کا معاملہ بالکل دل سے نکال دیں اور سمجھیے کہ ہم کو ایک لاٹری ہاتھ آ گئی ہے۔ لہٰذا آپ کو فکر مند، پریشان یا شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ تو خوشی کا مرحلہ ہے آپ بھی ہمارے ساتھ اس خوشی میں شریک ہو سکتے ہیں۔ نقصان کی تو کوئی بات ہی نہیں کرنا چاہیے۔

سب گھر والوں کے درمیان خوشی کی ایک لہر آ گئی اور پھر طے پا گیا کہ اگلے روز صبح سویرے ہی یہ معاملہ حل کرلیا جائے تا کہ پھر دوسری مصروفیات میں دوبارہ غیر معینہ مدت کے لیے اٹک کر نہ رہ جائے۔

اگلی صبح طلوع ہوگئی۔

ناشتا اور دوسرے چند چھوٹے موٹے امور نمٹانے کے بعد دونوں بھائی گاڑی میں آ بیٹھے۔ بڑے بھائی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

کچھ دیر کے بعد ان کی گاڑی اس مقام پر پہنچ گئی جہاں وہ ڈاک خانہ واقع تھا، جس سے انہوں نے سرٹیفکیٹ خریدے تھے۔ یہ جگہ پہلی رہائش گاہ سے کچھ دور واقع تھی اور نئی رہائش گاہ سے تو اور بھی دور تھی کہ سواری کے بغیر پہنچنا آسان نہیں تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ان کا شہر، کبھی ایک چھوٹا سا، خوب صورت خاموش اور پرسکون شہر تھا اور یہاں گنتی کے چند ڈاک خانے ہوتے تھے۔ یہ بھی ان ہی چند ایک ڈاک خانوں میں سے ایک تھا۔ گاڑی بند کر کے دونوں بھائی عمارت کی طرف بڑھے۔ اس عمارت کو یوں بھی آسانی سے پہچانا جاسکتا تھا کہ یہ آس پاس کی دوسری عمارات سے واضح طور پر منفرد ساخت رکھتی تھی، جس سے اس کا قدیم طرز تعمیر نمایاں طور پر جھلکتا تھا۔

عمارت کے قریب پہنچتے ہی دونوں کو جھٹکا سا لگا۔ کیا یہ ڈاک خانہ تھا؟ نہ کوئی آدمی آتا جاتا نظر آرہا تھا، نہ کھڑکیاں کھلی تھیں۔ عمارت کے اندر بھی اندھیرا اندھیرا سا اور سناٹا...... عمارت کے مرکزی دروازے کے باہر اس کا "شناختی نشان"، یعنی لال رنگ کا ڈاک کا ڈبا تک غائب تھا۔ کسی جانب مخصوص طرز کی وردی میں ملبوس...... پرانا سا...... بد رنگ سا خاکی تھیلا سنبھالے، سائیکل سوار ڈاکیا تک نظر نہیں آرہا تھا۔

دونوں بھائیوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''ارے یہ ڈاک خانہ کہاں چلا گیا۔''

ڈاک خانہ ہی نہیں رہا تھا تو گویا سارا معاملہ ٹھپ ہو گیا تھا۔ چھوٹے بھائی نے کچھ سوچا پھر بڑے بھائی کی پریشانی کا خیال کر کے بولا۔

''چھوڑیے بھی بھائی جان! کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی اس رقم کو ہم لوگ تقریباً بھول ہی گئے تھے۔ پھر ان پیسوں کے بدلے جو ڈالر ملتے' وہ بھی کوئی زیادہ نہیں بنتے لہٰذا کوئی بات نہیں۔ چلیے کچھ دیر تک تو لاٹری کھلنے کی امید میں خوش ہو لیے...... یہ بھی کافی ہے۔ اس کو خوشی کا بدل سمجھ لیں۔''

بڑے بھائی کے ماتھے پر پریشانی اور فکر کی سلوٹیں ابھی بھی قائم تھیں۔ چھوٹے بھائی کے الفاظ میں تسلی و تشفی کا عنصر تو تھا مگر بڑے بھائی کی پریشانی اپنی جگہ تھی کہ بات دراصل شرمندگی کی تھی، ان کو اطمینان ہوا نہیں تھا۔ ان کی نظریں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ یہ معاملہ اتنی آسانی سے تو بھلایا نہیں جا سکتا ہے۔ کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ یہی سوچتے ہوئے ان کو خیال آیا کہ کیوں نہ کسی سے ڈاک خانے کے بارے میں پوچھا جائے۔ قریب کھڑے پھل کے ٹھیلے والے کے پاس چلے گئے۔ کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ، ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھ ہی ڈالا کہ ''بھئی یہاں ایک ڈاک خانہ ہوتا تھا، وہ اب کہاں ہے؟''

پھل والے نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ کئی دنوں کی بڑھی ہوئی شیو کھجائی اور بولا۔ ''بابو جی! وہ تو کبھی کا ختم ہو گیا، آپ لوگ کیا بہت دنوں بعد ادھر آئے ہیں؟''

''ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔ میں اسی شہر کا ہوں مگر ادھر آنے جانے کا اتفاق نہیں ہوتا، مگر ڈاک خانہ ختم ہو گیا تو کیا کہیں اور چلا گیا؟''

پھل والے نے اپنے پھل سلیقے سے جماتے ہوئے کہا۔

''بابو جی...... وہ یہاں سے فاصلے پر چوراہا دیکھ رہے ہیں نا؟ ادھر سیدھے ہاتھ پر جو سڑک مڑتی ہے، اسی طرف آگے جا کر ایک نئی بلڈنگ میں چلا گیا ہے۔''

بڑے بھائی کے چہرے کے تاثرات ایک بار پھر بدلے۔ گھبراہٹ اور تشویش اب کچھ کچھ امید میں بدل رہی تھی کہ شاید ڈاک خانے کے ساتھ، اس کے پرانے معاملات بھی نئی جگہ منتقل ہو گئے ہوں اور ختم نہ ہوئے ہوں۔ پھل والے کا شکریہ ادا کر کے اب گاڑی کا رخ چوراہے کی طرف کر دیا گیا۔ چوراہے پر پہنچ کر دائیں طرف گاڑی گھمائی، مگر ڈاک خانے کی کوئی نشانی آس پاس کیا دور تک بھی نظر نہیں آئی۔ آ کر سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔ کچھ لوگ آس پاس سے گزر رہے تھے۔ ایک دو کو اشارے سے روکا۔ کسی نے مزید آگے جانے کو کہا۔ ایک دکان دار سے یہی سوال کیا گیا۔ اس نے دکان داروں والی مسکراہٹ پیش کی۔

''جی ہاں، ڈاک خانہ یہیں ہے۔ آپ لوگ چوراہے کی طرف جاتے ہوئے وہ جو پیٹرول پمپ نظر آ رہا ہے، اس گلی میں مڑ جائیں۔ آگے جا کر کوئی ایک سو گز کے فاصلے پر سیدھے ہاتھ پر آپ لوگوں کو ڈاک خانہ نظر آ جائے گا۔''

دونوں بھائیوں نے سکون کا سانس لیا۔ چوراہے کی طرف چلے اور پھر پیٹرول پمپ والی گلی میں مڑ گئے اور کچھ فاصلہ چل کر سڑک کنارے پر چند خطوط نویسوں کو بیٹھے دیکھا۔ چٹائی اور دری بچھائے، آگے ایک چھوٹا، لکڑی کا ڈبا، یہی ان کی کل دکان تھی۔ چند خالی بیٹھے تھے اور ہر راہ گیر کو نظروں ہی نظروں میں بھانپتے ہوئے، آس لگائے ہوئے تھے۔ چند ایک مشغول بھی تھے۔ ڈاک کے ٹکٹ دے رہے تھے۔

ان میں ایک، کسی کا حالِ دل لکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک معصوم شکل، مزدور نما شخص اکڑوں بیٹھا تھا۔ وہ کچھ اپنی زبان بولتا ہو گا۔ شاید اس کو زیادہ کہنے کی ہمت نہ ہو یا وہ زیادہ نہ کہنا چاہتا ہو۔ شاید یہاں اس شہر میں اکیلا محنت مزدوری کرنے آیا ہوتا کہ اپنے بیوی بچوں کو روپیہ کما کر بھیج سکے یا معلوم نہیں کہ اب تکلیف اور تنگی پریشانی میں ہو مگر گھر والوں پر ظاہر نہ کرنا چاہتا ہو۔ خط نویس اس بات کی سنتا پھر اپنے قلم سے اس کی ترجمانی کرنے لگتا۔ ایسے کئی راز اس کے پاس ہوں گے مگر وہ شخص، اس شہر کے نامعلوم الجھاوؤں، سوالوں اور اسراروں کا راز داں...... اسے ان لوگوں کی تکلیفوں کا علم

تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہر نیا شخص اس کے پاس پہلے کچھ گھبراتا ہے، بس تھوڑا کچھ کہتا ہے مگر جب کچھ تسلی ہو جاتی ہے۔ تب وہ اپنا دل کھول دیتا ہے اور پھر وہی شخص اس خط نویس کے پاس اپنا آیا ہوا خط بھی پڑھوانے آجاتا ہے۔ رازدار جو ٹھہرا۔

ڈاک خانے کی نئی عمر کافی بڑی لگ رہی تھی۔ باہر چہار دیواری تھی، بڑے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے بڑا برآمدہ تھا۔ عمارت کا رنگ و روغن اترا ہوا تھا۔ شاید دوسری بار اس پر رنگ و روغن نہیں ہوا تھا۔ برآمدے میں بہت ساری کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں جن میں جنگلے لگے ہوئے تھے، جو اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ ان پر بے شمار لوگ آئے تھے اور اس وقت بھی ان پر چند لوگ موجود تھے۔

زمانے کے ساتھ ڈاک خانوں نے بھی ترقی کر لی ہے۔ اب یہ صرف ٹکٹ، خط اور منی آرڈر ہی نہیں دیتے، دلاتے...... بلکہ یہاں مختلف قسم کے اور بھی کام ہو جاتے ہیں۔ ہر قسم کے لائسنس، طرح طرح کی فیسوں اور بلوں کی ادائیگی بھی یہاں ہو جاتی ہے۔ ڈیفنس سرٹیفکیٹس تو کافی پہلے سے شروع ہو گئے تھے۔ ان ہی کھڑکیوں میں سے ایک پر "ڈیفنس سرٹیفکیٹس" لکھا ہوا تھا۔

دونوں بھائیوں کی نظریں ایک ساتھ اس کھڑکی پر پڑیں کہ وہ اسی کی تلاش میں تو یہاں تک آئے تھے۔ کھڑکی کے پاس پہنچے۔ اندر جھانکا، قدرے اندھیرا سا تھا، رفتہ رفتہ آنکھیں اندھیرے سے آشنا ہوئیں، منظر واضح ہونے لگا کہ سامنے ایک شخص موجود بھی تھا مگر اب بات بنتے، بن نہیں پا رہی تھی کہ آخر اس شخص سے پوچھا کیا جائے اور کیسے پوچھا جائے؟ آخر بڑے بھائی ہی نے پیش قدمی کی۔

"کیا یہ ڈاک خانہ وہی ہے جو پہلے فلاں جگہ تھا اور اب یہاں منتقل ہو گیا ہے؟"

"جی ہاں...... بالکل!" جواب ملا۔

اب ذرا تسلی ہوئی اور ہمت بندھی۔ اگلا مرحلہ اب آسان نظر آنے لگا۔ بند گرہ کھلتی نظر آنے لگی۔

"ہمارے پاس کچھ ڈیفنس سرٹیفکیٹس ہیں، جن کو ہم بھنوانا چاہتے ہیں۔"

فوراً ہی جواب ملا۔ "لائیے، دیجیے۔"

"بھئی یہ تو بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے اور ہمارا کام آسانی سے کر دے گا۔" دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں ایک ہی خیال کا تبادلہ کیا اور اگلے ہی لمحے وہ تینوں، کرارے نوٹوں جیسے کاغذات، بڑے بھائی نے اس اہلکار کے حوالے کر دیے۔

دفتری اہلکار نے ان ڈیفنس سرٹیفکیٹس کو احتیاط سے اپنے ہاتھ میں لیا۔ ان کو غور سے دیکھا پھر باقاعدہ تفصیل سے جائزہ لینا شروع کیا۔ دونوں بھائیوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا، اب کیا مصیبت آ پڑی۔

اب کیا مسئلہ باقی رہ گیا...... مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اہلکار نے ایک مرتبہ پھر ان دونوں بھائیوں پر نظر ڈالی، پھر دوبارہ سرٹیفکیٹس کو غور سے دیکھا، پھر ان دونوں کو دیکھنے لگا کچھ معنی خیز...... اور کچھ تعجب کا انداز لیے ہوئے کہ جیسے کہنا تو چاہتا ہو کہ آپ ویسے معقول اور سمجھ دار لوگ لگتے ہیں، مگر کہاں رہ گئے تھے۔ کیا آپ لوگوں کو اتنی بھی پروا نہیں تھی، مگر خیر...... اس نے کچھ کہا نہیں، صرف انگلی سے اشارہ کر دیا کہ ساتھ والے دروازے سے، کمرے کے اندر آجائیں۔ یہ معاملہ اندر والا عملہ ہی حل کر سکتا ہے۔ کھڑکی پر کھڑے کھڑے نہیں اور ساتھ ہی وہ کرارے نوٹوں جیسے سرٹیفکیٹس بھی واپس کر دیے۔

منزل تو ملی، لیکن منزل مقصود کے لیے ابھی کچھ اور محنت درکار تھی۔ دونوں بھائیوں نے بھی، ہمت نہیں ہاری تھی بلکہ کچھ جستجو ہی بڑھ گئی تھی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے، اسی تاریکی نے خوش آمدید کہا، ایک آدھ برقی قمقمہ روشن تھا، لیکن وہ اکیلا اس اندھیرے کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔ بس اپنی بساط پھر روشنی پھیلا رہا تھا اور اس روشنی میں دفتر کا کام بھی چل رہا تھا۔

یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ جہاں کئی میزیں، کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور لوگ بیٹھے کام کر رہے تھے۔ اب ان دونوں کو، کونے میں موجود، ایک اور میز کی طرف جانے کے لیے کہا گیا۔ کچھ اندھیرے، کچھ مدھم مدھم سی روشنی میں میزوں، کرسیوں اور الماریوں سے بچتے ہوئے یہ دونوں کونے والی میز کے پاس پہنچے۔ یہ میز دوسری

میزوں سے ذرا بڑی تھی، جو نشان دہی کر رہی تھی کہ اس کی کرسی پر بیٹھا ہوا شخص بھی بڑا ہوگا۔ آنکھیں اب اس نیم اندھیرے نیم اجالے سے اس حد تک مانوس ہو چکی تھیں کہ سامنے والا شخص اب صاف طور پر نظر آ رہا تھا۔

''جی فرمایے۔''

بڑے بھائی نے نئے سرے سے تمام صورت حال بیان کی، جواب میں وہی سرٹیفکیٹس طلب کیے گئے۔ اس نے چند لمحے تک ان کا جائزہ لینے کے بعد ایک ماتحت کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر ان کی نشست کے پاس آیا۔ افسر نے ماتحت کو سرٹیفکیٹس تھمائے۔

''بھئی، ان لوگوں کا کام کردو۔'

دونوں بھائی اب اس تیسرے فرد کی جانب پوری طرح متوجہ ہو چکے تھے۔

معاملہ خاصا دلچسپ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک افسر کے بعد دوسرا اور پھر اس کا ماتحت۔ دیکھیے، یہ سلسلہ کہاں تک چلتا ہے۔ تیسرے اہلکار نے بھی ان سرٹیفکیٹس کا بغور معائنہ کیا، پھر ان دونوں کو اپنے پاس آنے کے لیے کہا۔ اس کی میز پر ایک نظر ڈالی۔

''پردیسی لگتے ہیں۔''

''جی ہاں...... یہ باہر سے آئے ہیں اور میں ان کا بڑا بھائی ہوں، یہیں رہتا ہوں۔'

''اچھا...... باہر...... کہاں؟''

''جی، یہ امریکا میں......'' بڑے بھائی نے کہا۔

''ارے آپ بیٹھ تو جائیں۔'' اس شخص نے کہا پھر اپنے ایک ماتحت سے کہا۔ ''بھئی ان لوگوں کے لیے ایک اور کرسی تو لاؤ۔'' دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ منع کیا۔ اس کی ضرورت نہیں اور نزدیک پڑی بنچ پر بیٹھ گئے۔

سفید شلوار قمیص میں ملبوس، درمیانہ قامت، سانولی سلونی رنگت، سر کے بالوں میں کہیں کہیں چاندنی کے تار چمکتے ہوئے، لہجے میں نرمی و ملائمت اور چہرے پر سنجیدگی اور متانت۔ بیٹھنے کا انداز بھی پروقار، اپنی نشست پر اچھی طرح بیٹھ جانے کے بعد اس نے کاغذوں کو دیکھا اور ان کے نمبروں کو پڑھا اور پھر اپنے اسی ماتحت سے کہا۔

''ذرا فلاں کھاتہ تو الماری سے دو۔''

ماتحت نے لکھتے لکھتے سر اٹھا کر دیکھا اور حوالے پر ذرا چونک کر کہا۔

''ارے صاحب! وہ تو بہت پرانا کھاتہ تھا اور اس کو تو شاید ہیڈ آفس بھی بھجوا دیا گیا تھا کیونکہ ختم جو ہو گیا تھا۔''

انچارج نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں نہیں...... ختم نہیں ہوا، ابھی یہیں ہے۔ تم ذرا اس کو دیکھنا تو سہی۔''

انچارج کے لہجے کے یقین نے ماتحت کو کرسی سے اٹھنے اور دیوار سے لگی الماری تک جانے پر مجبور کردیا۔ الماری کے دونوں پٹ کھلے تو اوپر سے نیچے تک مختلف خانوں میں متعدد کھاتے ترتیب وار رکھے نظر آئے۔

ماتحت نے سب سے پہلے اوپر والے خانے سے چند کھاتے نکالے اور ہر کھاتے کی اوپر درج شدہ نمبروں کو پڑھا اور اندازہ کیا کہ ان کھاتوں میں مطلوبہ حساب نہیں ہوگا۔ پھر دوسرا اور تیسرا خانہ بھی اسی طرح دیکھا گیا۔ وہاں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال معلوم ہوتی تھی۔ ادھر بنچ پر دونوں بھائی یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔

وقت جیسے جیسے گزر رہا تھا۔ بڑے بھائی کا ذہن ایک بار پھر بھٹکنے لگا تھا۔

''اگر یہاں بھی اتا پتا نہیں ملا تو...... کہیں ساری رقم یوں ہی ضائع نہ ہو جائے۔''

ماتحت کا بار بار نئے کھاتے نکالنے، دیکھنے، مایوسی کی عالم میں سر ہلا ہلا کر واپس رکھنے کا ایک ایسا منظر تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی فلم یا ڈرامے کا ایک ہی منظر بار بار دکھایا جا رہا ہو۔ بڑے بھائی کے دل میں امید اور مایوسی کی لہریں یکے بعد دیگرے ابھر رہی تھیں۔ اسی اثنا میں بڑے بھائی کی نظریں ایک بار پھر چھوٹے بھائی کی نظروں سے ٹکرائیں، مگر چھوٹا بھائی تو نہایت اطمینان سے بیٹھا تھا۔ گویا محض ایک سر راہ تماشا دیکھنے، بھائی کے ساتھ چلتے چلتے رک گیا ہو۔

کھاتے نکالے جاتے رہے، چیک ہو کر واپس رکھے جاتے رہے، پھر آخری کھاتا بھی دھڑ سے الماری میں رکھ دیا گیا۔ ایک تھکن آمیز طویل سانس کے ساتھ ماتحت نے اعلان کیا۔

''صاحب! کھاتہ نہیں ملا، میں نے آپ کو پہلے ہی بتادیا تھا کہ ہیڈ آفس بھیج دیا ہوگا۔''

انچارج پوری توجہ سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں ظفر صاحب! وہ کھاتہ یہیں ہے اور یہ مجھے یوں یاد ہے کہ اس میں کچھ اندراجات ابھی باقی ہیں، نامکمل کھاتہ ہیڈ آفس کیسے بھجوایا جاسکتا ہے؟''

پھر وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو، میں ہی دیکھتا ہوں۔''

ماتحت ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ الماری کے دونوں پٹ ابھی بند نہیں کیے گئے تھے۔ انچارج نے الماری کے سامنے کھڑے ہوکر اس کا جائزہ لیا، پھر درمیان کے ایک خانے سے چند کھاتے الٹ پلٹ کر ایک کھاتہ نکال لیا۔ انداز انتہائی پرسکون اور پراطمینان تھا جتنا پہلے۔ نہ ماتحت کو ڈانٹ ڈپٹ کی، نہ ماتھے پر شکنیں آئیں۔ اپنی میز پر بیٹھ کر کھاتے کو دیکھنا شروع کیا۔ ان کا افسر بھی سارا معاملہ دیکھ رہا تھا۔ ماتحت کچھ شرمندہ شرمندہ سا...... خاموش اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ اسے اب اپنی نشست پر بیٹھ کر حساب کتاب کرنا تھا۔

سفید پوش انچارج کے کہنے پر اس نے دوبارہ کاغذات سنبھالے اور حساب لگانا شروع کیا۔ اندراج شدہ دس سال کے بعد کی جو سب سے آخری رقم بنتی ہے، وہ ایک کاغذ پر لکھی...... دس ہزار اور باقی ایک ایک ہزار والے سرٹیفکیٹس کی مجموعی رقم تقریباً 44 ہزار اور تین سو بنتی تھی۔ یہ حساب لگانے کے بعد ماتحت نے اپنے انچارج کو دیکھا۔

''سر! دفتر میں اتنی رقم تو ہوگی؟''

سفید پوش انچارج نے اب کے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

''ہاں...... ہاں...... بالکل۔'' پھر ذرا سا وقفہ دے کر کہا۔ ''اب آپ دوسرے کاغذات تیار کردیں۔''

دونوں بھائیوں نے سکون کا طویل سانس لیا۔ چلو بالآخر لاٹری مل تو گئی اور بڑے بھائی کے تنے ہوئے اعصاب پرسکون ہونے لگے کہ ساری رقم ڈوبی تو نہیں۔

دفتر میں ایک مختصر پیمانے کی ہلچل برپا ہوگئی۔

انچارج نے جلدی جلدی رقم نکلوانے کا بندوبست کرنا شروع کردیا۔ ماتحت نے کچھ اور کاغذات ایک جگہ جمع کرنے شروع کردیے اور ایک اور اہلکار نے کھاتے کو کھولا، کچھ جمع تفریق کی پھر سرٹیفکیٹس کو لاکر کہا۔

''ان پر دستخط کردیجیے۔''

چھوٹے بھائی نے جلدی جلدی ان پر اپنے دستخط ثبت کردیے کہ چلیے یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ اہلکار اپنی میز تک جاکر پھر واپس آیا۔

''جناب ذرا دیکھیے گا، آپ کے دو تین اندراجات ابھی باقی رہ گئے ہیں۔ اکثر لوگ باہر گئے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کا یہاں پر کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا۔''

''ہاں...... یہی کچھ تو ہمارے ساتھ بھی ہوا تھا۔'' چھوٹے بھائی نے کہا۔ ''ہم امریکا ہی میں رہتے ہیں، وطن کافی دنوں بعد آنا ہوتا ہے اور ان کاغذات کے بارے میں تو تقریباً بھول ہی گئے تھے۔''

انچارج نے کاغذات الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

''اصل میں آپ لوگوں کے لیے اب ان پیسوں کی اہمیت بھی تو نہیں رہی۔ یہ تو آپ یہاں والوں سے پوچھیں، وہ تو اس کی مدت ختم ہونے کے دن گنتے رہتے ہیں تاکہ رکے ہوئے کاموں میں لگاسکیں۔ آخر مہنگائی بھی تو بہت ہوگئی ہے۔''

اس کے لہجے میں گہرا تفکر سمٹ آیا تھا۔ گویا وہ خود اپنے الفاظ کے آئینے میں خود اپنے آنے والے دنوں کو دیکھ رہا تھا۔

یہ دوستانہ انداز میں باتیں بھی ہوتی جارہی تھیں اور کاغذی کارروائی بھی جاری تھی۔ پھر انچارج نے سرٹیفکیٹس کی خریداری کے وقت پرانے دستخط اور ان سرٹیفکیٹس پر نئے دستخطوں کا موازنہ کیا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری۔

''بھئی واہ۔ بہت پکے دستخط ہیں آپ کے، ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ تیرہ سال پہلے اور اب کے دستخطوں میں کوئی فرق نہیں ہے ورنہ عام طور پر لوگوں

کے دستخط تبدیل ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہم کو اندازہ تو رہتا ہے کہ متعلقہ فرد وہی ہوگا، مگر دستخط ملانا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ پھر ہم ان لوگوں سے کئی بار دستخط کرواتے ہیں کہ کوئی ایک دستخط ہی پہلے والے ریکارڈ کے دستخط سے مل جائے۔ مجبوراً کبھی کبھی تو پرانے دستخط دکھلانا پڑ جاتے ہیں کہ اس کی نقل کر لیں۔ آخر ان میں کتنے تو ضعیف بھی ہو چکے ہوتے ہیں اور ہمیں ان کی ضروریات کا اندازہ بھی رہتا ہے۔ مہنگائی کے حساب سے آمدنیاں تو نہیں بڑھی ہیں۔ آخر آپ ہم لوگوں ہی کو دیکھ لیں۔ ڈاک والوں کی تنخواہیں بھی آج کل کے حساب سے پیچھے ہیں۔ پانچ چھ ہزار روپے میں ایک گھر کیسے چل سکتا ہے۔'' وہ گویا اظہار خیال کرتے کرتے خود کلامی کی دنیا میں جا نکلا تھا۔

''سچ کہتے ہیں آپ۔'' بڑے بھائی نے تائید کر کے سفید پوش انچارج کو اس کے خیالات کی دنیا سے نکالا اور اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''اس مہنگائی کے زمانے میں تو بہت ہی مشکل ہے۔''

انچارج اب اپنی میز پر بیٹھا رقم گن رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ والی میز پر ایک اہلکار کھاتے میں اندراج میں لگا ہوا تھا اور اس کے سامنے کی طرف کا ماتحت اپنے کاغذات مکمل کرنے میں مشغول تھا اور ان سب کے درمیان پڑی بنچ پر بیٹھے دونوں بھائی ان تمام مراحل کو طے ہوتے دیکھ رہے تھے۔

معلوم یہی ہوتا تھا کہ چند منٹوں کی بات اور ہے پھر یہ کام مکمل ہو جائے گا اور دونوں رقم لے کر اپنے گھر کا رخ کریں گے۔

شور یکا یک جیسے سناٹے میں ڈوب گیا۔ تمام آوازیں تھم گئیں، ایک سکوت سا چھا گیا، ہر حرکت رک گئی۔ بابوؤں کے قلم اور چھت پر متحرک پنکھے تک جیسے اپنی جگہ ٹھہر گئے۔

انچارج سارے کتاب کر کے اندراجات کر رہا تھا۔ اچانک وہ لکھتے لکھتے رک سا گیا پھر چونک پڑا۔ پھر رک کر کھاتے دیکھنے لگا۔

چند لمحے پھیل کر منٹوں پر محیط ہوئے اور پھر ایک ایک منٹ گھنٹوں کے برابر لگنے لگا تو دونوں بھائی بھی چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک ہی خیال بیک وقت دونوں کے ذہنوں میں آیا۔ اب پھر کوئی نئی آزمائش؟ پھر نظروں کے تبادلے سے طے ہوا کہ اس وقت کوئی بات چھیڑنا مناسب نہیں ہے، خاموشی ہی بہتر ہے۔ خاموشی کی بسیط چادر ہر سو محیط ہوتی چلی گئی۔

انچارج اب پہلے سے زیادہ گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا۔ کھاتا سامنے کھلا رکھا تھا۔ نگاہیں اس کے کھلے صفحات پر سرٹیفکیٹس کے ساتھ ہیں اور وہ ان سب سے دور، کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ قطعی لاتعلق اور خاموش سا۔

وہ سرٹیفکیٹس بار بار اٹھاتا، ان کے نمبر غور سے پڑھتا اور پھر خیالات کی کوئی نامعلوم اور غیر محسوس سی رو اسے کہیں بہالے جاتی۔ کیلکولیٹر پرنت نئے ہندسے ابھرتے، ڈوبتے۔ مشین بند کر دی جاتی پھر اٹھالی جاتی، پھر نئے ہندسے طلوع و غروب ہونے لگتے۔

اب افسر اور ماتحت بھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک ایک گتھی سلجھ گئی تھی تو اب کون سا الجھاوا باقی تھا۔ اسے احساس ہی نہیں رہا تھا کہ اس کے افسر اور سینئر سمیت دونوں بھائی اس کی طرف توجہ سے دیکھ رہے تھے اور وہ حساب جوڑ رہا تھا۔ ڈوب رہا تھا اور ابھر رہا تھا۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس سمندر میں غوطہ زن ہے، لہریں لمحہ لمحہ اسے ساحل پر لاتیں پھر واپس گہرے پانیوں کی سمت بہالے جاتیں۔

خاموشی کا وقفہ بہت طویل ہو گیا تو دونوں بھائیوں نے بے چینی سے پہلو بدلے۔ ایک دوسرے کو پھر معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ افسر نے اپنی میز سے آواز دینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ جیسے کسی احساس نے انچارج کو چونکا دیا۔ وہ پھر حال میں واپس آ گیا۔ سر جھٹک کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ معذرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دونوں بھائیوں کو دیکھا، ذرا ہچکچایا، اٹک سا گیا۔ رکا، کچھ سوچنے لگا پھر سر اٹھایا۔ اس کے اندر جو ایک جنگ برپا تھی، وہ صرف اس کے علم میں تھی۔ صرف اس کے چہرے پر آتے جاتے تاثرات اور بدلتے رنگ ایک کہانی سنا رہے تھے کہ کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے۔ ایک

طرف وہ اور اس کے وہ دونوں ساتھی تھے، جنہوں نے باہم مل کر جلدی جلدی سارا کام تقریباً مکمل کر دیا اور دوسری طرف...... اس کا اپنا ضمیر تھا۔ پلڑا کبھی ان تینوں کو بھاری ہوتا اور کبھی اس انجانے ضمیر کا، جو سوالیہ نشان بن کر اس کے ذہن میں آجاتا کہ تم اب کیا کرنے جارہے ہو۔ ہاں، اس پردیسی کے لیے تو یہ لاٹری ہے، وہ تو ویسے ہی خوش ہو جائے گا۔ ادھر ہم تینوں بھی خوش ہو جائیں گے۔ ایسا معاملہ روزانہ تو آتا نہیں ہے۔ یہ تو قسمت کی طرف سے ہوا ہے، کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔ پردیسی تو ویسے ہی باہر چلا جائے گا۔ اس کے بھائی کو ایسا کوئی خیال بھی نہیں آئے گا۔ وہ تو اسی بات پر خوش ہے کہ اس کو کوئی اور دشواری پیش نہیں آئی تو اب...... تو اب......؟

بڑے بھائی کے آواز دینے پر وہ ایک بار پھر چونک پڑا، اس نے مرتبہ پھر سر جھٹکا اور گہرا سانس لیا۔

''نہیں...... بات کچھ نہیں ہے۔'' اور پھر رک سا گیا۔ ایک اور وقفہ گزرا۔ خاموش اور بوجھل وقفہ...... اس نے آنکھیں بند کیں اور گویا بند آنکھوں سے دور کہیں کا منظر دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ پھر سے کہنا شروع کیا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ......'' وہ پھر رکا۔

''اب بھی موقع ہے۔'' شیطان نے سرگوشی کی۔

''بات پلٹ دو، ان لوگوں کو تو بالکل بھی اندازہ نہیں ہوسکتا۔'' لیکن سامنے ضمیر سینہ تان کر آن کھڑا ہوا تھا۔

''میرے ہوتے ہوئے ایسا نہیں ہوسکتا۔'' سفید پوش انچارج نے اپنے سامنے کھڑے ضمیر کو دیکھا اور ہتھیار ڈال دیے۔ آخر ضمیر نے جنگ جیت لی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں خود اپنے ساتھیوں سے سچ سچ بات کہہ دوں گا۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

''آپ...... آپ لوگوں کو اور زیادہ پیسے ملیں گے۔''

پھر ایک اور خاموشی کا بھاری بوجھلا ور طویل وقفہ...... یا شاید ان ہی دونوں کو محسوس ہوا۔ دونوں بھائیوں کی نظریں پھر باہم ملیں، ان میں تعجب ہی تعجب تھا۔ ادھر کے افسر اور ماتحت کی نگاہیں بھی ملیں، تعجب ان میں بھی تھا لیکن یہ بہت ہی معنی خیز تعجب تھا۔

مگر خاموشی ہی سب کی پردہ دار تھی۔

بڑے بھائی نے اپنے تعجب کا اظہار کر ہی دیا۔

''صاحب! کیا قصہ ہے؟''

انچارج نے ان دونوں پر، پھر اپنے افسر اور ساتھی ماتحت پر ایک نظر ڈالی۔ اب وہ ایک دوسرے ہی...... بالکل بدلا ہوا انسان نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات اس وقت تھے، وہ پہلے نظر ہی آئے تھے، اب وہ ایک فاتح سپاہی کی مانند لگ رہا تھا۔ اس نے صاف اور واضح آواز اور لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''آپ لوگوں کے پیسے اس دوران بھی بڑھتے ہی رہے ہیں، ابھی میں نے دوبارہ نئے سرے سے جو حساب کتاب کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ جو زائد مدت ہوگئی ہے، اس زائد مدت کا بھی فائدہ آپ لوگوں کو ملے گا اور اس طرح یہ رقم اب 78 ہزار اور چھ سو کے لگ بھگ ہوگئی ہے۔''

خاموشی کی بھاری چادر اچانک پھٹ گئی اور آوازوں کا شور سیلاب کی طرح بڑھا اور اس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چھت کے پنکھے بھی اچانک ہی پوری رفتار سے حرکت میں آگئے۔ زندگی یکایک ہی جاگ پڑی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ دونوں بھائی مسکرانے لگے۔

کاغذی کارروائی دوبارہ نئے سرے سے شروع ہوگئی۔ افسر نے تجوری سے مزید رقم نکالنا شروع کردی۔ گھنٹوں کا کام منٹوں میں طے ہوگیا۔ لاٹری اب اور بڑی لاٹری ہوگئی تھی۔ دفتر سے نکلتے وقت دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ گھوم کر اس سفید پوش انچارج کی طرف دیکھا، وہ بھی ان ہی کی طرف دیکھ رہا تا بلکہ اس کے افسر اور ماتحت بھی۔ ایک خاموش خیال دروازے سے نکلتے ہوئے دونوں بھائیوں اور ان سب لوگوں کے ذہنوں میں بجلی کی طرح کوند گیا تھا۔

''ایک بھائی نے لاٹری جیت لی تھی اور وہ اس کے اور اس کے بھائی کے اندازے سے بھی بڑی لاٹری تھی، لیکن ڈاک خانہ کے سفید پوش ملازم نے بھی تو ایک لاٹری جیت لی تھی اور وہ یقیناً کہیں زیادہ بڑی تھی۔''

☆☆

صلہ شہادت

انور عنایت اللہ

دنیا کس قدر ترقی کرچکی ہے مگر کچھ لوگ اب بھی اپنی روایات سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہم اپنے اردگرد دیکھیں تو ہمیں بہت ہی کم لوگ ایسے نظر آئیں گے جو اپنی روایات اور اقدار کا خیال کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے شاید آپ سوچیں تو آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ اس کے لیے اس کہانی کو غور سے پڑھیں۔

دو شہیدوں کا ماجرا ایک وطن کی حفاظت کے لیے شہید ہوا اور دوسرا ان دیکھا وطن بنانے کی خاطر
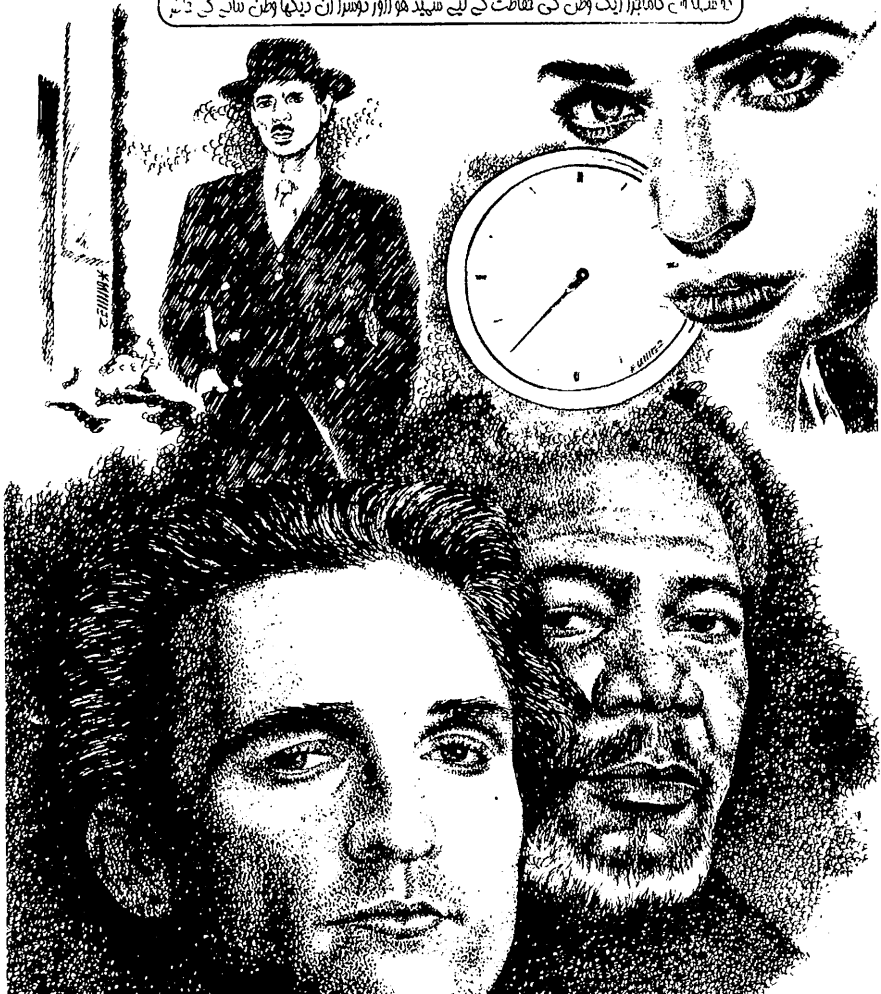
مجھے رات کے سناٹے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اتنا ہی جتنا کہ تنہائی سے۔ لیکن سناٹا ہے کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ تنہائی کا احساس ہے کہ ہر وقت مسلط رہتا ہے۔ اس روز نجمہ کی ماں سے ملنے کے بعد، گھر واپس آتے ہوئے مجھے بے حد ڈر لگا۔ ساڑھے آٹھ بجے تھے، رات تاریکی بھی۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے سڑکیں ویران ہوگئی تھیں اور میں کار میں تنہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں گھر پہنچا تو میری بیوی نے پوچھا۔

''بڑی دیر لگادی؟ کہاں چلے گئے تھے؟'' اس نے میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔

''قائد آباد گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

اس پر اس نے مجھے عجیب نگاہوں سے یوں دیکھا جیسے جاننا چاہتی ہو کہ اس خراب موسم میں اس گندے علاقے میں جانے کی آخر کیا ضرورت پڑ گئی تھی چونکہ میں خاموش ہی رہا، اس لیے اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں ہوئی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب قائداعظم کے مزار پر اتنا عظیم الشان مقبرہ تعمیر نہیں ہوا تھا۔ بابائے قوم شہر کے ایک پرسکون علاقے کی اونچی سی پہاڑی پر ایک شامیانے کے زیر سایہ سینکڑوں جھگیاں آباد تھیں۔ گندے، تنگ و تاریک جھونپڑے، جن میں ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے بستے تھے۔

''آج پھر ارشد غائب ہے؟'' میں نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اچانک پوچھا۔

''آجائے گا۔ جوان بیٹا ہے، اتنی پابندی اچھی نہیں۔ یہ کباب لو۔ میں نے خود بنائے ہیں۔'' اس نے کباب میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد اس نے اپنے لاڈلے بیٹے کے بارے میں کچھ پوچھنے کا موقع نہیں دیا اور وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر تک ہم ریڈیو سنتے رہے، پھر وہ سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ غالباً اسے بہت نیند آرہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا، چلو اچھا ہوا ورنہ میں اس کی موجودگی میں ارشد سے کھل کر باتیں نہ کرسکتا تھا۔

نو سے دس بجے اور پھر دس سے بارہ، لیکن وہ نہیں آیا۔ تقریباً سوا بارہ بجے پہلے مجھے اس کے اسکوٹر کی آواز سنائی دی پھر چند لمحے بعد قدموں کی چاپ۔ وہ بڑی احتیاط سے چل رہا تھا۔ وہ جوں ہی اندر آیا، میں نے ذرا تیز آواز میں کہا۔

''دروازہ اچھی طرح بند کرو۔ ہوا سے کھل جاتا ہے۔'' میری آواز سن کو وہ بری طرح سے چونک گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ اتنی رات گئے میں اسے ڈرائنگ روم ہی میں ملوں گا۔ میری آواز اور لہجے سے اسے میری خفگی کا احساس ہوگیا تھا۔ اس لیے اس نے خاموش ہی رہنا بہتر سمجھا اور دروازہ اچھی طرح بند کرنے کے بعد وہ برآمدے کی طرف مڑا تو میں نے درشتی سے پوچھا۔

''کہاں تھے اب تک؟ بارہ بجے محلہ سنسان ہوجاتا ہے۔''

''زاہد کے یہاں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''وہاں کیا ہو رہا تھا؟ توڑ پھوڑ کی کسی نئی مہم کی تیاری؟''

''جی......جی نہیں۔'' اس نے کہا۔

''ایک میٹنگ تھی۔ کالج میں الیکشن ہونے والے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اندر جانے کے لیے ایک بار پھر مڑا۔

''شام کا اخبار دیکھا؟'' میں نے پوچھا۔ اس پر وہ رک گیا۔

''جی نہیں...... کوئی خاص بات ہے؟'' اب کے اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''ہاں، اس جلوس کا آنکھوں دیکھا حال ہے جسے نوجوانوں نے نکالا تھا۔ رسل لائبریری کی تصویر ہے۔ اس میں سے آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ سب آپ مجھے کیوں سنا رہے ہیں؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''اس لیے کہ پولیس کو ان تمام تخریبی عناصر کی تلاش ہے جنہوں نے شہر میں ہنگامے کرائے۔'' غصے میں میری آواز غالباً تیز ہوگئی، کیونکہ دوسرے ہی لمحے میری بیوی آگئی۔

''خدا کے لیے آہستہ بولو۔ کیا سارے محلے کو جگاؤ گے؟'' اس نے ناگواری سے کہا۔

”محلے والوں کو میں کیوں جگاؤں؟ یہ کام تو آپ کے صاحبزادے کر ہی چکے ہیں۔ آدھی رات کو اسکوٹر پر یوں دندناتے آتے ہیں جیسے محلہ ان کی جاگیر ہو۔“ میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ فوراً بیٹے کی حمایت کرے گی۔ جب سے ہمارا بڑا بیٹا مشرقی پاکستان کی سرحد پر شہید ہوتھا وہ ارشد کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی لیکن آج خلاف توقع اس نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ صرف بیٹے کا بازو پیار سے تھام لیا اور بولی۔

”جاؤ بیٹے......ہاٹ کیس میں کھانا رکھا ہے، کھالو۔“

اس کی اس حرکت پر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ ارشد بھی خاصا جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے پہلے اپنی امی کو اور پھر مجھے گھور کر دیکھا۔ داہنے ہاتھ سے سر کے بے ہنگم بال درست کیے اور تیزی سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی میری بیوی میرے پاس آئی۔

”تم واقعی اب سٹھیا گئے ہو۔ جوان بیٹے کو یوں ڈانٹتے، جیسے وہ دودھ پیتا بچہ ہو۔ وہ زمانہ گیا جب والدین اولاد کو گائے بیل کی طرح جس طرف چاہتے ہانک دیا کرتے تھے۔ اگر لڑکوں کو کوئی بات بری لگی اور انہوں نے جلوس نکالا اور پرشور احتجاج کیا تو ایسی کون سی قیامت آ گئی؟“ اس نے پوچھا۔

”صرف پرشور ہی نہیں، پرتشدد بھی تھا ان کا احتجاج۔ جس کے نتیجے میں کئی لاکھ کا نقصان ہوا۔ علم و دانش کا ایک مرکز تباہ ہوگیا۔ شہر کے کئی علاقے روشنی سے محروم ہوگئے۔ تمہاری ایسی ہی بے جا حمایت نے اس کا ستیاناس کیا ہے۔“ میں نے غصے میں جواب دیا۔

”اچھا......اچھا بابا۔ میں نے ہی ستیاناس کیا، اب غصہ تھوک دو اور چل کر سو جاؤ۔ صبح خوب ڈانٹ لینا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ مجھے زبردستی خواب گاہ تک لے گئی اور بستر پر یوں لٹا دیا، جیسے میں اکسٹھ سالہ بوڑھا نہیں، معصوم بچہ ہوں۔ اس کے مجبور کرنے پر میں لیٹ گیا لیکن نیند آنکھوں سے غائب ہوگئی۔ جب کروٹیں لیتے ہوئے خاصی دیر ہوگئی تو میری بیوی نے آہستہ سے پوچھا۔

”کیا پولیس واقعی ارشد کو پکڑ کر لے جائے گی؟“

”ہوسکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ان لوگوں کی حرکتیں ہی ایسی تھیں۔“

اس پر اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ چند لمحے خاموش رہی۔ میں نے ایک بار پھر کروٹ لی تو اس نے پوچھا۔

”نیند نہیں آ رہی ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”آ بھی کیسے سکتی ہے؟ لگتا ہے زندگی کے آخری دن ہمیں تنہا گزارنے ہوں گے۔ ایک بیٹے کی قربانی تو دے ہی چکے ہیں، اب شاید دوسرے کی باری ہے۔“ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا، جیسے اسے بھی تنہائی سے بڑا ڈر لگتا ہو۔

”پاگلوں کی سی باتیں نہ کرو۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”پاگل ہونے میں اب رہ کیا گیا ہے؟ دعا دیتی ہوں انگریز کو، جس نے جاتے جاتے ایسی جنت بخشی کہ قیامت تک ہم جی کا چین ہی ڈھونڈتے رہیں گے۔“ اس کا لہجہ بڑا اداس تھا۔

”انگریزوں نے نہ بخشی رضیہ!“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”قوم نے ان گنت قربانیاں دے کر حاصل کی تھی۔ ان لاکھوں مسلمانوں کو بھول گئیں جو پاکستان کی راہ میں شہید ہوئے تھے؟ خون کے اس دریا کو بھی بھول گئیں جو برصغیر کے کئی علاقوں میں بہا تھا، جسے پار کرکے ہم نے یہ ملک بنایا تھا؟ کیا اس لیے کہ ہماری ناعاقبت اندیش، گمراہ، سرکش اولاد اسے تباہ کردے؟ نہیں رضیہ! جب تک میری بوڑھی ہڈیوں میں دم ہے، میں یہ ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔“

”کیا کرلو گے تم تنہا؟“ اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے کا طنز واضح تھا۔

”پچھلے سال میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے شہید بیٹے کو دفن کیا تھا۔ اگر ضرورت پڑی تو خدا کی قسم! اپنے ہی ہاتھوں اس سرکش بیٹے کو بھی دفن کردوں گا۔ جس کا وجود ملک وملت کے لیے خطرناک بن جائے۔“

میں نے فوراً جھنجلا کر جواب دیا۔ جذبات کی شدت میں مجھے یہ یاد نہ رہا کہ میری بیوی دل کی مریضہ ہے اور مجھے اس سے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔ مجھے اس کی سسکیاں بھی اس وقت سنائی دیں، جب خاصی دیر بعد میرا غصہ سرد ہوا۔ وہ ہولے ہولے رو رہی

تھی۔ اس کی سسکیاں بن کر میں نے اپنے آپ کو بے حد ذلیل محسوس کیا۔ خدا جانے میں نے یہ کیسے بھلا دیا تھا کہ وہ سہیل، میرے شہید بیٹے کی ماں تھی، جسے ہم سے بچھڑے ہوئے صرف ایک سال ہوا تھا۔

''مجھے معاف کردو رضیہ!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''آج تم نہیں بلکہ میں ہوش میں نہیں ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر سگریٹ کیس نکالا اور سگریٹ سلگایا۔ پھر ایک طویل کش لے کر آہستہ سے کہا۔

''تمہیں اس کی حمایت کا پورا حق ہے لیکن رضیہ! تم ان ماؤں کے بارے میں بھی کیوں نہیں سوچتیں جن کے بیٹے تمہارے بیٹے کی لگائی ہوئی آگ کا شکار ہو گئے؟''

''کیا آج کچھ جانیں ضائع ہوئیں؟'' اس نے ہچکچاتے ہوئی پوچھا۔

''ہاں دو معصوم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایک پولیس کا سپاہی بھی مر گیا۔ آخر وہ بھی کسی ماں کا بیٹا تھا رضیہ! اسے تم کیا کہو گی؟ شہید ہی نا؟''

''کمال کرتے ہو۔'' اس نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''اب تم تو ہر ایک کو شہادت کا رتبہ بخشنے پر تل گئے ہو۔''

''ہر ایک سوچ کا ڈھنگ علیحدہ ہوتا ہے رضیہ! اچھا ہوا آج شام کو یہاں سے جاتے ہوئے تم سے مشورہ نہیں کیا، ورنہ شاید تم مجھے ہرگز جانے نہ دیتیں۔''

یہ سنتے ہی وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کیا کیا تم نے؟ کہیں پولیس کو اطلاع تو نہیں دی کہ ارشد بھی اس جلوس میں شامل تھا؟ بتاؤ...... خاموش میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا کیا تم نے؟'' وہ تو جذبات کی شدت سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

''نہیں نہیں رضیہ! میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''پھر کیا کیا؟'' اس نے اسی رو میں پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی وحشت تھی۔

''میں نے تو صرف ایک صحیح حق دار کو اس کا حق ادا کیا۔'' میں نے جواب دیا۔

''خدا کے لیے پہیلیاں نہ بجھواؤ...... کہاں گئے تھے تم؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''کہا تھا نا...... قائد آباد گیا تھا۔''

''کس کے گھر؟''

''نجمہ کے گھر۔''

''نجمہ...... کون نجمہ؟'' اس نے پوچھا۔

''کہانی ذرا لمبی ہے۔ اگر نیند نہیں آ رہی ہے تو سنو، ورنہ پھر کل صبح سہی۔'' اس کی وحشت اپنی جگہ قائم تھی، میری طرح اس کی نیند بھی اڑ گئی تھی۔

''تمہیں یاد ہے، پچھلے سال تمہارے ڈھاکہ جانے سے پہلے میں نے ایک بار ایک غریب بچی کا ذکر کیا تھا، جو مجھے اکثر گرومندر کے بس اسٹاپ پر نظر آیا کرتی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں یاد ہے...... وہی نا جسے تم نے ایک دن گھر بھی پہنچایا تھا؟'' اسے یاد آ گیا۔

''ہاں وہی...... نجمہ نام تھا اس کا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں دفتر جاتے ہوئے روزانہ وہاں سے گزرتا۔ پہلے دن جب میں نے اسے دیکھا تو وہ بڑی تیزی سے مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ آٹھ نو سال کی عمر ہو گی۔ دبلی پتلی تھی۔ ناک نقشہ اچھا تھا۔ کسی اچھے گھر کی لگتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا بڑا سا تھیلا تھا جس میں بہت سی کتابیں اور کاپیاں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ بس میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اس لیے وہ رکی نہیں، آگے بڑھ گئی اور وہ لڑکی فٹ پاتھ ہی پر رہ گئی۔ بس کے آگے بڑھتے ہی لڑکی نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا، جیسے اسے دوسری بس کا شدت سے انتظار ہو۔ دن خاصا چڑھ گیا تھا اور دھوپ تیز تھی۔

دوسرے دن بھی میں نے اسے بالکل اسی حالت میں دیکھا، مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ اس کے بعد میں اسے تقریباً ہر روز بس اسٹاپ پر ہی اسی طرح ہاتھ میں وزنی تھیلا اٹھائے، دھواں اڑاتی بسوں کے پیچھے بھاگتے دیکھتا۔ عموماً اسے دیکھ کر میری کار کی رفتار تیز ہو جاتی۔ میں اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا اور اپنے ذہن سے اس کی پریشان کن تصویر مٹانے کی کوشش کرتا۔ ایک دن

دوپہر کو دفتر سے گھر واپس جارہا تھا۔ میری کار برنس روڈ سے گزر رہی تھی کہ وہ مجھے نظر آ گئی۔

گرمیوں کے دن تھے اور دھوپ خاصی تیز تھی۔ تقریباً تین بجے تھے اور بسوں کا وہی حال تھا۔ عورتیں اور بچے تک لٹک کر ہچکولے کھاتی بسوں میں سفر کررہے تھے اور ان گنت خالی موٹریں ایک شان بے نیازی سے ادھر اُدھر آجارہی تھیں۔ مجھے اس بچی کو چلچلاتی دھوپ میں پریشان کھڑا دیکھ کر بے حد تکلیف ہوئی اور میں نے کار اس کے پاس روک کر اسے ساتھ لے جانے کی پیش کش کی۔ پہلے تو اس نے انکار کردیا پھر شاید میرے سفید بالوں اور وضع قطع کو دیکھ کر راضی ہوگئی اور چپ چاپ کار میں آ گئی۔ جب وہ بیٹھ گئی تو میں نے دیکھا کہ اس کے کپڑے پسینے سے تر تھے۔ وہ غالباً کسی سرکاری اسکول میں پڑھتی تھی کیونکہ اس کا ڈھیلا ڈھالا یونیفارم ہلکے نیلے رنگ کا تھا جو بار بار گھر میں دھوئے جانے کی وجہ سے مٹیالا ہوگیا تھا۔ اس نے کٹھے کی شلوار پہن رکھی تھی اور پیروں میں ربڑ کی چپل تھی۔ کچھ دیر تک سفر خاموشی سے گزرا پھر اس نے کہا۔

''مجھے قائد اعظم کے مزار کے پاس اتار دیجیے۔''

''اچھا......'' میں نے جواب دیا۔ ''کس کلاس میں پڑھتی ہو؟''

''چھٹی میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں روزانہ صبح آٹھ بجے گرومندر کی طرف سے گزرتا ہوں۔ تم چاہو تو تمہیں اسکول تو لاسکتا ہوں۔'' میں نے سڑک پر نظریں جمائے کہا۔

''جی نہیں ...... بہت بہت شکریہ۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''سمجھا شاید مجھ سے ڈر لگتا ہے، لیکن ڈرو نہیں۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ میرے بھی بچے ہیں۔ ایک بیٹا فوج میں کپتان ہے اور دوسرا کالج میں پڑھتا ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''جی، یہ بات نہیں ہے۔ امی کہتی ہیں کسی غیر مرد سے کسی قسم کی مدد نہ لوں۔'' اس نے وضاحت کی۔

''اچھا...... سمجھا...... فرض کرو میں اپنا نام اور پتا بتادوں اور تمہارا نام اور پتا پوچھ لوں تو پھر ہم غیر نہیں رہیں گے نا؟'' میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ اس پر وہ مسکرانے لگی۔ اسے شاید میری بات اچھی لگی تھی۔

وہ سردی، گرمی، برسات روزانہ مسافروں سے لدی بسوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک گئی تھی۔ اس لیے وہ راضی ہوگئی اور طے ہوا کہ وہ مجھے صبح کو بس اسٹاپ پر مل جایا کرے گی۔ اس طرح ہمارا تعارف ہوا۔ جب ہم نمائش کے قریب پہنچے تو میں نے پوچھا۔

''تمہارے ابا کیا کرتے ہیں؟''

''جی وہ تو مرگئے...... اب تو بہت دن ہوگئے۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے بے حد افسوس ہوا...... یہیں انتقال ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں، ہندوستان میں...... پہلے ہم وہیں رہتے تھے۔ میں بہت چھوٹی تھی۔ شہر میں پاکستان حاصل کرنے کے لیے ایک بڑا جلوس نکلا۔ امی کہتی ہیں، میرے ابا سب سے آگے تھے۔ ان کے ہاتھ میں سبز پرچم تھا۔ جلوس پر دشمنوں نے حملہ کیا۔ پہلی گولی میرے ابا ہی کے سینے میں لگی اور وہ وہیں مرگئے۔''

اس کی باتیں سن کر میری روح کانپ گئی اور میں نے فوراً کہا۔

''نہیں بیٹی...... وہ مرے نہیں، شہید ہوئے تھے۔''

اس پر وہ بولی۔

''پہلے امی یہی کہا کرتی تھیں، لیکن یہاں سب سے مذاق اڑانا شروع کردیا۔''

''مذاق؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا کہتے تھے سب؟''

''کہتے تھے شہید وہ ہوتا ہے جو ملک کے لیے مرتا ہے۔ اس وقت تو مسلمانوں کا کوئی ملک نہیں تھا، اس لیے وہ شہید کیسے ہوسکتے ہیں؟ امی نے پہلے تو یہ ماننے سے انکار کردیا، لیکن پھر انہیں ماننا ہی پڑا۔ جب اتنے بہت سے لوگ ایک ہی طرح کی باتیں کرتے ہیں تو ٹھیک ہی کرتے ہوں گے۔'' اس نے یوں کہا

جیسے اسے بھی یقین آ گیا ہو کہ اس کا باپ شہید نہیں ہوا تھا۔

کیسی ستم ظریفی تھی یہ...... میں نے سوچا جنگ آزادی کے ایک سورما کی معصوم بچی سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی تھی اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں تھا اور تو اور کوئی اس کے باپ کو شہید ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ کیا شہادت کے بعد شہداء کی آل اولاد کا یہی حشر ہوا کرتا تھا؟

''مہربانی کر کے گاڑی یہیں روک دیجیے۔'' یکایک اس نے کہا تو میں چونک گیا اور میرے خیال منتشر ہو گئے۔ اب ہم قائداعظم کے مزار کے قریب تھے۔

''یہاں کیوں؟ میں گھر تک پہنچائے دیتا ہوں۔'' میں نے کار کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں، شکریہ۔ ہماری گلی بہت گندی ہے، ویسے بھی وہاں تک موٹریں نہیں جاتیں۔ آپ کی موٹر وہاں نظر آئے گی تو بڑی بری بات ہوگی۔''

اس نے مجھے سمجھایا اور میں نے سوچا ظالم وقت نے ننھی سی جان کو کتنا سمجھ دار بنا دیا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ چنانچہ میں نے کار روک کر اسے وہیں اتار دیا اور وہ اپنا بھاری تھیلا اٹھائے اس تنگ گلی میں مڑ گئی جو قائدآباد کی جھگیوں تک جاتی تھی۔

اس کے بعد روزانہ ہم ملنے لگے۔ صبح کو میں اسے برنس روڈ تک لے جاتا اور پھر دوپہر کو دفتر سے واپسی پر اسے قائداعظم کے مزار تک پہنچا دیتا جہاں سے وہ پیدل چلی جاتی۔ بہت جلد وہ مجھ سے گھل مل گئی اور مجھے پتا چلا کہ اس کے والد مسلم لیگ کے بڑے سرگرم رکن تھے اور یہ کہ نجمہ اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ گھر کا سارا کام کاج کرتی تھی۔ اس کی ماں پڑھی لکھی خاتون تھیں، لیکن یہاں جب کوئی معقول ملازمت نہیں ملی تو وہ کسی انڈسٹریل ہوم میں کام کرنے لگیں۔ اس سے گستم پشتم گزارا ہو رہا تھا۔

اس کی معصوم باتیں سن کر اکثر مجھے یوں محسوس ہوتا، جیسے خدا نے بڑھاپے میں ایک پلی پلائی بیٹی دے دی ہے۔ اس زمانے میں رضیہ! تم مشرقی پاکستان میں تھیں اور ارشد لاہور میں۔ تم لوگوں کی کمی کو میں نجمہ کے قرب سے پوری کرنے کی کوشش کرتا۔''

کہانی یہاں تک پہنچی تھی کہ مجھے دوبارہ سگریٹ کی طلب ہوئی۔ میں نے جب تک سگریٹ سلگایا۔ میری بیوی بے چینی سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

''مجھے بھی اس بچی سے دلچسپی ہو گئی ہے۔ اب تو ہمیں آئے ہوئے تین مہینے ہو گئے۔ تم اسے کیوں نہیں لائے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سگریٹ کے کئی طویل کش لیے۔ میری خاموشی نے اسے اور بے چین کر دیا۔

''کیا نجمہ کو کچھ ہو گیا؟ لگتا ہے ضرور کچھ ہو گیا...... تمہاری یہ خاموشی...... یہ ہچکچاہٹ...... بتاؤ نا اس کے بعد کیا ہوا؟'' اس نے پے در پے کئی سوالات کر دیے۔

''سنا تو رہا ہوں۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''تقریباً چار مہینے پہلے کی بات ہے، ایک روز دفتر میں مجھے دیر ہو گئی۔ کام کچھ اس قدر زیادہ تھا کہ مجھے سوا تین بجے نجمہ یاد آئی۔ میں نے فوراً کمرہ بند کروایا، تیزی سے کار نکالی اور اس کے اسکول کی طرف روانہ ہوا۔ اس دن خلاف معمول سڑکوں پر بہت زیادہ ٹریفک تھا۔ میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے ساڑھے تین بج گئے۔ دور سے میں نے دیکھا، وہ میرے انتظار سے اکتا کر ایک بس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کتابوں کا بھاری تھیلا تھا اور دوسرے سے وہ ایک رینگتی ہوئی بس میں چڑھنے جا رہی تھی۔

مجھے بورڈ پر بہت سی لڑکیاں اور عورتیں بھی نظر آئیں۔ اس لیے میں نے چیخ کر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہاں شور وغل اتنا تھا کہ اسے میری آواز سنائی نہیں دی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اچھل کر چڑھنے کی کوشش کی تو پاؤں فٹ بورڈ تک نہیں پہنچ سکا اور پلک جھپکتے وہ بس کے نیچے آ گئی اور ایک چیخ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔''

یہ سننا تھا کہ میری بیوی کے منہ سے ہلکی سی چیخ

نکل گئی۔
"ہائے...... تم نے کچھ نہیں کیا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔
"وہاں کرنے کو دھرا ہی کیا تھا؟" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ یہ سن کر میری بیوی دوبارہ ہولے ہولے رونے لگی۔ میں چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔
"شام کو کیا تم اسی کے یہاں گئے تھے؟" اس نے چند لمحوں بعد روتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔
"پر اتنے مہینوں کے بعد...... مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟ اس کی ماں کس حال میں ہے؟" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں سوال کیے۔
"ایک بے یارو مددگار عورت کس حال میں ہوسکتی ہے؟" میں نے کہا۔ "پہلے تو زندہ رہنے کا جواز موجود تھا۔ اب تو وہ بھی نہ رہا۔ آج شام میں نے بڑی مشکل سے اس کا گھر ڈھونڈ نکالا کیونکہ وہاں تمام جھگیاں ایک سی ہیں۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ باہر آئی اور اس نے لالٹین اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا۔"
"فرمائیے؟" اس نے پوچھا۔
"معاف کیجیے، اس وقت زحمت دی۔ دراصل آپ سے فوراً ملنا تھا...... آپ نجمہ کی امی ہیں نا؟"
میرے سوال پر یوں لگا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں یا یہ کہ اب چہرہ جذبات سے عاری ہو گیا تھا۔ وہ مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اسے خاموش دیکھ کر میں نے خود ہی کہنا شروع کیا۔
"آپ مجھ سے واقف نہیں، لیکن نجمہ کے توسط سے میں آپ سے واقف ہوں۔ وہ مجھے بیٹی کی طرح عزیز تھی۔ میں جانتا ہوں آپ کے شوہر پاکستان کی خاطر شہید ہوئے تھے۔ ان کی بیوہ کو یعنی آپ کو ایک چیز دینی تھی، اس لیے آیا ہوں...... یہ لیجیے۔"
یہ کہتے ہوئے میں نے وہ لفافہ اس کے حوالے کر دیا جسے صبح سے میں جیب میں لیے پھر رہا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اسے اس کے صحیح حق دار تک پہنچاؤں۔ اس نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر لفافہ لے لیا۔ لالٹین نیچے رکھ دی اور اکڑوں بیٹھ کر لفافہ کھولا۔ اندر سے جو کچھ نکلا اسے پڑھ کر حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"چیک...... پچاس ہزار کا چیک؟ میرے نام۔" اس نے آہستہ سے یوں کہا جیسے اسے اپنی بینائی پر یقین نہ ہو۔
"یہ قیمتی سی رقم ہے...... میرا بھی ایک بیٹا تھا...... جوان، تعلیم یافتہ، فوج میں کپتان تھا۔ مشرقی پاکستان کی سرحد پر دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گیا۔ اس کا معاوضہ مجھے اور بہت سی چیزوں کے ساتھ اس کی رقم کی صورت میں ملا ہے۔ میں نے سوچا، میرا بیٹا تو ایک بنے بنائے ملک کی حفاظت میں شہید ہوا۔ ایسے لوگ بھی تو تھے جنہوں نے ایک ان دیکھا وطن بنانے کی خاطر اپنی جانیں قربان کی تھیں۔ آج انہیں کوئی نہیں جانتا، لگتا ہے ہماری تاریخ میں بھی انہیں کوئی جگہ نہیں ملے گی۔ ان میں سے صرف ایک سے میں واقف ہوں۔ نجمہ اکثر اپنے شہید ابو کی باتیں سنایا کرتی تھی۔ آج جب یہ رقم ملی تو میں نے سوچا۔ مجھ سے زیادہ اس عظیم شہید کی بیوہ اس رقم کی مستحق ہے۔ اس لیے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ خدارا قبول کر لیجیے اور مجھے غلط نہ سمجھیے۔ آج کے بعد آپ مجھے کبھی نہیں دیکھیں گی...... خدا حافظ!"
یہ کہتا ہوا میں تیز تیز قدموں سے قائداعظم کے مزار تک لوٹ آیا، جہاں میری کار کھڑی تھی۔
"میں نے ٹھیک کیا نا رضیہ؟"
میری بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ صرف ہولے ہولے روئے گئی۔
رات گہری ہو گئی ہے اور بادلوں کی وجہ سے بے حد تاریک ہے اور رضیہ کی سسکیوں کے باوجود ہماری خواب گاہ پر سناٹا مسلط ہے اور تنہائی کا احساس پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔

☆☆

تم زندگی سے بڑھ کر ہو

مسز نگہت غفار

محبت ہر کسی کا نصیب نہیں لیکن مل کر بچھڑ جانا نہایت اذیت ناک ہوتا ہے کیونکہ کبھی کبھی کشتی ساحل کے قریب بھی ڈوب جاتی ہے۔

دو پیار کرنے والوں کا فسانہ جنہیں وقت اور قسمت نے جدا کردیا تھا

''او منحوس ہمیشہ کی لیزی سست کاہل ہر وقت سوتی رہتی ہے۔ مجھے بلا کر پڑی ہے نحوست پھیلاتی بدذوق اس حسین، دلنشین، دلفریب، من کو گدگدانے والا سرور و مستی میں جھومتا ہوا عاشقانہ موسم ہو رہا ہے۔ ایسے میں کوئی پیارا سا اپنا اپنا سا چلبلا بندہ ہو اور ہم ہوں قسم سے موسم کا مزا دوبالا ہو جائے گا۔

''چل اٹھ۔''

اس نے زور سے کمبل کھینچ لیا۔ دوسرے ہی لمحے حواس باختہ ہوگئی۔ ایک ٹک گھورتا ہوا اشعر لبوں پر مسکان لیے بہت پیارا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ثمرہ کی کمزوری تھیں۔

''ہاں یار سچ کہتی ہو یہ ہی تو موسم ہے ہم جیسوں کے انجوائے کرنے کا ادھر آؤ۔'' اشعر نے کہا تو ثمرہ جگہ سے نہیں ہلی......

''میں کہہ رہا ہوں ادھر آؤ۔'' وہ ایک دم ڈر گئی۔ اشعر کے قریب چلی آئی۔ اشعر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا وہ بری طرح نروس ہوگئی۔

''چھوڑیئے ناں۔ کوئی دیکھ لے، یہ ہی کہے گا کہ دو پیار کرنے والے موسم کو انجوائے کر رہے ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے ثمرہ کے قریب جھکا اور ثمرہ تیزی سے ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تب ہی کاشف کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا ہو رہا ہے۔ کیا سوگ منایا جا رہا ہے۔ کون یاد آ گیا؟'' وہ جوتوں سمیت بستر پر گر پڑا اسی لمحہ ایک عجیب سے بھبک ثمرہ نے محسوس کی......

''کاشف آج پھر تم نے شراب پی ہے۔''

وہ ناگواری سے بیڈ سے اتر آئی۔

''ہاں تو پی ہے کون سا انوکھا کام کیا ہے؟ یہ تمہاری سوسائٹی نہیں مڈل کلاس کے لوگ......نہ کوئی ہلا گلہ، نہ دھما چوکڑی۔ یہاں اپر کلاس کے ہائی اسٹینڈرڈ کے لوگ رہتے ہیں یہاں پر ایسی باتیں کرنے والے کو بیک ورڈ اور جاہل کہا جاتا ہے۔ شراب پینا جوان لڑکے لڑکیوں کی فرینڈ شپ، کھلی آزادی کوئی بری بات نہیں......جاہل کہیں کی۔''

وہ شوہر سے زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کی کسی بات کا بھی اس پر اثر نہیں ہوتا۔

ابا جیت گئے تھے ان کا داماد کاشف بنا۔ اماں اس لیے ہاری تھی کہ مجیب کسی اور لڑکی کو چاہتا تھا۔ اس نے صاف لفظوں میں منع کر دیا مگر ابا جیت گئے۔

ابا بہت بیمار تھے اور ان ہی دنوں میں ستار خالو کے والد دوسرے شہر میں انتقال کر گئے تھے وہ سب لوگ وہاں گئے ہوئے تھے۔ بس خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ابا نے وقت آخر ثمرہ کا ہاتھ کاشف کے ہاتھ میں دے دیا اور لمحوں میں ثمرہ مسز کاشف بن گئی۔

بڑی خالہ خالو وہاں سے لوٹے تو یہاں ثمرہ پہ قیامت گزر گئی۔ ابا کا سایہ سر سے اٹھا اور قسمت نے تقدیر نے نصیب نے کیسے پینترا بدلا کہ ہنستی مسکراتی۔

شریر چلبلی سی ثمرہ کتنی سنجیدہ اور خاموش ہوگئی تھی۔

پھوپھا سارا دن بزنس میں رہتے پھوپھی سارا دن محلے میں گھومتی رہتیں، وہ اکیلی قسمت کو کوستی تقدیر سے لڑتی مقدر پر روتی اور اپنے سارے غم دکھ محرومیاں صرف اللہ سے شیئر کرتی۔

رات اور دن صبح و شام میں کوئی امنگ کوئی خوشی کوئی مسرت کوئی نیا پن نظر نہیں آتا۔ امیر باپ کی امیر اولاد بگڑی ہوئی اولاد نہ اماں کچھ کہتیں نہ ابا کچھ کہتے۔ ہاں کبھی کبھی پھوپا آفس بلا لیتے تو کاشف چلا جاتا۔ اتنا بڑا کاروبار حلیم صاحب خود سنبھالتے تھے۔ زرینہ بیگم کے اپنے نجانے کیا پروگرام سیٹ ہوتے۔ اس کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ شاید وہ سوشل ورک میں لگی رہتیں۔

اشعر نے گھر میں صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ اب شادی نہیں کرے گا۔ خالو کی موت نے ان پر کیسے غموں کے پہاڑ توڑ دیے تھے ان کو کیا خبر تھی کہ ادھر دادا ابو اور ادھر خالو کو سایہ سر سے ہٹے گا تو بالکل ہی تنہا رہ جائیں گے۔

ناشاد و ناکام ان کے دل کی ان کے من کی ان کی زندگی کی ہر خوشی، ہر تمنا، ہر آرزو یوں ناکام ہو جائے گی۔ انہوں نے ابا اور امی سے بات بھی کر لی تھی۔ دونوں راضی تھے۔ جس روز رشتہ لے کر ثمرہ کے گھر جانے والے تھے۔ اسی روز دادا ابو اس دنیا سے رخصت ہوئے اور چند ہی دنوں بعد خالو بھی چل بسے۔

جب وہ لوگ یہاں پہنچے تو ثمرہ...... کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آ گیا تھا...... وہ اب کسی اور کی ہو گئی تھی۔ اشعر کی محبت اشعر کی زندگی، اشعر کی خوشی سب ہی کچھ اشعر سے دور...... بہت دور چلے گئے تھے...... ان کے جذبات کا خون ہو چکا تھا۔ وہ کتنے بے بس اور مجبور ہو گئے تھے۔

آج اس کی طبیعت بہت گھبرائی تو اس نے ڈرتے ڈرتے پھوپھی سے پوچھا۔

''پھوپی جان ایک دو دن کے لیے امی کے پاس چلی جاؤں؟''

''ہاں! ہاں ضرور......'' وہ بولیں۔

''کاشف تمہیں چھوڑ آئے گا''، انہوں نے ناشتہ کرتے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''نہیں ماما! مجھے آج ضروری کام ہے میں نہیں جا سکوں گا۔'' اس نے بڑی بے نیازی سے انکار کر دیا۔

''اچھا...... بیٹا تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا۔ مجھے بھی میٹنگ میں جانا ہے حلیم بھی چند روز کے لیے کمپنی کے کام کے سلسلے میں اسلام آباد جا رہے ہیں۔''

انہوں نے ریسٹ واچ دیکھی۔

''او کے بائے۔'' انہوں نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ثمرہ تیار بیٹھی تھی کپڑوں کا بیگ اور پرس ہاتھ میں لیے وہ بیڈ روم سے باہر نکلی سامنے کاشف کھڑا تھا۔

''بابا سے کہہ دیں، وہ مجھے چھوڑ آئیں۔'' اس نے میلاں کو مخاطب کیا۔

وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی حلیمہ بیگم تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔ بیٹی کو گلے سے لگا کر بے اختیار رو پڑیں۔

''ثمرہ...... بیٹا اتنے دنوں بعد آئی ہے۔ میں تو تجھے دیکھنے کو ترس گئی تھی۔ سب تو ٹھیک ہے ناں...... زرینہ آپا نہیں آئیں۔'' انہوں نے پوچھا تو ثمرہ نے ان کی مصروفیات کے بارے میں بتایا۔

''باجی جلدی جلدی آیا کریں ہم لوگ بہت اکیلے ہو گئے ہیں۔'' اذکاء رو پڑی۔ ثمرہ نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔

''میری گڑیاں چندا...... تم آ جایا کرو ناں۔''

''تمہیں کس نے روکا ہے تم اور امی آ جایا کرو ناں......'' وہ بہت پیار سے اذکاء کے بالوں کو سنوارتے ہوئے بولی تو حلیمہ بیگم نے کہا۔

''بیٹی کے گھر بار بار جانا اچھا نہیں لگتا بیٹا۔''

''اچھا یہ بتائیں رہنے کے لیے آئی ہیں ناں......'' اذکاء نے اس کا بیگ ایک طرف رکھتے ہوئے سوال کیا۔

ثمرہ نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا

''ہوں۔ پورے سات دن کے لیے پھوپھی جان نے کہا ہے ایک ہفتہ رہ کر آنا۔''

''شکر ہے میں تو سمجھی تھی انہوں نے امی کو اتنا تنگ کیا تھا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی تنگ کریں۔'' اذکاء نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''تمہیں کیا خبر ننھی گڑیا سارے جہاں کی کسر وہ ایک ٹرابی بے حسن ظالم انسان نکال لیتا ہے۔'' دل ہی دل میں کہتی آگے بڑھ گئی۔

ایک ہفتہ کا سن کر حلیمہ بیگم بھی خوش ہو گئیں۔

رات کو سارے کاموں سے فارغ ہو کر حلیمہ بیگم تسبیح ہاتھ میں لیے بستر پر چلی آئیں۔ ماں بیٹیاں کچھ دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ حلیمہ بیگم نے بتایا۔

''آپا بھی اشعر کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی

ہیں۔ مگر وہ ہے مانتے ہی نہیں۔ اس نے اماں باوا سے کہہ دیا کہ وہ شادی ہی نہیں کرے گا۔ باؤلا ہوگیا ہے۔ آپا ذنیرہ کی اور اس کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتی ہیں۔ اشعر کے ولیمے میں ذنیرہ کی رخصتی مگر بھیا وہ لڑکا تو ایسا ضدی نکلا۔ ایک ہی ضد پکڑی ہے کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔'' حلیمہ بیگم دیر تک بولتی رہیں۔

لیکن ثمرہ نے اور کچھ نہیں سنا اس نے اتنی دیر میں فیصلہ کرلیا کہ وہ اشعر سے بات کرے گی ان کو سمجھائے گی، منائے گی۔ شاید اس کی بات مان لیں۔

اشعر نہ میں بے وفا ہوں نہ تم بے وفا ہو...... یہ سب کیسے ڈرامائی انداز میں ہو گیا۔ نہ مہلت ملی نہ وقت نے ساتھ دیا اور وہ ہو گیا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ سوچتی رہی مگر اب تم کو منانا میرا کام ہے۔

☆☆☆

''کافی دنوں کے بعد آج ذرا ڈھنگ سے تیار ہوئی تھی لائٹ پنک اور ڈارک پنک کے شیڈ والا سوٹ خوب صورت سی بیل لگا ہوا دوپٹا کھلے بال گھنے لمبے سیاہ بال اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے تھے۔ ہلکا سے پنک شیڈ کا میک اپ میچنگ جیولری بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھلتی رنگت اور...... قاتلانہ موسم...... ایسا موسم ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہا ہے۔

اشعر کی بے باک ملاقات غلط فہمی...... کمبل کا گھسیٹنا اور وہ ہاتھوں کا لمس وہ بولوں کی شیرینی مٹھاس وہ نظروں کا تصادم ہر وقت اسے ستاتے تھے۔ آج بھی اس موسم کو دیکھ کر اس کے دل نے کہا کاش کہیں سے اشعر آجائے اور میں پہلے والی ثمرہ بن جاؤں۔

تب ہی دروازے پر کسی کے آنے کی اطلاع ملی۔ بیل سن کر وہ آگے بڑھی اس نے گیٹ کھولا سامنے...... وہ تمام تر مردانہ وجاہتوں کے ساتھ کھڑا تھا۔

''السلام علیکم۔'' ثمرہ نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام ...... جیتی رہو ہزاروں برس۔'' اشعر نے بڑے خلوص سے جواب دیا۔

''آیئے۔'' وہ ایک طرف ہٹ گئی۔

''خالہ کہاں ہیں؟''

''امی نماز پڑھ رہی ہیں۔ اذکاء پڑوس میں گئی ہے۔ بیٹھیے۔'' اس نے ڈرائنگ روم کا پردہ اٹھا کر اندر اشارہ کیا...... اشعر بیٹھ گئے۔

''تم نہیں بیٹھو گی؟'' ان کے لہجے کی بے چارگی پر ثمرہ تڑپ گئی۔

''جی، بیٹھتی ہوں۔'' وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''رکنے آئی ہو؟'' اشعر چاہ رہے تھے دونوں میں سے ایک بھی چپ رہا تو شاید اچھا نہیں ہوگا۔

''جی، کل آئی ایک ہفتے کے لیے۔''

''ادھر چکر لگاؤ گی؟'' لہجے میں حسرت تھی۔

''نہیں......''

''کیوں؟'' اشعر کے لہجے کی بے بسی ثمرہ کو تڑپا گئی۔

''اشعر......! نہ آپ کا قصور ہے، نہ ہی میرا۔ یہ ہمارے نصیبوں کا چکر ہے۔ نہ تمہارے دادا ابو کا انتقال ہوتا نہ میرے ابا کا تو کبھی ایسا نہیں ہوتا۔''

''میں وقت آخر اپنے ابا کے حکم اور ان کی مرضی سے انحراف نہ کرسکی۔ میری جگہ اگر آپ ہوتے تو کیا کرتے؟'' ثمرہ نے سوال کیا تو اشعر نے بڑے ہی دکھ سے کہا۔

''میں تمہیں کب قصوروار سمجھ رہا ہوں...... بس اب صرف ایک آس پر زندگی کی بقیہ دن گزار دوں گا کہ کوئی تو ہے جو مجھے پیار کرتا ہے۔ اس کی لبوں سے میرے لیے دعا نکلتی ہے۔ وہ میری بقاء اور سلامتی کے لیے دعائیں مانگتا ہے۔''

وہ رکے تو ثمرہ نے کہا۔

''اشعر! میں آپ سے ملنے والی تھی آپ کو سمجھانے اپنی ضد کو ختم کردیں۔ ماں بہنوں، باپ

بھائیوں سب کی ایک تمنا ہوتی ہے کہ ان کا اپنا سہرا سجا کر گھر کو آباد کرے۔ والدین اور بہن بھائیوں کے جذبات کی قدر کریں۔ ان کے ارمانوں کو یوں پامال کرنا عقل مندی نہیں ہے۔ ضد چھوڑیں خالہ خالو اور بچوں کے چہروں پر چھائی مایوسی اور بے بسی دور کریں۔ آپ شادی کر لیں۔ دیکھیں ناں دنیا میں کتنے ہی لوگ اپنے چاہنے والوں کو نہ پا سکے۔ ناکامی اور محرومی ان کے حصے میں آئی۔ کتنے ہی برباد اور نامراد رہے۔ ہم کو بھی ان ہی لوگوں میں شامل کر لیں۔''

وہ رکی تو اشعر نے دکھ سے مسکرا کر اسے دیکھا......

''تو اس سے کیا ہوگا؟''

''میں ایسا ہی ٹھیک ہوں۔''

''نہیں، ایسے میں میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ میں قصور وار ہوں؟'' ثمرہ نے آنکھوں میں آئے آنسو پی لیے۔

''اچھا یہ بتاؤ تم خوش تو ہو۔ کاشف ذاتی طور پر کسی صورت تمہارے لائق نہیں تھا۔ مگر مرحوم خالو نے نہ جانے کیا سوچ کر اس کا انتخاب کیا تمہارے لیے۔'' اشعر نے افسوس کا اظہار کیا۔ ''کوئی اچھا بندہ ہوتا تو شاید مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔''

ثمرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خود اکثر یہ سوچتی کہ ابا نے یہ غلط انتخاب کیا ان کا فیصلہ میرے حق میں بہتر نہیں تھا۔ انہوں نے بس ایک ضد پکڑ لی تھی کہ ثمرہ کاشف کی دلہن بنے گی اور بس آگے انہوں نے کچھ نہ سوچا۔

اشعر نے اٹھنا چاہا تو ثمرہ نے اسے پھر سمجھانا چاہا۔

''اشعر! دیکھیں اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ وہ اپنے بندوں کا برا نہیں چاہتا۔ وہ تو ماں سے ستر گنا زیادہ پیار کرتا ہے۔ بھلا وہ ہم کو دکھ اور ناکامی کیوں دے گا۔ اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی راز چھپا ہوتا ہے۔ اس کی حکمت وہ ہی جانے پلیز اشعر......آپ شادی کر لیں۔ جب نئی زندگی کا آغاز ہوگا کچھ مصروفیت بدل جائے گی نئے تجربات ہوں گے۔ نئی ذمہ داریاں بڑھیں گی۔ اس مصروفیت میں آپ مصروف ہو جائیں گے تو پھر ماضی......کی یاد خود بخود گم ہو جائی گی۔''

''یہ تمہارا تجربہ ہے۔'' وہ تیزی سے بول گیا۔

ثمرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا وہ بھی خود ہی جھینپ گئی۔

میں نے یہ کیا کہہ دیا۔

''ہاں بس یہ ہی سمجھو۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

ثمرہ میری طرف دیکھ کر یہ جملہ دہراؤ......

''خود کو بھی دھوکا دے رہی ہو......اور مجھے بھی پگلی۔'' وہ دکھ سے ہنسی۔

''اچھا، اب میں چلوں بہت دیر ہوگئی ہے۔مم وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

''سب کو سلام و دعائیں کہیے گا۔'' وہ بھی کھڑی ہوگئی۔

☆☆☆

''باجی کیا کھائیں گی؟'' اذکاء نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ارے بیٹا! جو پک جائے گا کھا لوں گی۔ سچ امی کے ہاتھ کے بنائے کھانے بہت یاد آ رہے تھے۔''

''وہ ایک ہفتہ یہاں رہی، سسرال سے فون نہیں آیا نہ کاشف نے کوئی کال کی۔''

جانے سے ایک دن پہلے ثمرہ نے کاشف کو کال کی تو اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اس کے پاس ٹائم نہیں ہے۔

''بابا لے آئیں گے میں گاڑی بھیج دوں گا۔''

ثمرہ نے اوکے کہہ کر سیل بند کر دیا۔

امی نے بیٹی کو سینے سے بھینچ کر پیار کیا۔ اذکاء بہن سے لپٹ گئی۔ ثمرہ نے جاتے ہوئے بہن کو ایک لفافہ دیا۔

''چندا۔ تم اپنے لیے کچھ لے لینا۔'' امی نے لاکھ منع کیا مگر وہ نہ مانی۔

''امی میں اپنے جیب خرچ سے دے رہی ہوں۔''

یہ تو تھا کہ روپے پیسے کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے کی کوئی کمی نہ تھی۔ میکے اور سسرال میں یہ بہت بڑا فرق تھا...... بس ایک یہ چیز بے حساب تھی۔ اور اس دور میں اسی چیز کی ضرورت ہے...... لیکن اس چیز کے علاوہ اور بھی بے شمار چیزیں ہیں۔ پیار، محبت، شفقت، وارفتگی حسین و خوب صورت جذبات کا امتزاج، حسن و دلنشین خوب صورت مہکتے گنگناتے لمحات حسین راتیں، مسکراتی شامیں، گل رنگ صبحیں۔ ثمرہ ان قیمتی اثاثوں سے محروم تھی۔

دولت لے کر کیا کرتی یہ چیزیں تو نہیں خرید سکتی۔ اپنی بچھڑی محبت کو نہ خرید سکتی نہ حاصل کر سکتی۔

وہ گھر آ گئی وہی خاموشی، سناٹا، ویرانی اتنے بڑے بنگلے میں چار افراد جس میں سے تین زیادہ تر باہر رہتے۔ ایک اکیلی ثمرہ بوکھلا جاتی۔ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر پھرتی۔ کبھی بستر پر آ جاتی کبھی ٹیرس میں کھڑی ہو جاتی۔ یہاں خاصی تفریح رہتی ٹرانسپورٹ کا شور...... آتے جاتے مسافروں کی آمد ورفت گاڑیوں کے ہارن کی آوازیں، لائٹیں، روشنیاں گھما کبھی کچھ ٹائم اچھا گزر جاتا۔ مگر کب تک دل و دماغ کی ہلچل، ماضی کی انمٹ یادیں، اشعر کی سنگت میں گزرے لمحات، وہ خوب صورت دلفریب یادیں، اسے جینے نہیں دیتیں۔

اگر شوہر پیار کرنے والا ہوتا تو شاید وہ اتنی ڈسٹرب نہیں رہتی مگر کاشف ایک بے حس بندہ تھا۔ لاتعلق سا۔ وہ اپنی ذات کے بارے میں سوچتا تھا دوسروں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بیوی کا حق کس طرح ادا کیا جاتا ہے۔ اس سے ناواقف تھا۔ وہ زندگی کو جینا نہیں جانتا تھا۔

آج جلدی گھر آ گیا تھا شکر ہے نارمل تھا۔ ثمرہ کو آج اس کا آنا برا نہ لگا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آج کاشف کی آمد پر ناگوار بدبو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ آج پہلی بار اس نے میاں کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ کاشف ایک خوب صورت اور اسمارٹ بندہ تھا۔

اس نے لاؤنج میں داخل ہوتے شوہر کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح سلام کیا۔ کاشف نے ڈھنگ سے جواب دیا۔ شکر ہے مولیٰ میری نمازیں، میری دعائیں رنگ لائیں۔

کاشف کے پیچھے بیڈ روم میں چلی آئی۔ اس کے کپڑے واش روم میں رکھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ کوٹ اتار کر ہینگ کیا۔ پھر اس کے جوتے اتارنے لگی تو کاشف نے منع کر دیا۔ وہ بنا کچھ کہے پیچھے ہٹ گئی۔

جب وہ ہاتھ لے کر نکلا تو اس نے چائے پیش کی۔ بالکل خاموشی کے دوران یہ کام ہو رہے تھے۔ چند لمحے بعد کاشف کی آواز آئی۔

''ثمرہ تیار ہو جاؤ باہر چلیں گے۔'' بڑی اپنائیت سے کہا گیا تو ثمرہ اور زیادہ حیران ہو گئی۔ یہ کیا ہو گیا ہے ان کو...... وہ دل ہی دل میں مسکرائی۔

''یہ بتائیں...... کہاں جانا ہے؟'' اس کے اس سوال پر کاشف کی پرانی رگ پھڑک اٹھی۔

''مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ جرح کرو، سوالات کرو...... بس کہہ دیا تیار ہو جاؤ تو بس تیار ہو جاؤ۔''

''میں اس لیے پوچھ رہی تھی اس حساب سے لباس پہنوں گی۔''

''اوہ...... اچھا۔'' کاشف کے لہجے میں نرمی تھی۔ ''ایک دوست کے ہاں چلیں گے پھر واپسی پر کھانا کھاتے ہوئے آئیں گے۔ اب یہ نہ پوچھ لینا کہ کہاں کھانا کھائیں گے۔'' اس نے ثمرہ کی طرف دیکھا تو وہ ہنس پڑی۔ شاید شادی کے بعد پہلی مرتبہ کاشف کے سامنے ہنسی تھی۔

کاشف بھی ہنس پڑا اور دل میں سوچنے لگا یار

اتنی سیدھی سادھی معصوم سی بھولی بھالی لڑکی کو میں کتنے عرصے سے اگنور کر رہا تھا اور وہ خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔
ہنستی ہوئی کتنی پیاری لگتی ہے ظالم۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔
اس نے ہاتھ بڑھا کر بیوی کو خود سے قریب کیا تو ثمرہ نے خود کو میاں کے سپرد کر دیا۔
بالکل نارمل طریقے سے انجوائے کر رہے تھے۔
جب گاڑی شاپنگ سینٹر کی طرف بڑھی ثمرہ نے حیرت سے میاں کی طرف دیکھا۔
''ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ ارے یار شادی کو کتنے دن گزر گئے نہ تم نے فرمائش کی نہ میں نے کچھ خریدا...... کیوں کیسا رہا سرپرائز۔ پہلے تفریح کی اور اب شاپنگ پھر کھانا کھائیں گے، اوکے......''
''جی۔'' ثمرہ کی آنکھوں میں ڈھیر سارا نمکین پانی جمع ہو گیا۔ جو لمحوں میں پلکوں کی باڑ توڑ کر بہہ نکلا۔
''ریلکس ثمرہ پلیز ...... مجھے رات مما نے بہت دیر تک سمجھایا کہ میں غلط ہوں۔ غلطی پہ غلطی کر رہا ہوں اور تم ...... سب کچھ خاموشی سے برداشت کر رہی ہو۔ میں نے تمہارا امتحان لیا تم جب گھر آ گئیں تب میں ...... مامی کے پاس گیا۔ انہوں نے ، گڑیا نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بہت آؤ بھگت کی اور میر کام کے بارے میں کہا کہ میں یوں رات دن بزنس میں مصروف نہ رہوں۔ میری صحت خراب ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے میری غیر حاضری کی یہ وجہ بتائی۔ یار میں بھی تو انسان ہوں میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتیاں کیں۔ سچ بتاؤں میں ابھی شادی کے موڈ میں بالکل بھی نہ تھا۔ ماموں نے اس حالت میں یہ کام تو اب ایک ایسے شخص کا حکم تھا۔ لب مرگ تھا میں ان کی بات کو کیسے رد کرتا ...... اچھا خیر چھوڑو ماضی کو جو گزر گیا گزر گیا۔ اب حال پر نظر رکھو۔ اور جی بھر کے انجوائے کرو......اوکے۔''
اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''مجھے معاف کر دیا ناں تم نے۔'' انہوں نے جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
''کم آن یار۔ اب خوب صورت آنکھوں میں نمی نظر نہیں دیکھنا چاہتا۔'' انہوں نے اپنی طرف دیکھتی بیوی کو دیکھ کر مسکرا کر اقرار میں گردن ہلائی۔ وہ بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

اشعر بھلا ثمرہ کی بات کو کیسے ٹالتا اس نے ہاں کر دی گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب بڑی زور و شور سے لڑکی کی تلاش شروع ہوئی آخر ایک لڑکی پسند آ گئی۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ......
اشعر کی شادی ہو گئی ان دنوں ثمرہ کاشف کے ساتھ ورلڈ ٹور پر گئی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ شادی میں شریک نہ ہو سکی۔
جب ثمرہ واپس آئی تو کاشف کے اصرار پر اشعر اور اس کی بیوی کو کھانے پر بلا لیا۔ فرحانہ ایک بے حد تیز طرار بے مروت بے باک لڑکی تھی۔ اشعر کی تو قسمت پھوٹ گئی تھی۔ اتنے عرصے انکار کے بعد اقرار کیا تو زندگی اجیرن ہو گئی۔ وہ بہت ہی بری طرح اس زندگی کے تار عنکبوت میں الجھتے گئے۔
فرحانہ اور اشعر جب ثمرہ کے ہاں پہنچے تو سب سے پہلے فرحانہ نے برا سا منہ بنا کر اشعر کو مخاطب کیا۔
''آج تو خیر میں اس ٹائم پر گھر سے نکلی ہوں۔ آئندہ خیال کیجیے گا، گرمی میں مجھے اس ٹائم باہر نکلنا بالکل پسند نہیں ہے۔ آپ کے پاس اے سی نہیں ہے۔'' اس نے کاشف کی طرف دیکھا۔
''جی بالکل ہے۔'' کاشف نے اے سی آن کر دیا۔
ثمرہ اور کاشف مہمان داری میں کوئی کمی نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ہر چیز بے حد لذیذ بنی تھی۔ اشعر ہر

چیز کی دل کھول کر تعریفیں کر رہا تھا۔ کاشف بھی بہت خوش تھا۔ کھانے کے بعد سویٹ ڈیش، پھر آئس کریم، پھر کولڈ ڈرنک پھر پان...... سے تواضع کی گئی۔ آخر میں دونوں کو پھول پہنا کر گفٹ دیے گئے۔ ثمرہ نے گولڈ کا سیٹ فرحانہ کو دیا۔ کاشف نے سوٹ اور گھڑی اشعر کو دی۔

فرحانہ نے کوئی خاص رسپانس نہیں دیا۔ البتہ اشعر اور ثمرہ دونوں۔ بے حد ریزو ہونے کے باوجود اس نے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی معاملہ ضرور ہے۔

باقی سب نے بے حد دوستانہ ماحول میں انجوائے کیا اشعر نے جاتے جاتے کاشف کو گلے سے لگایا۔

''اب کسی دن ہمیں موقع دو یار میزبانی کا۔'' انہوں نے کاشف سے کہا تو وہ مسکرائے۔

''کیوں نہیں۔ ضرور۔ کیوں ثمرہ کیا خیال ہے؟'' انہوں نے ثمرہ کی طرف دیکھا جی ضرور وہ مسکرائی۔

اشعر بہت حد تک مطمئن ہو گیا تھا کہ ثمرہ کی ازدواجی زندگی اچھی ہے۔ سارا راستہ فرحانہ نے اشعر کا گاڑی چلانا محال کر دیا۔ سوال پہ سوال مختلف سوالات ثمرہ آپ سے اتنی بے تکلفی سے باتیں کیوں کر رہی تھی اور آپ بھی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اس کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔ وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی تھی۔

ارے بابا تم سے بھی باتیں کر رہی تھی مجھ سے [illegible] کتنی دیر سامنے رہی وہ میری کزن بھی ہے۔ جتنی دیر ہم لوگوں نے کھانا کھایا اس وقت بھی میں اور کاشف برابر کی باتیں کرتے رہے۔ تم ہی نے چپ کا روزہ رکھا تھا۔ وہ تو تم سے بھی برابر باتیں کر رہی تھی۔

''بہرحال اب یہ ہی کوشش کرنا کہ اس کا تمہارا ملنا کم سے کم ہو۔'' فرحانہ نے الٹی میٹم دے دیا۔

''تمہاری ذہنیت اور سوچ بہت ہی گندی ہے۔ خواہ مخواہ ایسی باتیں کر رہی ہو۔ اصل میں تمہیں عزت راس نہیں ہے۔ ارے عورت۔ اس دور میں اپنے اپنوں کو گولڈ دینے سے پہلے ہزار بار سوچتے ہیں اور اس نے اتنا خوب صورت سیٹ تمہیں دیا اور تم اس کے لیے ایسے خیالات رکھتی ہو۔''

''اچھا تو اب اس عورت کے لیے مجھے الٹی سیدھی سناؤ گے۔'' وہ بڑبڑاتی رہی مگر اشعر چپ رہا۔ اس کے منہ لگنا فضول تھا۔

وقت اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا...... ہر کوئی اپنی اپنی زندگی میں مصروف تھا اور وقت آگے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ منہ تھکتا تھا نہ رکتا تھا بس چلتا ہی جاتا ہے، بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ثمرہ کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی کاشف کا رویہ دن بہ دن بہتر سے بہتر ہو رہا تھا۔

ایک دن وہ اخبار پڑھ رہا تھا۔ ثمرہ حسب معمول چائے لے کر ان کے پاس آ رہی تھی کہ اچانک اسے چکر آ گیا وہ گرنے لگی تھی کہ کاشف نے اسے تھام لیا۔

''ثمرہ...... ثمرہ کیا ہو گیا ٹھیک تو ہو......؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''جی ٹھیک ہوں، چکر سا آ گیا آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا ہو گیا۔''

کاشف نے اسے بیڈ پر لیٹا کر ڈاکٹر کو فون کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں لیڈی ڈاکٹر نے خوش خبری دی کہ نئے مہمان کی آمد ہے۔

اب تو کاشف نے ایک نرس بیوی کے لیے، رات کے لیے، ایک صبح سے شام تک کے لیے رکھ لی۔

☆☆☆

''میں نے آپ کو پہلے ہی دن سمجھا دیا ہے کہ مجھے بچے نہیں چاہئیں۔ مجھے بچے بالکل پسند نہیں ہیں۔ ایک تو عورت کی جسامت بے ڈھنگی ہو جاتی ہے۔ پھر نو ماہ کے لیے مختلف اصول و ضوابط کی پابندی کرو۔ پھر بچہ ہو جائے تو ایسا کرو، ایسا نہ کرو۔ یہ کھاؤ،

وہ نہ کھاؤ۔ اے ہے بچہ رو رہا ہے۔ ماں نے بدپرہیزی کرلی ہوگی، کھالیا ہوگا کچھ، بچے کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے......لگتا ہے بچے کو گیس ہوگئی ہے۔ دیکھو تو ذرا کتنا سینہ جکڑا ہوا ہے۔ گلا خراب لگ رہا ہے۔ اری اماں نے شربت پی لیا ہوگا، کوئی کھٹی چیز کھالی ہوگی۔ ٹھنڈا پانی پی لیا ہوگا۔ توبہ توبہ! عورت نے بچہ کیا پیدا کیا سارے جہاں کے جرم کرلیے بہت بڑا گناہ کرلیا۔ پابندیوں پر پابندیاں......لاحول ولاقوۃ۔'' دیر تک بولتی رہی رکی تو اشعر نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

''سنو تمہاری تقریر ختم ہوگئی اب میری سنو! مجھے بچے بہت پسند ہیں۔ ننھے منے گول مٹول، ببلو ببلو سے، ننھی ننھی خوب صورت رنگ برنگی پریاں، مجھے دل وجان سے زیادہ پیاری ہیں۔ بچوں کے بغیر ماں باپ ادھورے ہوتے ہیں۔ یہ خوب صورت اور انمول تحفے ہیں جو رب نے والدین کے لیے بنائے ہیں۔ وہ گھر قبرستان کی طرح سناٹوں میں گھرا ہوتا ہے جہاں یہ نعمت نہیں ہوتی۔ یہ ننھے شیر خوار بچے روز قیامت میں پل صراط پر سے والدین کو آسانی گزرنے دیں گے۔ جس گھر میں لڑکی پیدا ہوتی ہے وہاں ہمارے پیارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام آتا ہے۔

واہ واہ جزاک اللہ......ماشاء اللہ اتنی بڑی سعادت اور رتبہ ملتا ہے اس گھرانے کو......'' (بعض گھرانے حکم خداوندی کے حکم کے انتظار میں ہوتے ہیں ان معصوموں کی آمد کے لیے وہ بے چارے بے بس اور مجبور ہوتے ہیں)

اشعر نے بات ختم کرکے بیوی کی طرف دیکھا وہاں مکمل خاموشی تھی۔ فرحانہ سوچکی تھی یا یوں ہی انجان پڑی تھی۔ اشعر نہ سمجھ سکے۔

☆☆☆

آج کل شہر کے حالات بہت خراب تھے ہر روز کوئی نہ کوئی حادثہ......کہیں نہ معلوم افراد کی فائرنگ، کہیں خودکش حملے، کہیں زوردار دھماکے، کہیں خطرناک ایکسیڈنٹ ہر طرف موت کا کھیل زوروں پر تھا۔

کبھی مسجدوں پر حملے، کبھی اسکولوں میں ننھے شہیدوں کا ڈھیر غرض یہ کہ موت کی یہ آنکھ مچولی اور لہو کا یہ گرم بازار، جسمانی اعضاء کے بکھرے ٹکڑے۔

''یا اللہ رحم فرما۔ میرے مالک رحم کر۔ یا اللہ! ہمارے گناہ معاف کردے، ہماری کوتاہیاں بخش دے، ہماری لغزشیں درگزر فرما......ہمیں صراط مستقیم پر چلا ہم کو سیدھا راستہ دکھا، ہماری بند آنکھیں کھول دے، ہمارے دلوں کی سیاہی مٹا دے، ہمیں ایک سچا انسان ایک مکمل مسلمان بنا۔ ہم سنت رسولؐ پر چلیں، اپنے رب کا محکوم بنا ہم کو اس تباہی اور بربادی کے دلدل سے نکال ہم پر پڑے غفلت کے پردے ہٹا۔

ہمارے مذہب اسلام کی ہمارے ملک پاکستان کی اور ہم سب کی حفاظت فرما۔ (آمین ثم آمین)''

ثمرہ نے دعا ختم کی اور سینے پر دم کیا۔ ہاتھوں پر پھونک ماری چہرے پر اور جسم پر ہاتھ پھیرا۔

''آج ہماری بیگم نے پورے ایک ہفتے کی دعا مانگ لی۔'' کاشف نے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا تو ثمرہ نے چونک کر دیکھا۔ کاشف دروازے پر کھڑا تھا۔

''جی کیا پتا کل دعا نہ مانگ سکوں۔ رہوں یا نہ رہوں۔''

''ارے......ارے......ارے یہ کیا کہہ رہی ہو۔ آئندہ ایسی بدفعل زبان سے نہیں نکالنا ورنہ میں تم سے ناراض ہوجاؤں گا۔'' کاشف نے پیار اور غصے سے ملے جلے جذبات میں کہا تو وہ بولی۔

''کاشف آج تو شہر کے حالات بہت خراب ہیں آپ پھوپھا جان کو کال کردیں جلدی گھر آجائیں۔ میں نے ابھی خبریں دیکھی ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں کال کرتا ہوں مگر وہ جلدی نہیں آئیں گے۔ مجھے ان کا پتا ہے ناں اس بات پر مجھے

بھی اکثر ڈانٹ پڑتی ہے کہ اتنا موت سے نہ ڈرا کرو، جب آنی ہوگی آجائے گی۔ ڈرنے سے نہیں رکتی......'' کاشف نے کہا تھا۔

ثمرہ نے کہا۔

''اللہ نہ کرے۔ اللہ سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔'' تب ہی آفس سے کاشف کے پاس کال آگئی۔

''لو بھئی...... کرلو کیا کرنا ہے۔ والد محترم نے یعنی آپ کے سسر صاحب جناب پھوپھا صاحب نے ہمیں طلب کرلیا۔ کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ وہ فائل ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ میرا جانا بہت ضروری ہے۔ مما بھی کافی مصروف رہنے لگی ہیں۔ دیکھو شہر کے ایسے حالات ہونے کے باوجود پتا نہیں کہاں ہیں؟''

کاشف نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''دراصل پاپا سارا وقت اپنے بزنس میں الجھے رہتے ہیں۔ بیوی، بیٹا انہیں کوئی نظر نہیں آتا۔ مما بے چاری کیا کریں گی۔ یوں اپنی مصروفیت ڈھونڈلی۔''

کاشف نے خود ہی سوال کیا خود ہی جواب دے لیا۔ ثمرہ نے پھوپی کو فون کیا مگر فون بند جارہا تھا۔

کاشف آفس چلے گئے۔ نرس آچکی تھی۔ ثمرہ اور نرس گھر پر اکیلے تھے۔ وہ بار بار ساس کو فون کررہی تھی۔ مگر ادھر سے بھی کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔

بارہ...... ایک...... دو گھڑی کی ٹک ٹک مسلسل سنائی دے رہی تھی اور سوئیاں اس ٹک ٹک کے اشاروں پر تھرک رہی تھیں اور ادھر ثمرہ کا دل دھک دھک کررہا تھا۔ رفتار اور آواز بڑھتی جارہی تھی۔ وہ پریشان ہوگئی۔ باری باری ساس کو، سسر کو، شوہر کو، بار بار کال کررہی تھی لیکن کسی کا بھی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔ اس نے نرس سے کہا۔

''نسرین ٹی وی تو آن کرو......''

اور ٹی وی پر ایمرجنسی نیوز آرہی تھیں۔ جسے سن کر وہ بہت پریشان ہوگئی۔ شہر کے حالات بہت خراب ہوگئے تھے۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ دو تین مقامات پر دھماکے ہوئے تھے۔ شہر کے ہاسپٹلز میں بیڈ کم پڑ گئے تھے۔ ایمبولینس مصروف ہوگئی تھیں۔ وہ متواتر رابطے میں تھی مگر...... کوئی خبر اسے نہ مل سکی اور پھر اس نے مجبور ہوکر نسرین سے کہا کہ ''ہم دونوں گھر سے نکلتے ہیں۔ ہم ان کو ڈھونڈ لیں گے۔ اللہ مدد کرنے والا ہے۔''

نسرین ثمرہ سے بڑی تھی۔ اس نے سمجھایا۔

''نہیں ثمرہ! ایسا ممکن نہیں ہے۔ ان بدترین حالات میں ہم دونوں کا یوں اکیلے باہر نکلنا درست نہیں ہے۔ تم اپنی حالت تو دیکھو۔ اس حال میں ہم کہاں بھٹکیں گے۔ صبر کرو اللہ بہتر کرنے والا ہے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

تب ہی ثمرہ کا موبائل بول پڑا ثمرہ نے تیزی سے ریسو کیا۔

''جی...... جی میں ان کی مسز ہوں۔''

''اوہ...... کہاں...... اچھا۔ میں پہنچ رہی ہوں۔'' وہ روتے ہوئے نسرین سے مخاطب ہوئی۔

''کاشف اور پھوپھا جان ایک ہی ہاسپٹل میں ہیں۔ کسی زخمی مریض نے فون کیا ہے۔'' وہ تیزی سے پرس میں پیسے رکھنے لگی۔

نسرین نے یٰسین شریف اور پانی کی بوتل اپنے پرس میں رکھ لی۔ مگر وہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ لوگ وہاں پہنچے ایک افراتفری تھی۔ زخمیوں کی کراہنے کی، چیخنے کی آوازیں جو اپنوں سے روٹھ گئے تھے ان کے لواحقین زاروقطار رو رہے تھے۔ بڑی جدوجہد اور بھاگ دوڑ کے بعد...... ثمرہ کو خبر ملی کہ دونوں اس سے خفا ہوگئے تھے۔ اس دنیا سے روٹھ گئے تھے۔

وہ بری طرح رو رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر سامنے سے آتی ہوئی اسٹریچر پر پڑی جس پر پھوپھی

جان تھیں۔ یک نہ شد تین شد ثمرہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ نسرین پریشان ہو گئی کافی دیر بعد ثمرہ کو ہوش آیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ کیسا کرے؟

نسرین نے ثمرہ سے پوچھے بغیر اشعر کو فون کر دیا تھا فرحانہ میکے گئی ہوئی تھی۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں ہاسپٹل میں تھا۔ ثمرہ کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ حواس باختہ ہو گئی۔ ایک دم چپ نہ کسی سے بات کر رہی تھی نہ کسی کو پہچان رہی تھی۔

اشعر ساری کاغذی کارروائی مکمل کر کے جب تینوں کو لے گھر پہنچا ملازم نے گیٹ کھولا۔ عجیب منظر تھا ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ گھر کے مکین ایک ساتھ لائن سے لیٹے تھے۔

بڑا ہی خطرناک حادثہ تھا نجانے سارے شہر کے کتنے گھروں میں ایسا کہرام مچا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا نجانے کتنے اپنے جسموں کے اعضاء گنوا بیٹھے تھے۔

دنیا سے جانے والے چلے جاتے ہیں اور آنے والی روحیں دنیا میں آ جاتی ہیں۔ نہ جانے والوں کو کوئی روک سکتا ہے نہ آنے والوں کو کوئی روک سکتا ہے۔

رات گئے تک مرحومین کو سپرد خاک کر دیا گیا ثمرہ کے پاس ماں اور بہن تھیں۔ اب بھلا اسے عدت میں کیسے تنہا چھوڑتیں اس کی حالت بہت خراب تھی۔ ثمرہ کو ایک ہمدرد اور اپنے کی ضرورت تھی۔ مرد کی شکل میں جو اس کے کاروبار کو سنبھالے اور اسے بار بار اشعر کا خیال آ رہا تھا لیکن وہ فرحانہ کو جانتی تھی وہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔

اب اسے اپنے مستقبل کی، آنے والے حالات کی فکر لاحق تھی۔ وہ خود کو بہت ہی بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اسے تو جیسے بالکل چپ سی لگ گئی تھی۔

تیسرے دن تک سب رشتہ دار اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ گھر اب صرف سناٹوں کا راج تھا۔ اشعر بھی واپس چلے گیا تھا۔ اب اس کا یہاں رکنا غلط سمجھا جاتا۔ نہ خود رکتا، نہ بیوی رکنے دیتی......ایک نامحرم سے بھلا کیسے رابطہ رکھتی۔

اس اتنے بڑے سانحہ نے ثمرہ کو بالکل نچوڑ کر رکھ دیا۔ ذہنی اور جسمانی اذیتوں نے ثمرہ اور بچے پر بہت برا اثر کیا اور اچانک اس کی حالت بگڑی اور اسے ہاسپٹلائز کیا گیا۔ ساری رات موت وزیست کی کشمکش کے بعد صبح ثمرہ ایک خوب صورت گول مٹول سرخ وسفید نیلی نیلی آنکھوں والی گڑیا پٹر پٹر ماں کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو میری ماں اب میں آ گئی ہوں آپ اب تنہا نہیں ہو۔

فرحانہ صرف ایک بار افسوس کرنے آئی تھی۔

پھر دوبارہ اس نے آنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اشعر کو نسرین نے فون پر جب بچی کی پیدائش کا بتایا اشعر فوراً ہاسپٹل پہنچ گئے۔ وہاں لان میں بیٹھ کر انہوں نے نسرین کو فون کیا کہ میں باہر ہوں۔

''باجی آپ بچی کو لے کر باہر آ جائیں۔''

نسرین اشعر کو بالکل چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی پیاری سی بچی کو لے کر باہر آ گئیں۔

اشعر نے بچی کو دیکھا تو کھل اٹھا۔ بہت پیاری بہت ہی خوب صورت بچی ہے۔ بالکل ثمرہ کی طرح اس نے نسرین کی طرف دیکھا ہے۔

''نا باجی......''

نسرین مسکرائی۔

''ہاں بھیا اللہ نصیب اچھا کرے بچی کا قدم ماں کے لیے بہت بختاور ہو......''

اشعر نے اس کے خوب صورت موٹے موٹے سرخ سرخ گال چوم لیے اور ایک بھاری لفافہ اس کے بستر میں رکھ دیا۔ اشعر گھر لوٹ گیا۔

آج پھر میاں بیوی میں تکرار ہو رہی تھی۔

''فرحانہ! میں تمہاری ہر بدتمیزی ہٹ دھرمی اور خود پرستی کو برداشت کر رہا ہوں۔ مگر میری خوشی اور خواہش کا احترام کرنا تمہارا فرض ہے۔ میں کچھ نہیں سنوں گا۔ بس میں اب گھر کا سونا پن برداشت نہیں کر

سکتا۔ تم کوئی انوکھی عورت نہیں ہو کہ اگر بچہ پیدا کرو گی تو ہزاروں مسائل اور پابندیوں میں گھر جاؤ گی۔ دنیا کی ہر عورت ماں بن کر مکمل ہوتی ہے۔ عورت کی تسکین، بڑاپن، شفقت برداشت، دکھ اور مصیبت سہنے کی عادت، قربانی دینے کا جذبہ، ممتا کا اعزاز سب ہی کچھ ماں کی ذات میں سمٹ آتا ہے۔ عورت کی تکمیل ''ماں'' بن کر ہوتی ہے۔ یہ ایسا رشتہ ہے کہ رسول پاکؐ نے فرمایا ہے کہ ''ماں'' کے پاؤں کے نیچے ''جنت'' ہے اور تم اس جنت سے دور رہنا چاہتی ہو کتنی بدنصیب عورت ہو تم نامکمل بے نام سی......''

اور پھر ایک دن ایسا آیا جب ڈاکٹر نے فرحانہ کو بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ تو غصے سے پاگل ہوگئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ابارشن کروا سکتے ہیں۔ اس نے یہ بات اشعر سے چھپائی اور کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر کے پاس گئی اپنا مدعا پیش کیا۔ ڈاکٹر نے مختلف سوالات کیے اور یہ سن کر حیران رہ گئی کہ ابھی ایک بھی بچہ نہیں ہے اور وہ یہ کام کروانا چاہتی ہے۔

ڈاکٹر نے سختی سے منع کر دیا۔ وہ دو تین جگہ گئی سب نے منع کر دیا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کیوں نہ سیڑھیوں سے لڑھک جاؤں اس خیال کے آتے ہی وہ سیڑھیوں سے لڑھک گئی۔ اشعر ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ بیوی کی آواز سن کر دوڑے۔

''کیا ہوا......؟ کیسے گریں......؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔'' وہ بیوی کو سنبھالتا ہوا بیڈ روم میں لے آیا، ڈاکٹر کو فون کیا۔

تھوڑی ہی دیر میں لیڈی ڈاکٹر نے بتایا کہ آپ کی مسز کی حالت سیریس ہے۔ بچے کی گارنٹی ہم نہیں دے سکتے۔

''کیا...... بچہ کیسا بچہ ڈاکٹر صاحبہ میں سمجھا نہیں۔ آپ کی مسز ماں بننے والی تھیں گرنے سے خطرہ ہوگیا ہے۔ فوراً ایڈمٹ کریں۔''

☆☆☆

جب کبھی فرصت کے لمحات ملتے ثمرہ اپنی سوچوں میں الجھنے لگتی۔ نسرین اکیلی عورت تھی وہ اب ہمیشہ کے لیے ثمرہ کے گھر چلی آئی تھی۔ ثمرہ کی تنہائی بھی کم ہوگئی تھی۔ نسرین ایک مخلص اور ایماندار عورت تھی۔ ہمدرد اور اپنی اپنی سی وہ ثمرہ کا بہت خیال رکھتی۔ بچی کو سینے سے لگائے رہتی۔

جب بھی ثمرہ کو اداس دیکھتی اسے اس طرح سے مصروف کر دیتی کہ وہ سنبھل جاتی۔ اگر نسرین نہیں ہوتی تو ثمرہ بکھر گئی ہوتی۔

آج فرحانہ کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئے پندرہ دن گزر گئے تھے۔ آج اس کی حالت سیریس تھی۔ ڈاکٹرز نے فون کر کے اشعر کو بھی بلوا لیا تھا۔ فرحانہ ہوش میں آئی اس نے اشعر کو آواز دی۔ فوراً اشعر کو بلایا گیا۔ فرحانہ نے ٹوٹتی بکھرتی سانسوں میں رک رک کر بتایا کہ یہ اس نے جان کر کیا۔ وہ خود ہی سیڑھیوں سے گری اور اپنی کنڈیشن کو اشعر سے چھپایا تھا۔

''مم...... میں ماں بننے والی تھی۔ میں جان کر گری کہ بچہ ضائع ہو جائے۔ اشعر...... مم...... مجھے...... مجھے معاف کر دیں۔'' اس نے اشعر کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہی لمحے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

''میں نے تمہیں معاف کیا۔'' فرحانہ وہ بچوں کی طرح بلکنے لگا۔

''یہ کیا......؟ کیا تم نے......؟''

''میری قسمت میں یہ ہی کچھ لکھا ہے۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے اے میرے رب......'' وہ رب سے شکایت کرنے لگا۔

ذنیرہ بھائی کو سمجھاتے ہوئے زار و قطار رو رہی تھی۔ ثمرہ اور نسرین فوراً اشعر کے ہاں پہنچ گئیں۔ یہ تو ہر رہنے بسنے والے گھر میں ہوتا ہے۔ جہاں دنیا میں نئی روحیں آتی ہیں وہیں پرانی روحیں جاتی بھی ہیں۔ جس نے ماں کا پیٹ دیکھا وہ گور کی مٹی بھی ضرور دیکھتا ہے۔

ثمرہ کو آج اشعر پر بہت ترس آیا تدفین کے بعد وہ گھر جانا چاہتی تھی۔ رات زیادہ ہوگئی تھی۔ خالہ خالو نے روک لیا۔ اب رات کو کس کو نیند آتی خالہ نے

ثمرہ کو اپنے کمرے میں سلالیا۔ باقی مہمان جیسے تیسے لوٹ گئے۔ بھلا ایسے میں کس کو نیند آتی جس پر بیتی ہے۔ وہ تو بے حد ڈسٹرب رہتا۔

باقی لوگ بھی اس دکھ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ دوسرے روز بھی خالہ نے روک لیا۔ تیسرے دن سوئم کر کے ثمرہ گھر لوٹ آئی۔

نسرین تو گھر آتے ہی کام میں لگ گئی۔ ثمرہ نے غسل کیا نماز پڑھ کر کلام پاک کی تلاوت کی۔ نسرین نے رات کے لیے کھانا تیار کیا جلد ہی دونوں نے کھانا کھایا جلد ہی نماز عشاء ادا کی اور اپنی ٹیبل پر چلی آئی۔ ثمرہ کی بچپن سے عادت تھی۔ وہ پابندی سے ڈائری لکھتی تھی۔ ڈائری لکھی اور بستر پر چلی آئی۔ ڈائری کے پچھلے صفحات پڑھتی رہی کبھی کبھی جب وہ زیادہ ڈسٹرب ہوتی تو ڈائری پڑھنے لگتی۔

آج بھی وہ ڈائری ہاتھ میں لیے بستر پر آ گئی پچھلے صفحات پڑھتے پڑھتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ لائٹ جل رہی تھی۔

نسرین سونے سے پہلے ضرور گھر کا جائزہ لیتی تالے لگاتی، لائٹیں آف کرتی۔ ثمرہ کے کمرے میں روشنی دیکھی تو ادھر چلی آئی۔ ثمرہ سینے پر کھلی ڈائری اوندھائے مست سو رہی تھی۔ نسرین مسکرائی آہستہ سے ڈائری اٹھائی اس کو بند کیا۔ لائٹ آف کی اور کچھ سوچ کر ڈائری اپنے کمرے میں لے آئی۔

گو وہ جانتی تھی یہ جرم ہے...... کسی کی نجی چیزیں پڑھنا اخلاقی جرم ہے۔ مگر کون سا جذبہ تھا جو اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

ایک دو تین پلٹنے والے صفحے کے ساتھ نسرین کی جستجو اور تجسس بڑھتا جا رہا تھا...... افوہ خدایا...... اشعر اور ثمرہ ایک دوسرے کو اس حد تک پیار کرتے تھے اور کیسے ڈرامائی انداز میں ایک دوسرے سے بچھڑے اور پھر...... اب کس موڑ پر دونوں کھڑے ہیں۔

آج...... آج کی ڈائری کی تحریر کا ایک ایک لفظ کس قدر متاثر کن ہے۔

''یا الٰہی یا باری تعالیٰ تو دو پیار کرنے والوں کو کبھی جدا نہ کرنا۔ کبھی کسی سے کسی کا پیار نہ بچھڑے۔ پیار کرنے والوں کو امتحان میں نہ ڈالنا...... یا اللہ سچے پیار کرنے والوں کی مدد فرما...... یہ دنیا پیار کی دشمن کیوں ہے میرا بس چلے تو میں ہر پیار کرنے والے کا ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے دوں اور ان کو ایسی جگہ روپوش کر دوں۔ جہاں پیار کے دشمن نہ ہوں۔'' نسرین نے اپنے بہتے آنسو صاف کیے ایک عزم کے ساتھ اس نے ڈائری بند کی آہستہ سے لے کر جا کر ثمرہ کی ٹیبل پر رکھ آئی۔

اب اکثر یوں ہوتا کہ ذنیرہ ثمرہ کے پاس چلی آتی کبھی رکنے بھی آ جاتی۔ آج کل اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ خالہ نے ایک سال کا وقت مانگا تھا۔

ذنیرہ اور نسرین کی بھی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھیں۔ بالکل بہنوں کی طرح لگتا ثمرہ اور ذنیرہ کو ایک بڑی بہن مل گئی تھی۔

''آج میں بالکل ہی ٹوٹ کر بکھر گئی ہوں میری رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی میں اشعر کے سارے آنسو اپنے آنچل میں جذب کر لیتی۔ ان کے دکھ درد میں ان کی کوئی مدد کر سکتی۔ ان کو دلاسا دے سکتی، ان کو حوصلہ دے سکتی، ان کے دکھ ان کی تنہائی ان کی بے بسی کو دور کر سکتی مگر...... کس ناطے سے ہر دیکھنے اور سننے والا یہ ہی کہتا کہ ثمرہ تو ایک کزن ہے اتنی مہربان کیوں؟ میں اسی ڈر اور خوف سے انہیں سمجھا بھی نہ سکی تسلی اور دلاسا بھی نہ دے سکی کاش مجھے یہ حق ہوتا۔ میں ایسا کرتی۔ اشعر مجھے معاف کر دینا میں تمہارے قریب نہ آ سکی دو بول بھی نہ بول سکی۔ کیونکہ مجھے لگتا کہ میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔ میں ناکام ہو جاؤں گی۔ میری چوری پکڑی جائے گی۔ اس لیے میں آپ کے پاس نہ آ سکی۔ آپ خدا کے لیے مجھے بے حس، بے وفا نہ سمجھنا میں مجبور تھی، میں دوغلی شخصیت نہیں نبھا سکتی...... میں بہت عرصے سے اس مصنوعی خول میں چھپی شخصیت کے ساتھ جی رہی

ہوں۔اب میں بالکل ہی بکھر گئی ہوں۔ میری شخصیت پارہ پارہ ہوگئی ہے۔ میں اتنا بڑا بزنس نہیں سنبھال سکتی۔ مجھے تمہارے جیسے پرخلوص محبت کرنے والے ساتھی کی ضرورت ہے۔ مگر یہ میں کہہ نہیں سکتی تم بھی ایسی زندگی جی رہے ہیں۔ میں بھی دونوں ادھور ہیں۔ مگر...... میں اپنی ضرورت کے لیے تمہیں تم سے نہیں مانگوں گی یہ میری خودغرضی ہوگی۔ مجھے ایک ہمدرد اور خیر خواہ کی ضرورت ہے۔ بہت مل جائیں گے مگر سچا ایماندار مخلص کوئی نہیں ہوگا۔ تم میرے لیے دعا کرنا میں تمہاری بقاء اور سلامتی کی دعائیں مانگوں گی۔'' ڈائری بند کرکے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

ثمرہ باتھ لینے گئی تو ذنیرہ اور نسرین نے اس کی ڈائری کا یہ صفحہ پڑھ لیا...... دونوں نے پلاننگ کی کہ بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔

دو تین دن رہ کر ذنیرہ گھر آئی تو اسے لگا جیسے اشعر اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہے ہیں۔

وہ مسکرائی لیکن اشعر نے کچھ نہیں پوچھا اسے حیرت ہوئی۔ مگر چپ رہی اب وہ بھائی کو نوٹ کر رہی تھی کہ ان کے معمولات حرکات وسکنات کیسے ہیں کیا موصوف بھی کچھ اس قسم کے نازک جذبات تو نہیں رکھتے ثمرہ سے......اور وہ کامیاب ہوگئی۔ اس کا کمرہ اشعر کے کمرے کے ساتھ تھا۔ اگر دروازے کھلے ہوں تو باتوں کی آواز صاف آتی تھی۔ سب سو گئے تھے۔ اشعر ثمرہ سے فون پر کچھ کہہ رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد اشعر نے کہا۔

''ثمرہ میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں......تم سنجیدگی سے جواب دینا...... دیکھو جان عزیز! پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم کنوارے نہیں ہیں کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بزرگوں کو اپنی باتوں سے آگاہ کریں ان سے مشورہ لیں۔ ہم دونوں ایک ہی مقام پر آکر ٹھہر گئے ہیں۔ پہلے جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا اس میں ہم لوگوں کی مرضی یا ہاتھ نہیں تھا۔ اب جو ہم دونوں کے ساتھ ہوا ہے ناگہانی اچانک آنے والی آفتیں ہیں۔ یہ سانحے ہماری مرضی سے نہیں آئے۔

پلیز تم یہ نہ سمجھنا کہ تم پر ترس کھا رہا ہوں۔ نہیں بلکہ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں۔ ہاں خودغرض کہہ سکتی ہو......میری غرض ایک تمہارے سب سے قیمتی مال میں اٹکی ہوئی ہے میں قیمتی شے کو اپنی ملکیت بنانا چاہتا ہوں بولو تمہیں منظور ہے؟ یار دیکھو۔ اب کسی قسم کی رکاوٹ درمیان میں نہ لانا ہم اپنے حصے کی ان گنت تکلیفیں، اذیتیں، ٹینشن، امتحان برداشت کر چکے ہیں۔ اب مزید...... پلیز۔ اللہ کے واسطے کوئی رکاوٹ حائل نہ کرنا......جواب تو دو...... کیا میں ہی بولتا رہوں۔'' اشعر رکے تو دوسری طرف آواز آئی۔

''شکر الحمدللہ۔ آپ تھکے تو......'' لہجے کی شوخی اشعر کا حوصلہ بڑھا گئی۔

''میرا قیمتی مال کیا ہے، وہ کس طرح آپ اپنی ملکیت بنانا چاہتے ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''شفقت پدری دے کر......''

اشعر نے ایک جوش و ولولے سے کہا تو ثمرہ ہنس پڑی۔

''اچھا تو آپ ابرش کی بات کر رہے ہیں......؟''

''جی جان حیات......اب آپ کل تک جواب دے دیں، اب تو ہم دونوں کو اجڑے ہوئے خاصا وقت گزر گیا ہے۔ میرا سب سے زیادہ دلی اور جذباتی رشتہ ابرش ہوگا۔ وہ میں کسی کو نہیں دے سکتا۔'' اشعر کے لہجے میں یقین بول رہا تھا۔

''میرا خیال ہے یہ معاملہ بزرگوں سے پایہ تکمیل پہنچے تو زیادہ بہتر رہے گا۔'' ثمرہ نے مشورہ دیا۔

''بالکل۔ میں صبح ذنیرہ سے بات کروں گا۔ وہ امی ابا سے بات کرے۔ مجھے یقین ہے اس بار وہ ان شاء اللہ اپنے ہاتھوں سے یہ فریضہ ادا کریں گے۔ اچھا چلو......سو جاؤ جان حیات...... اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ ابرش کو بہت سارے پیار۔ آپا نسرین کو آداب......''

''جی وعلیکم آداب۔'' وہ ہنسی۔ ''جیتی رہو یوں

ہی ہنستی رہو۔"
ذنیرہ نے صبح اٹھتے اماں کو تفصیل بتائی۔ وہ مسکرانے لگیں۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ سب جلدی جاگ گئے تھے۔ اشعر بھی آنکھیں ملتے کمرے سے نکل آئے۔ آج آپ سب اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے۔
"آج ہم لوگ چھوٹی خالہ کے گھر جائیں گے۔" اذکاء نے کہا۔ "جبکہ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھانا ہے۔"
"ارے یہ اچانک بغیر پروگرام کے کیسے موڈ بن گیا ......" وہ ذنیرہ سے مخاطب تھا۔ انہوں نے ذنیرہ کو اشارے سے بلایا وہ بھائی کا اشارہ سمجھ گئی۔ مگر انجان بن گئی۔ وہ کچن میں گھس گئی۔ اسے بھائی کو ستانے میں مزہ آرہا تھا۔
اشعر نے اپنے کمرے سے آواز لگائی۔
"ذنیرہ میرے سوکس کہاں ہیں......؟"
"بھائی شوز کے اندر ہوں گے۔" وہ وہیں سے بولی۔
"میری ٹائی کدھر ہے؟"
"وہ کھونٹی پر ہوگی۔"
"بھئی اب رومال نہیں مل رہا ہے۔" ان کی جھنجھلائی آواز ابھری۔
"افوہ۔ کیا مصیبت ہے۔ بھائی آج تو چھٹی کا دن ہے، بلاوجہ شور مچا رہے ہیں۔"
امی نے جا کر ٹائی ہاتھ میں پکڑا دی۔ وہ سب کمرے میں پھینک کر باہر آ گئے۔
"تمہارے پاؤں میں کیا مہندی لگی ہے، کتنی آوازیں دے رہا ہوں تس سے مس نہیں ہو رہی ہو۔ ذرا گھر میں بھاگا دوڑا کرو، موٹی ہو جاؤ گی تو چلنا پھرنا دوبھر ہو جائے گا۔" اس نے غصے سے بہن کو گھورا۔
ذنیرہ نے ہنستے ہوئے بھائی کو منہ چڑایا۔ ناشتے کی میز پر اشعر نے دبے لفظوں میں اپنا مدعا بیان کیا۔
امی ابا دونوں خوش ہو گئے۔
"بیٹا! میں اور تمہارے ابا بھی یہی سوچ رہے تھے مگر ہم نے سوچا وہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہم اتنی بڑی جائیداد، بینک بیلنس دیکھ کر لالچ میں یہ رشتہ کر رہے ہیں۔"
"نہیں۔ میرا خیال ان لوگوں کی سوچ ایسی نہیں بلکہ وہ خوش ہو جائیں گے۔"
"مجھے ذنیرہ نے صبح ہی بتایا کہ امی ہم آج چل کر خالہ خالو سے بات کر کے دیکھتے۔ ہیں مان گئے بہت اچھا ورنہ زبردستی تو نہیں ہے۔" امی نے اپنا منشا ظاہر کیا۔
بڑی بہن کو اپنے گھر میں دیکھ کر حلیمہ بیگم خوشی سے کھل اٹھیں۔ اذکاء بھاگ کر کبھی ٹھنڈا پانی لاتی، کبھی ٹھنڈی کوک لاتی، کبھی بھاگ کر کچن میں گئی۔ نمکو نمک پارے، سموسے، بہت سارا ناشتہ چائے کے ساتھ لے آئی۔
"اری بیٹا! کیا ہو گیا ہے کھانا نہیں کھلائے گی جو الا بلا سے ہمارا پیٹ بھر رہی ہے۔" خالہ نے مذاق کیا تو اذکاء کو واقعی خیال آیا یہ تو مجھے کھانے کے بعد کرنا چاہیے تھا۔ وہ خالہ خالو اور کزن کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اس پر جب یہ بات چھڑی تو ذنیرہ کے گلے لگ گئی۔
"سچ...... میں تو ہمیشہ یہی کہتی تھی آپی۔ تم اشعر بھائی ہی سے شادی کرنا۔ اور جس روز اس انداز میں شادی ہوئی تو آپی اتنا روئیں کہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔"
وہ لوگ خوشی خوشی گھر واپس آئے امی نے بتایا کہ حلیمہ کہہ رہی تھی ایک بار ثمرہ سے اس کا عندیہ لے لوں تو پھر آپ کو بتا دوں گی...... طے یہ پایا کہ ہم لوگ اچانک ثمرہ کے گھر پہنچیں گے اور سب کے سامنے بات کریں گے۔
نسرین خوشی سے...... ثمرہ کے کمرے کی طرف لپکی۔
"ثمرہ...... بھئی ایک خوش خبری ہے۔ مٹھائی کھلاؤ تو میں سناؤں گی۔" ثمرہ مسکرانے لگی۔
"بولو۔ کیا کھاؤ گی۔ تم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ تم نے مجھے اپنوں سے زیادہ حوصلہ دیا۔ رات

دن میری بھلائی چاہتی ہو، اپنی دعاؤں میں مجھے یاد، میرے دکھ اور تکلیف خود اپنا دکھ اور تکلیف میری پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھ کر حل نکالتی ہو۔ جان بھی مانگو تو حاضر ہے۔'' ثمرہ ہنسی......

''نہیں مجھے تمہاری جان نہیں چاہیے۔ اپنی جان کو سنبھال کر رکھنا، کل کسی اور کے کام آئے گی۔'' نسرین ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

''ارے تم نے خوش خبری تو سنائی بھی نہیں۔ مم ثمرہ نے پیچھے سے آواز لگائی۔ تب ہی گیٹ کی بیل نے کسی کے آنے کا پیغام دیا۔

''یہ ہے خوش خبری۔'' نسرین ہنسی۔

''بی بی ثمرہ! امی خالہ سب آئے ہیں۔'' بابا نے آ کر اطلاع دی اور باتوں کی آواز قریب آنے لگی۔

سب کو دیکھ کر وہ خوش ہو گئی۔ باری باری سب کے گلے ملی ابرش کبھی کسی کی گود میں تو کبھی کسی کی۔ گھما گھمی بزرگوں کی آمد ذنیرہ اور ثمرہ نسرین کی باتیں ہر موضوع پر......

''اشعر نہیں آئے۔'' بے ساختہ ثمرہ کی زبان سے نکلا......

''نہیں اگر تم کہتی ہو تو ابھی بلا لیتی ہوں۔'' ذنیرہ نے شرارت سے آنکھ دبا کر نسرین کی طرف دیکھا...... تب ہی اشعر داخل ہوئے ہاتھ میں مٹھائی اور پھل فروٹ سے لدے شاپرز تھے۔

خوب صورت حسین رنگ برنگے کھلونے ابرش کے لیے ابرش اس کی طرف لپکی۔ فرحانہ کے انتقال پر تین دنوں میں وہ زیادہ تر اشعر کے گود میں رہی یوں ان سے مانوس ہو گئی تھی۔ سب ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ماحول بے حد پرسکون تھا۔ ہر گزرتا لمحہ خوب سے خوب تر...... گنگناتا گزر رہا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ مطمئن اور خوش تھا۔ اور مثبت امید رکھتا تھا۔

امی نے دھیرے سے کچھ کہا۔ ثمرہ نے سر جھکا لیا۔

''امی جب ابا نے کہا تو میں نے سر جھکایا تھا۔ ایک بار پھر آپ کے کہنے پر میں نے سر جھکا لیا۔ آپ سب ہمارے لیے دعا کریں۔ جب آپ سب راضی ہیں تو میں کیسے انکار کر سکتی ہوں۔''

سب نے یک زبان ثمرہ کو ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالیں۔

قاضی صاحب نے اپنا کام کیا...... سارے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے۔ سب نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ بڑے ہی اچھے ماحول میں پرلطف کھانا کھایا گیا اور مختلف چیزوں سے مہمانوں کا خیر مقدم کیا گیا۔

سب اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔

نسرین بھی بہت تھکی ہوئی تھی۔ جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اشعر ثمرہ کے قریب آ گیا۔ سرگوشی کے انداز میں بیڈ روم میں چلنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ ابرش کو نسرین اپنے پاس ہی سلاتی تھی، وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے گئی۔

اشعر نے ثمرہ کی طرف دیکھا۔

''جان...... بہت تھک گئی ہو۔ اب آرام کرو۔ کل سے ڈھیروں مصروفیت ہو گی اور آپ کے اپنا اشعر ہو گا۔'' وہ بستر پر لیٹتے ہوئے بولے۔ تو ثمرہ مسکرانے لگی۔

''کیا مقصد ہے آپ کا......؟'' وہ بولی۔

''بھئی صاف ظاہر ہے، آج جلدی سو جاتے ہیں۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ثمرہ کو اپنے قریب لٹا لیا۔

رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ سرگوشی کے انداز میں اشعر نے شعر گنگنایا۔

یوں اچانک تجھے پایا میں نے
جیسے تاثیر دعا میں آئے

اس نے آنکھیں موند لیں جیسے سارے جہاں کی طمانیت ثمرہ کے وجود میں اتر آئی ہو۔ وہ اشعر کی بانہوں میں سمٹ آئی۔

☆☆

شہرِ دل

عذرا فردوس

حقیقتوں کو نظر انداز کرکے سراب کے پیچھے بھاگنے والوں کے نصیب میں سوائے محرومیوں کے کچھ نہیں آتا۔ یہی زندگی کا اصول ہے کہ محبتوں کو جھٹلانا بھی نعمتوں کی بے قدری ہے۔

زندگی کے انہی پیچ وخم سے نبرد آزما ہوتی ایک لڑکی کی کتھا

سبرینا چند برسوں میں اس قدر خوب صورت قد کاٹھ نکال کر بندے کو ہوش سے بے گانہ کردینے والے سانچے میں ڈھل جائے گی یہ تو روحان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

سبرینا سے بڑی دونوں بہنوں کی شادیاں ابا نے میٹرک کرتے ہی کردی تھیں۔ سبرینا کی ضد تھی کہ وہ آگے بھی پڑھے گی مگر مسئلہ یہ تھا کہ مامی کے انٹر پاس بیٹے کو سبرینا پسند آگئی تھی اور روحان اس کو اپنی ملکیت تصور کرنے لگا تھا۔

روحان کچھ مہینوں پہلے اپنے والدین کے ساتھ گاؤں سے شہر منتقل ہوا تھا وہ بغیر کسی وجہ کے سبرینا کو اپنی ملکیت تصور کرنے لگا تھا حالانکہ سبرینا کے والدین نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ مگر کیوں کہ روحان کے والدین نے اپنی خواہش کا اظہار بار بار اس سے کیا تھا اس لیے گھر میں ہونے والی اکثر وبیشتر گفتگو کا اثر یہ پڑا تھا کہ روحان، سبرینا کو اپنی منگیتر محسوس کرنے لگا تھا۔

ایک دن روحان نے سبرینا کو جیولری سیٹ لاکر دیا اس وقت وہ فرسٹ ایئر کے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

''یہ سیٹ تم میرے لیے کس خوشی میں لائے ہو۔'' روحان بھائی؟

''تم مجھے بھائی کیوں کہتی ہو صرف روحان کہا کرو۔'' وہ بدمزا ہوکر بولا۔

''تم دوسال مجھ سے بڑے ہو۔ اس لیے میں تم کو بھائی کہوں گی ویسے روحان تم نے بتایا نہیں کہ یہ سیٹ تم نے مجھے کیوں دیا ہے۔'' روحان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''سیدھی سی بات ہے تم مجھے اچھی لگتی ہو میری ہونے والی بیوی ہو۔''

''یہ کیا بکواس کررہے ہو میں کب سے تمہاری کچھ ہونے لگی لے جاؤ اپنا سیٹ مجھے نہیں چاہیے۔'' سبرینا نے سیٹ اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔

''یاد رکھو تمہاری شادی مجھ سے ہوگی اگر تم میری نہیں ہوسکتیں تو کسی اور کی بھی نہیں۔'' روحان نے سیٹ اٹھا کر دیوار پر مارا اور تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف نکلنے لگے۔

''روحان بیٹا کہاں چل دیے بیٹھو میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔'' سبرینا کی امی نے اسے جاتے دیکھ کر کہا۔

''آپ کی بیٹی نے اتنی باتیں سنائی ہیں کہ کچھ کھانے کا جی نہیں چاہ رہا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے گیٹ کھولا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی فرخندہ جبیں، سبرینا کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی رونے

میں مصروف تھی۔ بیڈ کے اوپر کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا تم دونوں کی کس بات پر لڑائی ہوئی ہے۔''

''امی وہ مجھے دھمکی دے کر گیا ہے۔''

''کیسی دھمکی؟''

''امی آپ اس سے پوچھ لیں مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں۔'' وہ ٹالنے لگی۔

''سیدھے سے مجھے بتاؤ اس نے کیا دھمکی دی ہے میں اس کی اچھی طرح خبر لیتی ہوں۔''

''امی وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم میری نہیں ہوسکتیں تو کسی اور کی بھی نہیں ہوسکتیں۔'' وہ چیخ کر بولی مگر اس کی توقع کے برخلاف امی ناراضی کے بجائے مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ کر اسے چپ کرانے لگیں۔

''کیا ہوا اگر اس نے ایسا کہہ دیا کہنے دو اسے۔''

''کیوں؟ کیوں کہنے دو؟ کیا میں اس کی منگیتر ہوں اس کا مطلب نہیں معلوم آپ کو؟'' وہ حیران ہوکر امی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

''روحان اپنے گھر کا بچہ ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں اس سے اگر تمہارا رشتہ طے ہوگیا تو کیا برا

ہے۔" فرخندہ جبیں خوش ہو کر بولیں۔
"امی مجھے وہ پسند نہیں میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں مجھے اس کے ساتھ نہیں بندھنا۔"
"میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں ماں ہو کر میں تمہارا برا کب چاہوں گی۔"
"نہیں امی مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ابھی مجھے آگے پڑھنا ہے میں شادی کے بندھن میں بندھ کر اپنی تعلیم نہیں چھوڑنا چاہتی ابا بھی چاہتے ہیں کہ میں پڑھوں۔" سبرینا کی بات سن کر فرخندہ جبیں اٹھ کر چلی گئیں۔
تین روز بعد بجیلہ مامی روحان کا رشتہ لے کر آگئیں۔ ریحان احمد اور فرخندہ جبیں نے اپنی بیٹی کی مرضی نہ ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا۔ بجیلہ مامی ایک دم پھٹ پڑیں۔
"ریحان بھائی! جب اپنی اولاد کی باری آئی تو کمزور پڑ گئے نا ویسے تو آپ بڑا کہتے تھے کہ لڑکیوں کو زیادہ نہیں پڑھانا چاہیے۔"
"ہاں میں نے کہا تھا مگر اب وقت بدل گیا ہے تعلیم تو لڑکیوں کے لیے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ لڑکوں کے لیے پھر اپنی سبرینہ کو پڑھنے کا شوق ہے تب ہی میں اسے پڑھا رہا ہوں۔ سیدھی سی بات ہے سبرینہ، روحان سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہے پھر خدا اور رسول کا حکم بھی یہی ہے کہ لڑکی کی مرضی کے بغیر اس کا بیاہ نہیں کرنا چاہیے۔" ریحان احمد نے آخر کار کہہ دیا۔
بجیلہ مامی غصے میں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ اس دن کے بعد سے روحان نے سبرینہ کے گھر آنا بہت کم کر دیا تھا۔
ایک دن وہ آیا تو بتانے لگا کہ پرائیویٹ بی کام کی تیاری کر رہا ہے۔
"بہت جلدی تمہیں دوبارہ پڑھنے کا خیال آ گیا۔" سبرینا نے طنز کیا ان دنوں وہ اپنی پھوپھو کے بیٹے میں انٹرسٹڈ تھی۔ یاسر انجینئرنگ پاس کر چکا تھا اور اچھی جگہ پر جاب کر رہا تھا۔
"میں جانتا ہوں تم آج کل جاگتی آنکھوں سے یاسر کے سپنے دیکھ رہی ہو مگر میری ایک بات یاد رکھنا تمہاری پھوپھو تمہیں کسی قیمت پر اپنی بہو بنانے پر تیار نہیں ہوں گی۔"
"تم کون ہوتے ہو میرے معاملے میں بولنے والے پھوپھو مجھے بہت چاہتی ہیں تم خوامخواہ یاسر سے جیلس ہو رہے ہو وہ تمہارے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔"
"بڑی خوش فہمی ہے تمہیں یاسر صرف تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے وہ شادی کسی اور سے کرے گا۔"
"روحان مجھے تم سے اس موضوع پر بات نہیں کرنی تم جاؤ یہاں سے مجھے پڑھائی کرنی ہے۔"
"جانتا ہوں کتنی پڑھائی کرنی ہے روحان نے کتابیں ایک طرف اچھال دیں اور مسکرانے لگا۔"
"تم نہیں سدھرو گے مجھے تم سے بات کرنی نہیں چاہیے تھی میں ہی بے وقوف ہوں۔"
"خیر بے وقوف تو تم ہو کسی ایسے شخص سے محبت کرو جو تمہاری خاطر گھر والوں سے ٹکر لینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔"
روحان نے دھیمی اور بوجھل آواز میں کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ سبرینا کتابیں سمیٹنے لگی۔ روحان کی باتیں اس کے دل میں بہت سے وسوسے پیدا کر رہی تھیں۔
سبرینا یاسر سے محبت کرتی تھی اور یاسر بھی اس کی محبت کے جواب میں اس سے اتنی ہی محبت کرتا تھا۔ سبرینا اپنے دل کو تسلی دینے لگی دو دن بعد یاسر آ گیا موقع ملتے ہی سبرینا نے اس سے پوچھا۔
"یاسر تم نے پھوپھو کو بتایا ہے کہ تم مجھ میں انٹرسٹڈ ہو۔"
"نہیں مگر تم فکر نہ کرو امی کل ہی کہہ رہی تھیں کہ میں تمہارے لیے خاندان ہی میں سے کسی کی لڑکی لوں گی۔ تمہیں خاندان میں شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں۔ میں نے کہہ دیا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

”مگر اس بات کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ہمارے گھر رشتہ لے کر آنے والی ہیں۔“

”امی خاندان میں رشتہ کریں گی تو تم سے وہ تو تمہیں بہت پسند کرتی ہیں کہتی ہیں تم جیسی ہیرا لڑکی پورے خاندان میں نہیں ہے۔“

”کیا واقعی؟“ سبرینا کا چہرہ کھل اٹھا یاسر کی باتوں نے اسے مطمئن کر دیا تھا مگر اس کا اطمینان چند روز کا تھا۔

پھوپھو نے اپنے دیور کی بیٹی سے یاسر کی منگنی کر دی۔ سبرینا حیرت اور بے یقینی سے اس تقریب کو دیکھتی رہ گئی۔ منگنی کے اگلے دن یاسر مٹھائی لے کر سبرینا کے گھر آیا۔ سبرینا اسے دیکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔

”مجھے معاف کر دینا امی کسی صورت اس رشتے پر رضی نہیں تھیں۔ تمہارے گھر شادی کرنے پر۔ انہیں اعتراض تھا وہ میری شادی کسی ایسی لڑکی سے کرنا چاہتی تھیں جو ڈاکٹر ہو شرمین کو امی نے اسی لیے پسند کیا کہ وہ میڈیکل میں پڑھ رہی ہے۔“

”اور تم ان سے کچھ نہیں بولے۔“ سبرینا کا شکوہ زبان پر آ گیا۔

”میں نے امی سے تمہارے متعلق بات کی تھی انہوں نے منع کر دیا۔ میں اپنی ماں کو ناراض تو نہیں کر سکتا تھا۔“ اتنا کہہ کر یاسر چلا گیا۔

سبرینا آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے اس نے اپنی تمام تر توجہ پڑھائی کی طرف کر دی۔ روحان کے متعلق اسے خبر ملی تھی کہ وہ بیرون ملک روزگار کے سلسلے میں جا رہا ہے۔ پھر ایک دن وہ جانے سے پہلے ملنے بھی آیا۔

”سنا ہے تم آئرلینڈ جا رہے ہو وہ بھی اسٹوڈنٹ ویزے پر۔ یہاں تو تم کچھ پڑھ نہیں سکے وہاں کیا تیر مارو گے۔“ سبرینا نے اس پر طنز کیا۔

”تیر تو تم بھی نہیں مار سکیں بڑا زعم تھا تمہیں اپنی پسند پر خیر اب بھی وقت ہے تم چاہو تو مجھ سے شادی کر سکتی ہو۔“

”شروع ہو گئی تمہاری فضول بکواس، تم سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں کنواری رہوں۔“

”کب تمہاری روانگی ہے؟“ سبرینا نے موضوع بدلا۔

”پرسوں امی اور ابا نے فیصلہ کیا ہے میرے جانے کے بعد وہ لوگ بھی واپس گاؤں چلے جائیں گے۔“

”روحان کھانا لگ گیا ہے آؤ کھا لو۔“ فرخندہ جبیں نے کمرے میں آ کر کہا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

سبرینا نے بھی امی کے ساتھ اس کی مہمان داری میں حصہ لیا۔ کھانے کے بعد روحان فوراً چلا گیا۔ سبرینا رات گئے پڑھنے میں مصروف رہی۔ اس کے سمسٹر چل رہے تھے۔ وقت کچھ اور آگے سرکا سبرینا کا ایم اے مکمل ہو گیا۔

ابا اور امی کو اب اس کی شادی کی فکر تھی خاندان میں اس کے معیار کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ جو لڑکے اعلا تعلیم یافتہ تھے ان کی شادیاں ہو گئی تھیں، ریحان احمد کے ایک کزن کا اپنا کالج تھا سبرینا نے مصروف رہنے کے لیے ان کے کالج میں جاب کر لی۔

سبرینا کے جاب کرنے کے باعث گھر کے حالات پہلے سے قدرے بہتر ہو گئے تھے۔ ریحان احمد نے اپنے کزن ارشاد احمد کو ایک دن گھر میں دعوت پر بھی بلایا۔ ارشاد احمد نے ان کی غربت کو مد نظر رکھتے ہوئے انکار کیا۔

”ارشاد تم ویسے تو ہمارے گھر آتے نہیں ہو دعوت کے بہانے آ جاؤ اور ہاں فوزیہ کو بھی ساتھ لے کر آنا۔“

”ریحان بھائی! فوزیہ تو کہیں آتی جاتی نہیں اگر وہ آپ کے گھر آنے پر تیار ہو گئی تو میں ضرور ساتھ لے کر آؤں گا۔“ ارشاد احمد دعوت والے دن اپنی بیوی فوزیہ کے بغیر آئے۔

”ریحان بھائی آپ نے اپنی دونوں بڑی بیٹیوں کی شادیاں کم عمری میں کر دیں سبرینا کی تعلیم مکمل ہو گئی ہے۔ اس کی شادی کے بارے میں آپ

نے کیا سوچا ہے۔'' ارشاد احمد نے کھانے سے فارغ ہوکر کہا۔

''سوچنا کیا ہے سبرینا کے لیے خاندان میں کوئی رشتہ موجود نہیں ہے جو لڑکے تعلیم یافتہ تھے ان کی شادیاں ہوگئی ہیں۔ باہر سے جو لوگ رشتہ لے کر آتے ہیں وہ گھر کی حالت دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ دو کمروں کا ہمارا مکان ہے وہ بھی کرائے کا۔ لوگ یہی سوچتے ہیں کہ ہم بیٹی کو جہیز کیا دیں گے۔''

اتنے میں سبرینا چائے لے کر آگئی اس نے کپ ارشاد احمد کی طرف بڑھایا۔ ارشاد احمد نے پہلی بار سبرینا کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ سبرینا اچھی خاصی خوب صورت تھی۔ محض جہیز نہ ہونے کی بناء پر اس کی شادی نہیں ہو پا رہی تھی۔ سبرینا اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔ ارشاد احمد اور سبرینا کے درمیان صرف رسمی بات چیت ہوتی تھی۔

ارشاد احمد ان دنوں اپنی بیوی فوزیہ کے رویے سے بہت پریشان تھے۔ فوزیہ اپنے بھائیوں کے پاس کینیڈا اسیٹل ہونا چاہتی تھی اس کی ضد کی وجہ سے ارشاد احمد سخت پریشان تھے۔ اگلے دن سبرینا کالج پہنچی تو ارشاد احمد کے چہرے پر لکھی پریشانی اس نے پڑھ لی۔

''کیا بات ہے سر؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''طبیعت تو ٹھیک ہے گھر کے حالات ٹھیک نہیں فوزیہ بہت جلد اپنے والدین کے پاس کینیڈا جا رہی ہے اس کا اصرار ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ چلوں میں کینیڈا جا کر کیا کروں گا۔ میں یہاں پر اچھا خاصا سیٹ ہوں۔ مگر وہ ہے کہ میری ایک نہیں سن رہی۔ جس دن سے میری اس سے شادی ہوئی ہے ایک دن بھی چین سے نہیں گزرا ہے میری بدولت یہ شادی اتنا چل گئی ہے مگر اب مجھے لگ رہا ہے کہ اس شادی کو مزید نبھانا میرے بس میں نہیں رہا ہے۔''

''سر! آپ ٹینشن نہ لیں ہوسکتا ہے کہ آپ کی مسز آپ کی بات مان لیں۔'' سبرینا نے تسلی دی اور اپنی کلاس لینے چلی گئی۔ کالج سے فارغ ہوتے ہوتے اسے تین بج گئے۔ گھر پہنچی تو وہ بری طرح تھکی ہوئی تھی کھانا کھا کر لیٹنے کی تیاری کر رہی تھی کہ اس کی دوست کا فون آ گیا۔

''آج شام میں تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''کوئی خاص پروگرام نہیں وہی روٹین کی کام ہیں تم سناؤ کیسے یاد کیا ہے؟ اور یہ شور کیسا ہے؟ کہیں باہر سے فون کر رہی ہو تمہاری آواز صاف سنائی نہیں دے رہی۔''

''میں گھر سے بول رہی ہوں۔'' سجوین چیخ کر بولی۔

''آج میرے بھتیجے کا عقیقہ اور سالگرہ ہے اس کی تیاری کے سلسلے میں شور ہو رہا ہے۔ تم آٹھ بجے سے پہلے میری گھر آ جانا۔''

''میں تو ہرگز نہیں آؤں گی تم نے دو ایک دن پہلے دعوت کیوں نہیں دی۔''

''بھئی اچانک ہم سب گھر والوں کا پروگرام بن گیا ہے۔ ویسے بھی میرے گھر آنے میں تمہارا فائدہ ہے۔ میرا کزن دبئی سے آیا ہوا ہے خالہ اس کے لیے لڑکی کی تلاش میں ہیں۔ میں نے تمہاری تصویر ارسل کو دکھائی تھی۔ اسے تم پسند آ گئی ہو آج کی تقریب میں تم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لینا۔ خالہ سے بھی تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔ سمجھو تمہاری شادی پکی۔ اب زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں سیدھے سے آ جانا اور ہاں تحفہ لانا مت بھولنا اچھا میں فون بند کر رہی ہوں اور لوگوں کو بھی انوائٹ کرنا ہے۔''

سجوین نے کھٹاک سے فون رکھ دیا۔ سبرینا سوچ رہی تھی کہ وہ آج کی تقریب میں جائے یا نہ جائے کچھ سوچ کر اس نے اپنی الماری کھولی اور کپڑوں کا جائزہ لینے لگی وہ تقریب میں سب سے منفرد نظر آنا چاہتی تھی ٹھیک آٹھ بجے وہ سجوین کے گھر پہنچ گئی۔ گھر میں بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔

سجوین، سبرینا کا تعارف اپنے رشتہ داروں

سے کروا رہی تھی۔ پھر آخر میں اس نے ارسل سے اس کا تعارف کرایا۔ اتنے میں کیک کاٹنے کی رسم ہونے لگی۔ سجوین، سبرینا کا ہاتھ پکڑے ٹیبل کے پاس آ گئی۔ سبرینا نے سامنے کی طرف دیکھا تو اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ بچوں اور عورتوں کے پیچھے دیوار کے پاس ارسل کھڑا ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

ارسل سے نظریں چار ہوتے ہی اس کے دل کی حالت عجیب سی ہونے لگی۔ ارسل پروقار اور سحر انگیز شخصیت کا پیکر تھا۔ اسی لمحے ارسل نے اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ ایک پل کے لیے ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں۔

اس کی نظریں ارسل کی نظروں کی گرفت سے نکل کر جھک گئیں ہونے والی بات ہو چکی تھی جو بات زبان نہیں کہہ سکی تھی وہ نگاہوں کی زبان نے کہہ دی تھی۔ محبت کے یہ لمحات اس پر کسی پرانی شراب کے خمار کی طرح چھا گئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد جب میز پر کھانا چنا گیا تو وہ اپنی پلیٹ میں بریانی لے کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ کھانے کی میز پر ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔

ارسل نے اسے اکیلا کھڑا دیکھا تو اپنی پلیٹ لے کر اس کے پاس آ گیا۔

ارسل کے ہونٹوں پر ایک دل کش مسکراہٹ تھی۔ ارسل نے بھی اپنائیت کے لہجے میں کہا۔

سجوین نے بتایا کہ آپ کسی کالج میں پڑھاتی ہیں۔ آپ تو بہت قابل اور باصلاحیت ہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ اور ترقی کریں گی۔

"شکریہ...... آپ دبئی سے کتنے دنوں کی چھٹی پر آئے ہوئے ہیں۔"

"دو مہینے کے لیے میں اپنی بہن ماہین کی شادی کے لیے آیا ہوں۔ اس کے لیے دو تین رشتے آئے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی شادی جلد ہو جائے وہ تیس برس کی ہو رہی ہے۔"

اتنے میں ماہین بھی ادھر آ گئی۔

"بھائی آپ نے ابھی تک کھانا ختم نہیں کیا۔ امی چلنے کا کہہ رہی ہیں۔ صدیقہ ممانی کہہ رہی ہیں میں تم لوگوں کو گھر چھوڑ دیتی ہوں۔"

"تم امی کے ساتھ چلی جاؤ مجھے کچھ دیر ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے میں امی کو بتا دیتی ہوں۔" ماہین چلی گئی تو ارسل دوبارہ سبرینا سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔

سبرینا کو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ان دونوں کی پہلی ملاقات ہے وہ اس کی سحر انگیز شخصیت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ تو ماہین کو دیکھ کر حیران تھی ماہی کسی طرح سے ارسل کی بہن نہیں لگتی تھی کہنے کو تیس برس کی تھی لیکن دیکھنے میں چھتیس، پینتیس کی لگتی تھی۔ اس کی رنگت سانولی اور بے کشش تھی۔ میک اپ کرنے اور اسٹائلش لباس زیب تن کرنے کے باوجود اس کی شخصیت میں کوئی کشش نہیں تھی۔

سبرینا، ماہین کے بارے میں سوچ رہی تھی دونوں بہن بھائی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اس کے باوجود دونوں کی شکلوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر ماہین کو ارسل کا رنگ و روپ مل جاتا تو اس کی شادی کب کی ہو جاتی۔

رات گیارہ بجے وہ گھر پہنچی ارسل نے اس کو گھر چھوڑا تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ کپڑے تبدیل کر کے لیٹ گئی۔ اس کے تصور میں ارسل کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کا دل کش سراپا دل میں اترنے لگا تھا۔ بند آنکھیں بھی ارسل کو اس کی نظروں سے دور نہ کر سکیں اور پھر اسی مسحور کن کیفیت کے ساتھ وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

صبح اٹھ کر وہ ناشتا کر رہی تھی ناشتے کے دوران امی اس سے پوچھنے لگیں۔

"سبرینا تم رات کو سجوین کے کزن کے ساتھ کیوں آئی تھیں۔"

"امی، دیر ہو گئی تھی سجو نے اپنے کزن سے کہا تھا

کہ مجھے گھر چھوڑ دے۔"
"اتنی دیر تک رکنے کی کیا ضرورت تھی تھوڑا پہلے نکلتیں اگر دیر ہوگئی تھی تو فون کر دیتیں تمہارے ابا، سجوین کے گھر جا کر تمہیں لے آتے۔ اس طرح کسی پرائے لڑکے کے ساتھ آنے پر تم جانتی نہیں ہو کسی محلے دار نے دیکھ لیا تو طرح طرح کی باتیں بنائے گا۔"
"امی لوگوں کا کام ہی باتیں بنانا ہے ہم کب تک لوگوں کی پروا کریں گے۔" سبرینا نے پرس اٹھایا اور گھر سے نکل گئی۔ وہ کالج نو بجے سے پہلے پہنچ گئی ارشاد احمد آج کالج نہیں آئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اپنی کلاسز لینے میں مصروف رہی۔
گھر پہنچتے ہی ارسل کا فون آ گیا۔ وہ اس سے ملنے کا کہہ رہا تھا۔
"نہیں بھئی آج تو میں ہرگز نہیں آ سکتی۔ ہاں دو تین روز کے بعد تم سے ملاقات کر سکتی ہوں۔ امی کل رات تمہارے ساتھ آنے پر غصہ ہو رہی تھیں۔"
سبرینا نے اسے منع کر دیا دو روز بعد وہ سجوین کے گھر پہنچ گئی۔
ارسل وہاں موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنی امی کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے اسلام آباد جا رہا ہے۔ ماہین کے لیے ایک رشتہ آیا ہوا ہے اس کی شادی کے معاملات طے کرنے ہیں دعا کرو۔ ماہین کا رشتہ طے ہو جائے جیسے ہی میں واپس لاہور آیا امی کو تمہارے گھر رشتہ لینے کے لیے بھیجوں گا۔"
سجوین نے اسے کھانے پر روک لیا وہ کھانا کھا کر وہاں سے نکل رہی تھی۔ تو ارسل اسے آئس کریم کھلانے لے گیا واپس پر سبرینا کو اس نے اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر اتار دیا وہ ارسل سے ملاقات کا خمار لیے گھر پہنچی۔
اگلے دن وہ کالج پہنچی تو معلوم ہوا کہ ارشاد احمد آج بھی غیر حاضر ہیں ان کی غیر موجودگی میں کالج کا انتظام بخوبی چل رہا تھا۔
"ایک ہفتے کے بعد ارشاد احمد آئے تو وہ تھکے تھکے اور افسردہ تھے۔"
"شکر ہے سر آپ ڈیوٹی پر آئے۔ گھر میں تو سب خیر خیریت ہے۔" سبرینا کے اس سوال پر ارشاد احمد کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"خیریت ہے بھی اور نہیں بھی فوزیہ میری مرضی کے بغیر کینیڈا اسیٹل ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے پریشان ہوں۔"
"آپ کی دونوں بیٹیاں۔"
"وہ اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے یا غلط۔"
"سر میں کیا کہہ سکتی ہوں بہرحال یہ اچھا نہیں ہوا امی، ابا کو پتا چلے گا تو وہ بھی افسوس کریں گے امی، اکثر آپ کے بارے میں پوچھتی رہتی ہیں۔ اچھا سر میں جا رہی ہوں میری کلاس کا وقت ہو رہا ہے۔"
وہ ارشاد احمد کے آفس سے نکل کر کلاس میں مصروف ہوگئی۔
دوپہر کو وہ گھر جانے کے لیے نکلی تو موسم خاصا خوشگوار تھا موسم نے اسے بے اختیار ارسل کی یاد دلائی تھی۔ وہ ارسل کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ بے چارہ اپنی بہن کی شادی کی وجہ سے کتنا پریشان تھا۔
وہ دل ہی دل میں ماہین کی شادی طے ہونے کی دعا کرنے لگی، ایک ہفتے بعد ارسل واپس آ گیا مگر اس کی والدہ سبرینا کا رشتہ لے کر نہیں آئی۔ ارسل نے اسے فون پر بتا دیا تھا کہ ماہین کا رشتے طے ہوگیا ہے لڑکے والوں نے شرط رکھ دی ہے کہ میں لڑکے کی بہن سے شادی کرلوں تب ہی لڑکا ماہین سے شادی کرے گا اپنی بہن کے مستقبل کے لیے میرے پاس ہامی بھرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا تم بتاؤ کیا میں نے غلط کیا۔" سبرینا کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ ارسل کی مجبوری کو وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ ارسل آگے گفتگو کرتے ہوئے کیا کہہ رہا تھا۔ سبرینا کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ فون بند کرنے کے بعد وہ اپنی

بے بسی پر آنسو بہاتی رہی وہ اپنی تقدیر پر افسوس کر رہی تھی۔

محبت میں ناکامی اس کا مقدر ٹھہری تھی پہلے یاسر اور اب ارسل کافی دیر رونے کے بعد جب دل کا غبار ہلکا ہوگیا تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اب کبھی شادی نہیں کرے گی۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنے اسٹوڈنٹ کی طرف مرکوز کردی تھی۔

کچھ دنوں بعد سبرینا کی گورنمنٹ کالج میں تقرری ہوگئی۔ امی، ابا بہت خوش تھے۔

اس کی تنخواہ پہلے سے بہتر ہوگئی تھی۔ ریحان احمد کو ایک دن دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی وفات کے بعد فرخندہ جبیں پریشان رہنے لگیں۔ انہیں ہر وقت سبرینا کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

اتوار کا دن تھا شام کے وقت ارشاد احمد اچانک ملنے چلے آئے۔ ریحان احمد کی وفات کے بعد وہ کئی مرتبہ ان کے گھر آ چکے تھے۔

''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔'' انہوں نے رسمی گفتگو کے بعد فرخندہ جبیں سے پوچھا۔

''نہیں فی الحال تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی جو آپ خیر خیریت پوچھنے آجاتے ہیں۔ اب تو ایک ہی فکر ہے سبرینا کی جلد سے جلد شادی ہوجائے۔''

''میں نے کئی رشتے تو بھیجے تھے سبرینا نے منع کردیا۔'' ارشاد احمد بولے۔

''اس کی تو ایک ہی رٹ ہے مجھے شادی نہیں کرنی اچھی خاصی عمر ہوگئی ہے۔ آپ ہی سمجھائیں۔''

اتنے میں سبرینا بھی چائے بنا کر لے آئی۔

''انکل کالج کیسا چل رہا ہے؟''

''کالج تو میں نے اپنے دوست کے حوالے کر دیا ہے۔ اب وہ جانیں اور ان کا کام۔''

''کیوں کیا آپ کوئی اور کام کریں گے۔'' سبرینا نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

''میں کینیڈا جا رہا ہوں اپنے بیوی بچوں کے پاس۔''

''انکل میں آپ کو بہت مس کروں گی آپ نے ہمیشہ میری رہنمائی کی ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ جلدی سے کوئی اچھا سا رشتہ پسند کر کے اپنا گھر بسالیں۔ عورت کو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اچھی ملازمت یا دولت اس کے لیے مضبوط سہارا نہیں ہے۔ اس کا اصل سہارا مرد ہی ہوتا ہے۔''

سبرینا نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

''آپ کی بات سے مجھے انکار نہیں ہے۔ مجھے شادی کے نام سے چڑ ہوگئی ہے۔ لوگ میری ملازمت کی وجہ سے مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''سبرینا! بعض اوقات ہمیں کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ہم زندگی میں جس چیز کی خواہش کریں وہ ہمیں ملے بہت سے مرد چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی ملازمت پیشہ ہو جس حساب سے مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ ایک فرد کی کمائی سے گھر کا چلنا مشکل ہے۔ پھر ہماری خواہشات پہلے کے مقابلے میں کافی بڑھ چکی ہیں۔ ایسے میں کوئی عورت معاشی میدان میں مرد کا ہاتھ بٹاتی ہے تو یہ اس کی عظیم قربانی ہے۔''

''انکل چھوڑیں اس موضوع کو آپ چائے پئیں۔'' سبرینا نے بے زاری سے کہا۔

ارشاد احمد نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا وہ اس کے ساتھ دوسرے موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔

☆☆☆

بڑی سی ٹرے میں سموسے، فروٹ چاٹ، مٹھائی اور چائے کے کپ سلیقے سے سیٹ کر کے سبرینا نے بیزار سے انداز میں اپنی آپی زرمینہ سے کہا کہ وہ جا کر ٹرے مہمانوں کو پیش کردے۔

''میں کیوں لے کر جاؤں رشتہ تمہارے لیے آیا ہے تم ہی لے کر جاؤ گی۔''

''آپی یہ رشتہ آیا تو آپ کے توسط سے ہے میں تو امی سے کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے شادی

نہیں کرنی آنے والے لوگوں کو مجھ سے نہیں میری جاب سے دلچسپی ہے۔''

''سبرینا تم جانتی ہو امی تمہاری وجہ سے کتنا پریشان ہیں۔لڑکی کی عمر جب زیادہ ہو جائے تو اس کے لیے رشتے مشکل سے آتے ہیں۔دوبارہ یہ لوگ پلٹ کر آئے ہیں تو امی کو ایک آس ہو گئی ہے۔پلیز تم امی کی خاطر اپنی ضد چھوڑ دو ہم بہنیں بھی تمہاری وجہ سے فکر مند ہیں۔تمہیں اپنی شادی کی فکر اتنی نہیں ہو گی جتنی لوگوں کو ہے خاندان میں جہاں پر بھی جاؤ لوگ ایک ہی سول پوچھتے ہیں۔''

سبرینا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر جانے کیا سوچ کر لب بھینچتے ہوئے ٹرے اٹھا کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

''بس بہن آپ دو تین دن میں ہمیں جواب دے دیں تو ہم دو مہینے بعد کی کوئی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔جہیز کے لیے ہم آپ کو مجبور نہیں کرتے بیٹی کی ماؤں کے ارمان ہوتے ہیں آپ کے بھی ظاہر ہے ارمان ہوں گے آپ نے بھی اپنی بیٹی کے لیے بہت کچھ جوڑ کر رکھا ہو گا، ہمارے خاندان میں تمام لوگ پیسے والے ہیں۔مہندی سے لے کر ولیمے تک کی تقریبات ہال میں ہوں گی۔ہم لوگوں کو یہاں تو مہندی کا فنکشن بڑے پیمانے پر ہوتا ہے میں آپ کو یہ اس لیے بتا رہی ہوں کہ کہیں بعد میں آپ کہیں کہ ہم لوگ کم سے کم لوگ لیے کر آئیں۔آپ کی بیٹی خیر سے گورنمنٹ لیکچرار ہے اچھا خاصا کما رہی ہو گی۔میرے بیٹے کو سلامی میں کار چاہیے میری بیٹیوں کو اور مجھے بھی سونے کی کوئی نہ کوئی چیز چاہیے۔آخر کو ہم اپنے جاننے والوں کو دکھائیں گے کہ ہماری بہو کے گھر والوں نے ہمیں کیا دیا ہے۔''لڑکے کی امی تیزی سے بولیں۔

سبرینا کی آنکھیں ان کے لالچی پن پر حیرت و غصے سے کھلی ہوئی تھیں۔

''آپ کا گھر تو خاصا بوسیدہ ہو رہا ہے۔گھر پر تو کوئی تقریب رکھی نہیں جا سکتی ہمارے جاننے والوں تو باتیں بنائیں گے جہاں زیب کے سسرال والے بڑے ہی گرے پڑے لوگ ہیں۔''لڑکے کی امی نے جاتے جاتے حملہ کیا فرخندہ جبیں ان لوگوں کو رخصت کر کے آئیں تو زرینہ آپی نے ان سے پوچھا ان کا کیا ارادہ ہے۔

''میری طرف سے تو ہاں ہے کب تک میں بیٹی کو بٹھائے رکھوں گی شادی نہ ہونے پر لوگ طرح، طرح کی باتیں بناتے ہیں۔''

''امی آپ نے ان لوگوں کی فرمائشیں سنیں مجھے نہیں شادی کرنی۔''سبرینا ایک دم بولی۔

''ہر شخص اسی قسم کی فرمائشیں کر رہا ہے تو کیا میں تمہیں بٹھائے رکھوں۔سبرینا آج کل لڑکوں کی کچھ نہ کچھ ڈیمانڈ ہے۔''امی نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''امی سبرینا صحیح کہہ رہی ہے ہم لوگ کہاں سے ان کی ڈیمانڈ پوری کریں گے۔ان کی کوئی ایک فرمائش تو ہے نہیں جو پوری کر دی جائے مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ لوگ اتنے لالچی ہوں گے ورنہ میں یہ رشتہ لے کر نہیں آتی۔''زرینہ نے سبرینا کی حمایت کی۔

''زرینہ! میں سوچ رہی ہوں کہ گاؤں والی زمین بیچ دوں سبرینا کی شادی ان لوگوں کی مرضی کے مطابق ہو جائے گی۔''

''امی آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ آپ کی دو بیٹیاں اور بھی ہیں۔سبرینا کو جو آپ جہیز بھر کر دیں گی تو ہمارے شوہر اعتراض نہیں کریں گے۔آپ نے مجھے اور فاطمہ باجی کو جہیز کے نام پر کیا دیا تھا ہر گز نہیں میں آپ کو ایسا کرنے نہیں دوں گی۔اگر آپ نے زمین بیچنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے اور فاطمہ باجی کو بھی حصہ دینا ہو گا۔''

''آپی! امی ہر گز زمین نہیں بیچیں گی کم از کم اپنی زندگی میں ہر گز نہیں۔آپ ان لوگوں کو منع کر دیں مجھے اس رشتے سے انکار ہے۔ان لوگوں کی حرص کا حال دیکھیں کماؤ بیوی چاہیے ساتھ ہی اپنی مرضی سے جہیز کی اشیاء چاہئیں ہم ان کی کیا کیا خواہشات کو پورا

کریں گے۔ شادی کے بعد بھی وہ لوگ ڈیمانڈ کر سکتے ہیں۔ ہم کہاں تک ان کی ڈیمانڈ کو پورا کریں گے۔''

سبرینا کے حتمی فیصلے کو دیکھ کر فرخندہ جبیں نے چپ سادھ لی۔

تین روز بعد اچانک ان لوگوں کو اطلاع ملی کہ سجیلہ مامی کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ فرخندہ جبیں فوراً گاؤں روانہ ہوگئیں۔ سبرینا کو انہوں نے اپنی بڑی بیٹی فاطمہ کے گھر چھوڑ دیا۔ روحان بھی اپنی امی کی موت کی خبر ملتے ہی آ گیا تھا۔ شدت غم سے وہ نڈھال تھا۔ سجیلہ مامی کی تدفین کے ایک ہفتے بعد فرخندہ جبیں نے جانے کا ارادہ کیا تو ان کے بھائی شبیر احسن اصرار کرنے لگے کہ وہ مزید کچھ دن رک جائیں۔

''شبیر بھائی! میں تو مزید رک جاتی مگر فاطمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سبرینا کو اس کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں اس لیے میرا جانا ضروری ہے۔''

''جیسے تیری مرضی فرخندہ تیری چھوٹی کا کہیں رشتہ طے ہوا۔''

''ابھی تو نہیں میرا بس چلے تو میں آج ہی اس کی شادی کردوں۔'' فرخندہ جبیں نے آہ بھری۔

''سجیلہ کو بڑا ارمان تھا اسے اپنی بہو بنانے کا مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔''

''شبیر بھائی! تم چاہو تو یہ رشتہ اب بھی ہوسکتا ہے روحان تیار ہو تو میں سبرینا کو کسی طرح راضی کر لوں گی پہلے میں نے بڑی بے وقوفی کی۔ اس کی سزا بھگت رہی ہوں۔ روحان تو اس قابل ہے کہ کوئی بھی اسے اپنی لڑکی دینے میں فخر محسوس کرے گا۔''

''فرخندہ! تم جو بات کہہ رہی ہو اب یہ ممکن نہیں روحان نے آئرلینڈ میں شادی کر لی ہے۔ میرا اور سجیلہ کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر جب پاکستان آئے گا تو ہم دھوم دھام سے ولیمہ کریں گے تب ہی رشتے داروں کو اطلاع دیں گے۔ سجیلہ کی موت سے ہمارے خواب ادھورے رہ گئے۔''

فرخندہ جبیں کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ یہ تو وقت، وقت کی بات تھی۔ پہلے سجیلہ بھابھی ان کے گھر سوالی بن کر آئی تھیں آج وہ خود بیٹی کی ماں ہو کر بھائی کے آگے رشتہ پیش کر رہی تھیں۔

تقدیر نے ان کے اس فیصلے کو مسترد کر دیا تھا۔

''خدا کرے روحان اپنی شادی شدہ زندگی میں خوش رہے۔'' بھتیجا ہونے کے ناطے افسردہ ہونے کے باوجود فرخندہ جبیں کے دل سے روحان کے لیے اس موقع پر بھی دعا نکلی۔

☆☆☆

ایئرپورٹ پر کھڑی سبرینا کی نگاہیں روحان کو تلاش کر رہی تھیں۔ روحان پندرہ سال بعد آج ان کے گھر آ رہا تھا۔

''کاش! پندرہ سال پیش تر کا ماضی، حال میں بدل جاتا۔'' سبرینا نے اداسی سے سوچا اگلے لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''نہیں، نہیں وہ اس طرح کیوں سوچ رہی ہے۔ روحان کے سامنے وہ خود کو کمزور ظاہر نہیں کرے گی۔ اسی وقت روحان اس کے پاس پہنچ گیا۔''

''سبرینا تم تو بہت بدل گئی ہو پھوپھو نہیں آئیں۔''

''امی بیماری کے باعث اب گھر سے کم نکلتی ہیں۔ اس لیے مجھے اکیلی آنا پڑا۔ گزرتے وقت نے اگر میرے چہرے پر اپنا اثر ڈالا ہے تو تم بھی پہلے سے کافی سنجیدہ اور سمجھ دار ہو گئے ہو۔''

''وہ تو میں پہلے بھی تھا۔'' وہ اپنا سامان ٹیکسی میں رکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر کی طرف رواں دواں تھے۔

''اتنے عرصے میں تم تیسری مرتبہ وطن آئے ہو اچانک تمہارا ارادہ کیسے یہاں آنے کا بن گیا۔ اب تو ماموں مامی بھی نہیں رہے۔''

''کیا بتاؤں میں باہر کی زندگی سے اکتا گیا ہوں۔ کچھ وقت اپنوں کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سبرینا، روحان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر خود میں ہمت نہیں پا رہی تھی۔ کہ اس سے مزید باتیں پوچھے۔ ان پندرہ

سالوں کے دوران اس کی زندگی میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ وہ اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔
''میڈم! اب کس طرف موڑوں۔''
اچانک ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا تو وہ چونک گئی۔
''دائیں طرف کی روڈ پر تیسری گلی میں لے لو۔''
چند منٹوں بعد وہ روحان کو ساتھ لیے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ فرخندہ جبیں، روحان کے آگے پیچھے جا رہی تھیں۔ سبرینا نے بھی جب سے اسے دیکھا تھا اپنے گزشتہ ریمارکس کو بھول گئی تھی۔ روحان کس قدر باوقار لگ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی روحان ہے۔
''سبرینا روحان کے لیے کچھ کھانا بناؤ۔''
''نہیں پھوپھو میں آرام کروں گا۔'' وہ اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کا سامان موجود تھا۔ صبح کو سبرینا نے کالج کی چھٹی کی تھی۔
روحان دوپہر کے کھانے پر ان کے ساتھ موجود تھا۔
''روحان تمہاری بیوی اور بچے نہیں آئے۔''
''نہیں پھوپھو! میری بیوی مجھ سے علیحدگی چاہتی ہے۔ وہ مجھ سے شادی کر کے مطمئن نہیں ہے۔ اس کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر میں یہاں آ گیا ہوں۔''
''اتنا عرصہ ساتھ گزارنے کے باوجود وہ ایسا کیوں چاہتی ہے۔''
''پھوپھو! میں نے وہاں شادی انڈین فیملی کی لڑکی سے کی تھی۔ رخسار ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ اب جو ہمارے درمیان اختلاف پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ اس کا کزن ہے۔ کزن اس کا سابق منگیتر ہے جو اکثر ہمارے گھر آتا ہے۔ مجھے اس کا اپنے گھر آنا پسند نہیں ہے۔ میں رخسار کو کئی مرتبہ منع کر چکا ہوں۔ مگر وہ میری بات کو سیریس نہیں لیتی مجھے بیک ورڈ شکی اور نہ جانے کن کن القاب سے نوازتی ہے۔ بقول اس کے کہ وہ میرے رویے سے دل برداشتہ ہوگئی ہے اور مجھ سے طلاق چاہتی ہے۔''
''روحان اور پلاؤ لو تمہیں تو شامی کباب اور پلاؤ بہت پسند تھا۔'' فرخندہ جبیں زبردستی اس کی پلیٹ میں چاول ڈالنے لگیں۔
''سبرینا! میں تو سمجھا تھا کہ تمہاری شادی ہوگئی ہوگی مگر تمہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے تم نے ساری زندگی تنہا رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' سبرینا نے روحان کی بات سن کر اسے گھور کر دیکھا۔
''پہلے کچھ رشتے آئے تھے یہ شادی کے لیے تیار نہیں تھی۔ اب تو اس کے رشتے آنا بند ہوگئے ہیں کہ میں اس پر زور ڈالوں اس کی شادی ہو جاتی تو میں کم از کم سکون سے مر سکتی۔'' روحان کچھ نہ بولا نظریں جھکائے کھانے میں مصروف رہا کھانے کے بعد وہ شاپنگ کے لیے نکل گیا۔ رات میں وہ گھر لوٹا تو سبرینا کو زبردستی اپنے ساتھ لے کر ڈنر کرنے گیا۔
سبرینا کو پہلی بار باہر اس کے ساتھ ڈنر کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس رات جب وہ گھر لوٹی تو زندگی میں پہلی بار روحان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ایک لمحے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ گزری ہوئی برسوں پرانی بات یاد کر رہی تھی اور ہر یاد ایک نیا احساس جگاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
میری بدقسمتی تھی کہ میں اس کی بے پناہ اور شدید محبت کو محسوس نہ کر سکی اس نے تو مجھے حاصل کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ میں ہی بے وقوف تھی اس کی محبت کو کوئی مقام نہ دے سکی۔
سبرینا افسوس کر رہی تھی کہ وہ سراب کے پیچھے بھاگتی رہی یاسر اور ارسل کو پانے کی کوشش میں مصروف رہی جو اس کے دل کے پاس تھا روحان اس کی محبت کو محسوس نہ کر سکی۔
اسی رات سبرینا نے فیصلہ کیا کہ وہ روحان سے اپنی محبت کا بہت جلد اعتراف کرے گی روحان کیسے ساتھ اس نے گھر بسانے کا فیصلہ کرلیا تھا وہ روحان کی

طرف سے پیش قدمی کی منتظر تھی۔

☆☆☆

ایک ماہ کے دوران روحان، سبرینا کو ساتھ لے کر مختلف جگہوں پر گھومنے گیا تھا۔ سبرینا کو اس نے اس کی نہ نہ کرنے کے باوجود ڈھیر ساری شاپنگ کرائی تھی۔

ہفتے کا دن تھا روحان حسب معمول بارہ بجے سو کر اٹھا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ خاصی بوریت محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے چھت پر چلا آیا تھا۔ اس میں تو اسے یہی بہتر لگ رہا تھا کہ اسے رخسار کو چھوڑ دینا چاہیے مگر وہ خود میں اس فیصلے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

"روحان یہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہو۔" سبرینا کی آواز سن کر اس نے مڑ کر دیکھا۔

"کچھ خاص نہیں سوچ رہا تم بتاؤ تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔"

"تم اچھی طرح سے جانتے ہو میری شادی نہ ہونے کی کیا وجوہات ہیں میں جن لوگوں سے شادی کرنے میں انٹرسٹڈ تھی وہ خود کسی نہ کسی بہانے مجھ سے دور ہو گئے۔ میں نے تو شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر کسی سیانے نے صحیح کہا ہے کہ محبت اور شادی دونوں چیزیں آپ کے اختیار سے باہر ہیں۔ امی کی شادی کی ضد مجھے پہلے بے جا لگتی تھی لیکن اب مجھے یوں لگتا ہے کہ ان کی ضد میں میرا مفاد ہے۔ میری جو کولیگ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو گئی ہیں ان کا جب حال دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ اس سے پہلے موجودہ وقت دبے پاؤں گزر جائے۔ مجھے اس سلسلے میں عملی قدم اٹھا لینا چاہیے۔"

گڈ......خاصی عقلمند ہو گئی ہو تم۔ مجھ ناچیز کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔

"تم شادی شدہ ہو میں تمہارے بارے میں کیسے سوچ سکتی ہوں۔" سبرینا اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے بولی۔

"تھوڑے دنوں کے بعد شاید میں شادی شدہ نہ رہوں۔"

"روحان! تم تو اس طرح سے کہہ رہے ہو جیسے شادی کوئی گڑیا گڈے کا کھیل ہی ہم لوگوں میں طلاق کو کتنا معیوب سمجھا جاتا ہے اندازہ ہے تمہیں۔"

"سبرینا! مغرب میں ایسی باتیں عام ہیں وہاں تو شادیاں دنوں میں ختم ہوتی ہیں۔ کاش! میری بیوی رخسار کو اپنی غلطی کا اندازہ ہو جاتا اور وہ اپنے پچھلے رویے پر شرمندہ ہو جاتی تو میں تمام باتیں بھلا کر اس کے پاس چلا جاتا مگر اس کو میری ناراضی کی پروا کب ہے۔ اتنے دن ہو گئے مجھے یہاں آئے ہوئے رخسار نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔" روحان دل برداشتہ لہجے میں بولا۔

"روحان! انسان کو بعض اوقات اپنے غلط فیصلوں کا اندازہ نہیں ہوتا اور جب اسے اپنی غلطی پر پشیمانی ہوتی ہے اس وقت تک وقت بہت آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ جیسے مجھے تمہاری قدر تمہیں کھونے کے بعد ہوئی ہے۔" روحان شاکڈ ہو گیا۔

"سبرینا! یہ تم کہہ رہی ہو کل اور آج میں بہت فرق ہے۔ میں ایک شوہر ہی نہیں ایک باپ بھی ہوں اسی ناطے میں اپنی بیوی کو سنبھل جانے کا موقع دینا چاہتا ہوں میں چاہتا تو اسے فوراً طلاق دے دیتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے دوسری شادی کی تو تم سے ہی کروں گا بولو تمہیں میرا ساتھ قبول ہے۔" روحان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا سبرینا نے نظریں جھکا لیں۔

"میں چلتی ہوں امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے دو گھڑی میرے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر لو پتا نہیں یہ موقع ملے یا نہ ملے۔"

روحان کی نظروں میں جانے کیا تھا کہ سبرینا نروس ہو رہی تھی۔ روحان نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے موضوع بدل دیا۔

"سبرینا پھوپا کے کزن جن کے کالج میں تم پڑھاتی تھیں ان کی بیوی کی کچھ دنوں پہلی ڈیتھ کی

خبر مجھے ملی تھی۔ کینیڈا میں میرے ماموں رہتے ہیں انہوں نے مجھے بتایا تھا۔

''اچھا ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا تم بھی اب بتا رہے ہو۔ وہ تو بہت اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے میرا اور امی کا بہت خیال رکھا ہے۔ میں نیچے جا رہی ہوں ارشاد انکل سے فون پر تعزیت کرنے تم بھی عجیب ہو پہلے مجھے یہ اطلاع نہیں دے سکتے تھے۔'' تیزی سے سبرینا فوراً سیڑھیوں کی جانب مڑ گئی۔

رات کو سبرینا نے روحان کے کمرے میں جھانکا وہ نیٹ پر چیٹنگ میں مصروف تھا۔ اگلے دن وہ کالج سے گھر آئی تو وہ غیر موجود تھا۔

''امی روحان کہاں گیا ہے؟''

''پتا نہیں مجھ سے کہہ رہا تھا کسی سے ملنے جا رہا ہوں ہوسکتا ہے کسی دوست سے ملنے گیا ہو کل ہی اس نے کوفتے بنانے کی فرمائش کی تھی۔ میں نے سوچا آج بنا لیتی ہوں۔''

''امی آپ کچھ زیادہ روحان کا خیال نہیں رکھ رہیں۔'' سبرینا نے امی کو گہری نظروں سے دیکھا۔

''ماں، باپ نہیں ہیں اس کے۔ کل ہی مجھ سے کہہ رہا تھا میرا گاؤں میں ہے کون جس سے ملنے جاؤں۔ امی، ابا دونوں مجھے دنیا کی بھیڑ میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔'' فرخندہ جبیں اداس لہجے میں بولیں۔

''وہ تنہا کب ہے بیوی بچے ہیں۔''

''بیوی بچوں سے اس کا تعلق تو ختم سمجھو ایسی بیوی کا کیا فائدہ جو اپنے مجازی خدا کی بات نہ مانے۔'' دوپہر کے کھانے پر فرخندہ جبیں، روحان کا انتظار کرتی رہ گئیں مگر وہ نہیں آیا۔

رات گیارہ جب وہ لوٹا تو آتے ہی اس نے بتایا کہ وہ اسلام آباد اور شمالی علاقہ جات کی طرف گھومنے جا رہا ہے۔ واپس آ کر سرپرائز دے گا۔ اگلے دن وہ اسلام آباد روانہ ہوگیا۔ سبرینا چاہنے کے باوجود اپنے دل کی بات اس سے نہ کہہ سکی۔

روحان کے جانے سے گھر ایک دم ویران ہوگیا تھا۔ شام کے وقت بیل بجی سبرینا نے گیٹ کھولا ارشاد احمد اپنی بیٹی کے ساتھ موجود تھے۔ ارشاد احمد فرخندہ جبیں کو بتا رہے تھے کہ وہ اب پاکستان میں رہیں گے۔

بیوی کی موت کے بعد ان کا دل وہاں نہیں لگ رہا۔ دونوں بیٹوں کی شادی وہ کر چکے ہیں۔ اب ان کا ارادہ مستقل پاکستان میں رہنے کا ہے۔ سبرینا ان کی بیٹی سے جلد گھل مل گئی۔ ان کی چھوٹی بیٹی مائرہ، سبرینا کو خاصی خوش مزاج لگی۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔

دو روز بعد ان کی بیٹی مائرہ پھر آ گئی۔ ارشاد احمد اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ واپسی پر مائرہ اکیلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد فرخندہ جبیں نے جو انکشاف کیا سبرینا اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہ گئی۔ ارشاد احمد نے دوسری شادی کرنے کے لیے سبرینا کا انتخاب کیا تھا۔

''امی میں نے انہیں کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا ہے۔ کیا ان کی بیٹیوں کو ان کے ارادوں کا علم ہے۔''

''بالکل علم ہے یہ بات مائرہ نے مجھ سے کی ہے۔ وہ تو آئی پاکستان میں اس لیے ہے کہ اپنے باپ کی دوسری شادی کروا سکے۔ اس کا پاکستان میں کون سا دل لگ رہا ہے۔ ارشاد احمد کی شادی ہوتے ہی مائرہ کینیڈا چلی جائے گی بیٹیاں اپنی زندگیوں میں مگن ہیں۔ باپ کی شادی کر کے وہ اس کی خدمت سے آزاد ہونا چاہتی ہیں۔''

''آپ بتائیں آپ کی کیا مرضی ہے میں نے تو اپنا فیصلہ تقدیر پر چھوڑ دیا ہے۔'' سبرینا نے بے دلی سے کہا۔

''ارشاد احمد تم سے سولہ سال بڑے ہیں تمہاری عمر اب ایسی ہے کہ اس قسم کے رشتوں کو قبول کرنا مجبوری ہے میں نہیں چاہتی کہ تم کنواری مرو۔''

''اگر میرے مقدر میں کسی شخص کی دوسری بیوی بننا لکھا ہے تو پھر روحان میں کیا برائی ہے۔'' سبرینا کے منہ سے ایک دم نکلا۔

''روحان نے کیا تم سے اس قسم کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔'' فرخندہ جبیں نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔
نہیں۔ اس نے تو مجھ سے ایسا کچھ نہیں کہا۔
''اس خواہش کو بھول جاؤ جس وقت اس نے تم سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا تب تم نے نہیں کی اب اس خواہش کو دوبارہ زندہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ تمہارے پاس دو دن کا ٹائم ہے۔ تم مجھے بتا دینا کہ تم ارشاد احمد سے شادی کے لیے تیار ہو کہ نہیں۔''
فرخندہ جبیں یہ کہہ کر اس کے کمرے سے نکل گئیں۔
''مجھے انکل سے یہ امید نہیں تھی۔'' سبرینا بیٹھے بیٹھے خود کلامی کرنے لگی۔ وہ ایک بند گلی میں کھڑی تھی۔ جس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ اسے نظر نہیں آتا تھا۔ آخر کار اس نے ارشاد احمد سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ماں کے گھر میں جہاں گڑیا کھیلتے اس کا بچپن گزرا تھا وہ گھر اس کے لیے کچھ دنوں بعد اجنبی ہونے والا تھا۔ وہ گھر اس کی بڑھتی عمر کو برداشت کرنے سے انکاری ہو گیا تھا۔
سبرینا کی طرف سے ہاں ہوتے ہی اگلے ہفتے سادگی سے شادی کی تقریب ہوگئی۔ آرزؤں اور ارمانوں کے لمحوں میں سبرینا کسی زندہ لاش کی طرح ساکت اور گم صم بیٹھی تھی۔ وہ سجی ہوئی سوگوار دلہن اپنے غمگین تاثر اور مردہ احساسات کے باوجود بھی بے حد دلکش لگ رہی تھی۔
مائرہ نے بڑی نزاکت سے اسے بیڈ پہ ٹیک لگا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کا چہرہ چاند کی طرح جگمگا رہا تھا۔ ارشاد احمد اندر داخل ہوئیتو سبرینا کو گھبراہٹ ہونے لگی۔
ارشاد احمد نے آتے ہی ڈائمنڈ رنگ اس کے ہاتھ میں پہنادی۔ سبرینا نظریں اٹھا کر بے تاثر ہو کر انہیں دیکھا انہوں نے سبرینا کے چہرے کے تاثرات کو پڑھ لیا۔
''میں نے یہ فیصلہ مجبوری میں کی ہے میں یہاں شادی کے ارادے سے آیا تھا مگر تم سے نہیں، مائرہ نے فرخندہ بھابھی سے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے ماں تلاش کرنے میں مدد کریں۔ فرخندہ بھابی نے کہا جب گھر میں لڑکی موجود ہے تو باہر ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتا تھا مگر جب بھابھی نے خود پیش کش کی تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ ماں ہونے کے ناطے وہ تمہاری شادی کی طرف سے خاصی فکر مند تھیں۔
''دور ہو گئی ان کی فکر مجھے ٹھکانے لگا کر'' سبرینا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''رینا! ارشاد احمد بے تکلفی سے بولا۔ اس نام سے سبرینا کو صرف اس کی خاص دوستیں پکارتی تھیں۔
سبرینا نے ناگواری سے ارشاد احمد کو دیکھا۔
''کیا میں اتنا بھی حق نہیں رکھتا کہ تمہیں رینا کہہ دوں؟''
ارشاد احمد کے لہجے میں شکایت تھی۔ سبرینا کی آنکھوں نے ضبط کے بندھن توڑ دیے اور آنسو آبشار کی مانند گرنے لگے۔ ارشاد نے اس کے آنسو صاف کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ گھبرا اٹھی۔
''لگتا ہے تم اس شادی سے خوش نہیں ہو۔''
''مجھے اس رشتے کو قبول کرنے میں وقت لگے گا۔''
''سبرینا تم جیسا چاہو گی ویسا ہی ہوگا۔'' ارشاد احمد نے کہا اور تکیہ اٹھا کر صوفے پر لیٹ گئے۔ سبرینا اٹھ کر واش روم میں گئی۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ وہ سخت مضطرب تھی۔
اگلے دن وہ رات کے کھانے پر امی کے گھر موجود تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر پچیس، چھبیس سال کی خوب صورت لڑکی پر پڑی وہ امی سے پوچھنے ہی والی تھی کہ یہ لڑکی کون ہے۔ اسی وقت روحان بھی کمرے میں آ گیا۔
سبرینا ہونق کی طرح کھڑی تھی۔
''مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہو گئیں تم! اتنا صبر نہیں ہوا کہ میرا انتظار کر لیتیں۔ میں تمہاری شادی میں شریک ہو لیتا۔''
''یہ غالباً تمہارے شوہر ہیں۔'' روحان نے ہاتھ ارشاد احمد کی طرف بڑھا دیا۔
''سبرینا یہ میری وائف ہے رخسار اور یہ میرا بیٹا

ہے اس نے کمرے کے کونے میں کھڑے پانچ سالہ لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔"

"تم میری فیملی کو دیکھ کر حیران ہو رہی ہو گی۔ میں دراصل اسلام آباد گیا ہی اسی لیے تھا کہ میری بیوی اور بیٹا آ رہے تھے۔ ہم نے شمالی علاقہ جات میں گھومنے کا پروگرام بنایا تھا۔ تم اسے ہمارا سیکنڈ ہنی مون کہہ سکتی ہو۔ ہاں ہنی مون سے یاد آیا آپ لوگوں نے ہنی مون پر کہاں جانے کا پروگرام بنایا ہے۔"

اس سے پہلے کہ ارشاد احمد کچھ کہتے سبرینا بولی۔

"ہم ہنی مون کے لیے ملائیشیا جانے والے ہیں۔"

"واؤ پھر تو ہمیں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلنا چاہیے۔" روحان شریر لہجے میں بولا۔

"سوری ہم تنہا کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔"

روحان، ارشاد احمد سے باتوں میں مصروف ہو گیا کھانے سے فارغ ہوتے ہی سبرینا گھر روانہ ہو گئی۔ روحان کو مزید دو دن یہاں قیام کرنا تھا پرسوں کی فلائٹ سے وہ واپس جا رہا تھا۔ سبرینا اور ارشاد احمد کو اس نے بہت سارے تحائف دے کر رخصت کیا تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ تم چاہو تو امی کے گھر رک سکتی ہو پھر تم کیوں نہیں رکیں۔" ارشاد احمد نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے سکوت کو توڑا۔

"آپ نے مجھ سے شادی اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے کی ہے پھر میرا امی کے گھر رہنے کا کیا جواز ہے۔ امی کے گھر میں نے زندگی کے چونتیس سال گزار دیے اب باقی کا وقت میں آپ کی سنگت میں گزارنا چاہتی ہوں۔"

"یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ سبرینا تمہارے خیالات ایک دن میں بدل جائیں گے مجھے تو یہ خواب لگ رہا ہے۔" ارشاد احمد کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"یہ خواب نہیں حقیقت ہے زندگی سمجھوتے کا نام ہے میں نے آپ سے وابستہ رشتے کو دل سے قبول کر لیا ہے۔ یہ فیصلہ کر کے مجھے جو سکون ملا ہے وہ سکون کل تک میرے مقدر میں نہیں تھا۔

ارشاد احمد حیرانی سے سبرینا کو دیکھ رہے تھے۔ سبرینا کے چہرے پر پھیلی مسکان سے لگ رہا تھا کہ وہ خاصی پرسکون ہے۔ اسی وقت ارشاد احمد نے میوزک آن کر دیا۔

سبرینا سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے دل کو آباد کرنے کے لیے کس کس کے پیچھے بھاگتی رہی مگر قدرت نے دل کے مکین کی حیثیت سے ارشاد احمد کا نام لکھا تھا۔ سبرینا نے اپنا ہاتھ ارشاد احمد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ایک مدھم سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ سبرینا نے کار کی پشت سے ٹیک لگا لیا۔

کار تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ارشاد احمد نے باہر جھانک کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر سبرینا سے بولے۔

"آج ایک اہم دن ہے۔ چودہ فروری ویلنٹائن ڈے تمہیں اگر اعتراض نہ ہو تو کچھ دیر کے لیے سی ویو ہو آئیں۔"

سبرینا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سی ویو پہنچ کر وہ کار سے اتر کر سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ چاند کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سمندر کی ٹھنڈک ان کے وجود میں اترنے لگی۔

"ادھر تو بہت ٹھنڈ ہے تھوڑا دور چل کر بیٹھتے ہیں۔" وہ سمندر سے کچھ فاصلے پر بنی ہوئی۔ دیوار پر بیٹھ گئے۔

"آج کی رات بہت حسین ہے اس حسین رات میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا ہے۔" سبرینا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کون سا اہم واقعہ؟" ارشاد احمد نے پوچھا۔

"میں نے آپ کی محبت اور قدر و قیمت کو جان لیا۔ محبت کا یہ دن مجھے تاحیات یاد رہے گا۔" سبرینا نے ارشاد احمد کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔

"کیا ارادہ ہے گھر نہیں چلنا۔" اسے یوں کھویا دیکھ کر ارشاد احمد نے کہا۔

سبرینا نے ارشاد احمد کا ہاتھ مضبوطی تھام لیا شوہر کی شکل میں اسے حقیقی محبت مل گئی تھی۔

☆☆

لہو

سید علی ارسلان

ایک عورت کی کہانی جو اپنی اولاد کو ایسا باپ دینا چاہتی تھی جن پر وہ فخر کرسکے۔ ایک ایسے نوجوان کی کتھا جو اپنی محبت کے حصول کے لیے خون کا بیوپاری بن گیا

ان لوگوں کے لیے جو دل میں محبت کا درد محسوس کرتے ہیں

آپ نے کبھی حیدرآباد کا سول اسپتال دیکھا ہے؟ اگر نہیں تو خدا کرے آپ کبھی نہ دیکھیں کہ اسپتال جانا کوئی اچھا شگون نہیں ہوتا۔ لیکن اگر آپ نے یہ اسپتال دیکھا ہے یا کبھی آپ کا اس سے واسطہ پڑا ہے تو یہ ناممکن ہے کہ آپ سراج الدین سے واقف نہ ہوں۔

جی ہاں وہی سوکھا، ہڈیوں کا پنجر، سراج الدین ہے۔ جس کے سارے بال سفید ہو چکے ہیں، جو آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر چلنے کے باوجود نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے لڑکھڑا جاتا ہے اور کبھی کبھی گر بھی پڑتا ہے۔ آپ نے کبھی اس سے پوچھا کہ اے پاگل انسان! تو اپنا لہو ضرورت مندوں کو مفت کیوں بانٹ دیتا ہے۔ مریضوں کو زندگی دیتا ہے تو قیمت وصول کیوں نہیں کرتا۔ نیم مردہ مریضوں کی ضرورت پوری کرتا ہے تو پھر اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے شرفو کے کینٹین پر برتن کیوں دھوتا ہے؟

آپ نے اس سے یہ باتیں کبھی نہ پوچھی ہوں گی۔ اس لیے کہ آپ کو اپنی حاجت روائی سے غرض ہے۔ اپنی زندگی کی خاطر دوسرے کی موت بلا معاوضہ خریدنے میں عار محسوس نہیں کرتے اور آپ کو اس میں عار محسوس کرنا بھی نہیں چاہیے۔ آخر آپ کو زندہ رہنا ہے، چاہے انسانوں کی قبر پر ہی سہی۔ آپ کو اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو سے مطلب ہے۔ چاہے اس کے لیے کسی دوسرے کی رگیں خالی ہو کر سوکھ جائیں۔

آپ نے یہ سب کبھی سراج الدین سے نہ پوچھا ہوگا اور اگر پوچھیں گے بھی تو سراج الدین کبھی نہیں بتائے گا۔ وہ جو کچھ بو رہا ہے، محض اس لیے کہ فصل روز حشر کاٹے گا اور سرخرو ہو جائے گا کیونکہ سراج الدین کبھی زندگی میں سرخرو نہیں ہوا۔

☆☆☆

اتنی خوب صورت اور معصوم لڑکیوں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے لیکن وہ پریشان تھی۔ گھبراہٹ میں کبھی ادھر بھاگ رہی تھی، کبھی ادھر۔ اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں تھا ورنہ شاید وہ اس حسین لڑکی کی آدھی پریشانی بانٹ لیتا۔ عورت کتنی ہی کائیاں کیوں نہ ہو، دکھ بانٹنے کے لیے اسے ایک عدد مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔

لڑکی کی بوکھلاہٹ دیکھ کر سراجا بھی بوکھلا سا گیا۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے لڑکی اس کی پرانی شناسا ہے۔ وہ لڑکی کی گھبراہٹ دیکھتا اور کڑھتا رہا۔

لڑکی کی پریشانی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی گہری آنکھوں کی چمک رفتہ رفتہ معدوم ہو رہی تھی۔ بجھا ہوا چراغ اتنا دکھ نہیں دیتا جتنا کہ پاگل ہوتا ہوا دیا اور سراجا بجھتی ہوئی لو دیکھنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ تو ٹمٹماتے چراغوں کو جلنے کے لیے ایندھن فراہم کرتا تھا۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا۔

''سنو۔'' اس نے لڑکی کے قریب پہنچ کر بھاری آواز میں اسے مخاطب کیا۔ لڑکی چونک کر گرتے گرتے بچی۔ ''تم بہت گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ بات کیا ہے؟''

لڑکی نے سراجے کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور شاید اسے چھریرے بدن کے خوبرو سراجے پر اعتبار آ گیا لیکن جواب دینے کے بجائے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟'' سراجے نے نرم لہجے میں کہا۔

''ہاں، میں بہت پریشان ہوں اور مایوس بھی۔'' لڑکی کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

''کیوں؟''

''میری امی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ آپریشن تھیٹر میں ہیں۔ خون کی سخت ضرورت ہے لیکن مجھے کچھ خبر نہیں کہ ایسے موقعوں پر کیا کیا جاتا ہے۔''

''کوئی مرد ہے تمہارے ساتھ؟''

''نہیں، بس میں اور میری امی ہیں۔ یہ شہر بھی ہمارے لیے اجنبی ہے۔ پرسوں ہی لاہور سے آئے ہیں اور آتے ہی یہ مصیبت پڑ گئی۔'' لڑکی زار و قطار رونے لگی۔

''تمہاری امی کا خون کا گروپ کون سا ہے؟''

''او، پازیٹو۔'' لڑکی نے سسکیوں کے درمیان جواب دیا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" سراجا لڑکی کا بازو پکڑ کر اسپتال میں داخل ہو گیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ سراجے نے خون کا معاوضہ وصول نہیں کیا تھا۔ اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی رگوں سے خون نکال لینے کے بجائے کسی نے اس کی رگوں کو اس کے دل کے لہو سے بھر دیا ہے۔

ہمیشہ کی طرح اسے نقاہت محسوس نہیں ہو رہی تھی، بلکہ تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ نسوں میں شعلے بھڑک رہے تھے، آنکھوں میں بلب جل رہے تھے، سینے کی چوڑائی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"آپ نے ہم پر جو احسان کیا ہے، اسے بھلایا نہیں جا سکے گا۔" لڑکی نے اتنی احسان مندی سے کہا کہ سراجا شرمندہ ہو گیا۔

"آپ مجھے شرم سار کر رہی ہیں۔" وہ بمشکل بولا۔

"آپ کو تو فخر ہونا چاہیے۔ خون جیسی انمول شے آپ نے ہمیں ایسے دے دی، جیسے دعا دے دی جاتی ہے۔ حالانکہ دعا بھی صرف اپنے اپنوں کے لیے ہوتی ہے، اجنبیوں کے لیے نہیں۔"

سراجا دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔

"خون جیسی انمول شے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"دنیا میں کوئی شے انمول نہیں بی بی! میرے خون کی ایک بوتل بھی انمول نہیں، سوا سو روپے کی ہے۔" اس نے اندر ہی اندر لڑکی کا مذاق اڑایا لیکن یہ امر ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ جب لڑکی نے اسے خون کے معاوضے کی پیش کش کی تھی تو اس کی زبان انکار میں کیوں ہل گئی تھی۔ وہ پتھر کیوں بن گیا تھا، جبکہ وہ ایسا موم تھا جسے نوٹوں کی تپش سے کسی بھی سانچے میں ڈھالا جا سکتا تھا۔

"آپ کہاں رہتے ہیں؟" سراجے کی خاموشی سے اکتا کر لڑکی نے پوچھا۔

"یہیں، اسی شہر میں۔" سراجا خیالات کے ہجوم سے باہر نکل آیا۔ "لیکن میں دراصل لاہور کا رہنے والا ہوں۔"

"آپ لاہور کے ہیں؟" لڑکی مسرت آمیز لہجے مگر مانوس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں، اتفاق سے۔"

"لاہور میں آپ کس جگہ رہتے تھے؟" لڑکی نے اشتیاق سے سوال کیا۔

"ماڈل ٹاؤن میں۔" سراجا لڑکی کے سوال پر مسکرایا۔

"ارے....." لڑکی کی حیرت دو چند ہو گئی۔

"کون سے بلاک میں؟" اس کی تیزی نے سراجے کو زور سے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

"میں سی بلاک میں رہتا تھا۔ سی بلاک کا جو اسکول ہے نا لڑکوں کا، وہی جو ایک باغ کے بیچ میں بنا ہوا ہے۔ میں نے اسی میں پڑھا ہے۔"

"کمال ہے۔ ہم لوگ ای بلاک میں رہتے تھے۔" لڑکی خوشی سے بے قابو ہوتی جا رہی تھی۔ انجانے دیس میں کوئی اپنا ہم وطن مل جائے تو سب اسی طرح بے قابو ہو جاتے ہیں۔

"میرا تعلق کسی حد تک ای بلاک سے بھی رہا ہے۔" سراجا اپنائیت سے بولا۔

"ای بلاک میں ایک گرلز اسکول ہے نا بس اسٹاپ کے قریب۔ پہلے اس اسکول میں پانچویں کلاس تک لڑکے بھی پڑھا کرتے تھے۔ میں نے پانچویں تک وہیں سے پڑھا، اس کے بعد سی بلاک والے اسکول سے میٹرک کیا۔"

اس مرتبہ لڑکی نیم دیوانی سی ہو چلی تھی۔

"اسی گرلز اسکول کے پیچھے کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں، میں اور امی رہتے تھے۔ میں نے بھی کچھ دن اسی اسکول میں پڑھا تھا۔"

"لیکن آپ مجھ سے کافی جونیئر ہوں گی۔" سراجے نے اسے شرارت سے دیکھا مگر لڑکی نے توجہ نہ دی۔

"پھر حیدر آباد کیوں آ گئے؟"

"روزگار کے سلسلے میں۔ وہاں میں برسوں بیکار پھرتا رہا۔ اس لیے کہ میرے پاس کوئی سفارش نہیں تھی۔ اس کے بعد یہاں آ گیا۔ یہاں مجھے اپنے بزنس کے لیے کسی قسم کی سفارش یا رشوت کی ضرورت نہیں پڑی۔" سراجے کی آواز میں زہر گھلتا گیا۔ مگر

لڑکی پر اس وقت ایک جذب سا طاری تھا۔
''میں بھی یہاں نوکری کے لیے ہی آئی ہوں۔ امید ہے کہ ہیرآباد کے ایک اسکول میں چانس مل جائے گا۔''
''آپ کے والد......'' سراجا کچھ پوچھتے پوچھتے رک گیا۔ لڑکی یکایک مرجھا گئی۔
''وہ زندہ ہوتے تو ہمیں یہ دن کبھی نہ دیکھنے پڑتے۔''
''اوہ۔'' سراج کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ وہ اس موضوع سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا۔ لڑکی کی پژمردگی اس کے دل پر آرے چلا رہی تھی۔ مگر لڑکی شہرِ ناپرساں میں ایک ہمدرد پا کر ساری داستانِ غم سنانے پر تلی ہوئی تھی۔
''ابا کی انارکلی میں کپڑے کی دکان تھی۔ ہم نے اتنے اچھے دن دیکھے ہیں کہ برے دنوں کا تصور بھی کبھی نہ کیا تھا مگر قسمت کا گلوب کبھی کبھی الٹا پھر جاتا ہے تو ساتھ ہی ڈارون کی تھیوری بھی پلٹ جاتی ہے۔ اچھا بھلا انسان حیوان سے بدتر بن جاتا ہے۔''
''آپ گویا مستقل حیدرآباد آ گئی ہیں۔'' سراج نے گفتگو کا رخ تبدیل کر دیا۔
''یہی سمجھ لیجیے۔''
''میرے شہر کی ہیں لیکن آپ نے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا۔'' سراجا رفتہ رفتہ اسے باتوں میں لگا کر اس کی مایوسی زائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
''میرا نام صابرہ ہے۔'' لڑکی کا موڈ دھیرے دھیرے بحال ہو رہا تھا۔
''بڑا غلط نام رکھا گیا ہے آپ کا۔'' سراجا ہنسنے لگا۔
''کیوں؟''
''اگر یہ نام مناسب ہوتا تو آپ کو بے حد باہمت اور صابرہ ہونا چاہیے تھا۔ جبکہ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔''
صابرہ تلخی سے مسکرائی۔
''نام کچھ بھی ہو لیکن صبر ہر انسان میں ہوتا ہے۔ جب سارے راستے مسدود ہو جاتے ہیں تو صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ آپ کا نام چاہے صابرہ ہو یا نہ ہو مگر آپ بھی تو صبر کر رہے ہیں۔ اپنا شہر چھوڑ کر یہاں آن پڑے ہیں۔''
لڑکی بہت گہری تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مشاہدات کا سمندر گھول کر پی رکھا ہو۔
''میرا نام صابر نہیں، سراج الدین ہے۔'' سراج کو اپنا نام بتانے کا موقع مل گیا تھا اور وہ اس پر بہت مسرور تھا۔
''اپنے محسن کا نام میں کبھی بھی نہیں بھول سکتی۔'' صابرہ اسے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگی۔
''آپ مجھے بار بار شرمندہ کر رہی ہیں۔ شاید آپ کو میرا یہاں رکنا ناگوار گزر رہا ہے اور آپ مجھے بھگانا چاہ رہی ہیں۔''
''نہیں، بلکہ میں تو آپ کو اپنے گھر بلانا چاہتی ہوں۔ امی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ ہم مسان روڈ پر ایک کرائے کی کوٹھڑی میں رہتے ہیں۔''
اتنا کہہ کر صابرہ، سراج کو اپنا پتا سمجھانے لگی۔
سراج کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ منزل اتنی آسان ہو جائے گی۔ پھر بھی اس نے اپنی بے پایاں خوشی کو ظاہر نہ ہونے دیا اور پورا پتا سمجھ لینے کے بعد دبے دبے الفاظ میں کہا۔
''شاید میرا آنا آپ کی امی کے لیے پسندیدہ نہ ہو۔''
''ہماری غربت پر نہ جائیے سراج صاحب! ہم خاندانی لوگ ہیں اور جن کے خون خالص ہوں، وہ کبھی احسان فراموش نہیں ہو سکتے۔ قسمت حالات بدل دیتی ہے۔ صورتیں اور حلیے بدل دیتی ہے مگر لہو نہیں بدل سکتی۔ روح نہیں بدل سکتی۔'' صابرہ کا گمبھیر لہجہ صداقت کا امین تھا۔ سراج کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کہے؟ وہ خاموش کھڑا رہا۔
''تو پھر آپ آئیں گے نا؟'' صابرہ نے ایسے انداز میں پوچھا جیسے کہہ رہی ہو کہ میں انکار سننے کی عادی نہیں۔
''جی ہاں۔ بالکل، ضرور۔ کیوں نہیں۔'' فوری طور پر یہی ایک بے ربط جملہ سراج کی زبان پر آ گیا۔
صابرہ کی ماں کئی ہفتے اسپتال میں رہی اور

سراج کو اس کے گھر جانے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ وقتاً فوقتاً اسپتال کے آس پاس صابرہ سے اس کی مڈبھیڑ ہو جاتی تھی۔

غالباً صابرہ مقناطیس تھی اور سراجا لوہا۔ ورنہ انسان تو اتنی جلدی ایک دوسرے کی طرف نہیں کھنچتے۔ آخر وہ کون سی غیر مرئی قوت تھی جو سراج کو کشاں کشاں صابرہ کی جانب دھکیل رہی تھی۔ سراجا سوچ سوچ کر تھک گیا۔ اسے اس قسم کا تجربہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

لاتعداد حاجت مندوں کو اپنا خون بیچ چکا تھا' بڑی سے بڑی قیمت وصول کر کے بھی اس کا دل کسی کے لیے اتنا بے چین نہ ہوا تھا جتنا کہ ایک بوتل مفت دینے کے بعد ہو گیا تھا۔ کیسی کیسی پری چہرہ لڑکیوں کی رگوں میں اس کا خون بھی دوڑ رہا تھا مگر کوئی اس کے دل میں آ کر کبھی یوں نہ دھڑکی تھی جیسے صابرہ دھڑک اور بھڑک رہی تھی۔

ہر ملاقات سراج کی ذات میں ایک نیا الاؤ دہکا دیتی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ مضطرب ہو جاتا تھا۔ صابرہ کی ہر ہر بات، ہر ہر ادا اس کے لیے ٹانک کا کام کر رہی تھی اور یہ ٹانک اتنا قوت بخش تھا کہ اب وہ خون بیچنے کے بعد نہ کمزوری محسوس کرتا تھا، نہ تھکاوٹ۔ ہر بار ایک نیا جذبہ، ایک تازہ لگن اس کے اندر جاگ پڑتی تھی۔

صابرہ کو اسکول میں ملازمت مل گئی تھی اور اس کی ماں بھی اسپتال سے رخصت ہو کر گھر چلی گئی تھی۔ چلتے چلتے صابرہ نے پھر سراج کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی جو سراج نے ہمیشہ کی طرح قبول کر لی تھی مگر اس کے باوجود تذبذب کا شکار رہا۔ سوچتا رہا جائے یا نہ جائے۔

جب سے صابرہ کی ماں اسپتال سے گئی تھی، صابرہ سے ملاقات بھی نہیں ہو سکی تھی۔ سراجا کافی دن یہ جدائی برداشت کرتا رہا۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ ماں باپ، بہن بھائیوں سے بچھڑا تو کبھی اتنا بے تاب نہ ہوا تھا مگر ایک اجنبی لڑکی نے اس پر نہ جانے کون سا ایسا جادو کر دیا تھا کہ اسے کسی پل چین نہ ملتا تھا۔

دریا میں پانی زیادہ ہو جائے تو وہ سیلاب کی صورت میں ادھر ادھر نکل پڑتا ہے۔ سراجا تو پھر ایک پونے چھ فٹ کا جوان تھا۔ جذبات کا طوفان برداشت نہ کر سکا۔ اس طوفان نے صبر کی ساری حدیں توڑ ڈالیں اور ایک روز وہ صابرہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس کی اتنی ہی خاطر ہوئی جتنی کہ شریف احسان مند، اپنے محسنوں کی کیا کرتے ہیں۔

صابرہ کی ماں کی شفقت نے سراج کو اس کی اپنی ماں یاد دلا دی۔ مائیں تو سب ہی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ممتا اور محبت سے لبریز، اپنی محبتوں کے خزانے ہر وقت لٹانے کے لیے تیار۔ سراج کو جتنا سکون اس گھر میں ملا' کبھی اپنے گھر میں بھی نہ ملا تھا اور ملتا بھی کیسے۔ گھر صرف اینٹوں کی چہار دیواری کا نام ہی تو نہیں ہے۔ گھر تو اس میں رہنے والوں سے بنتا ہے۔ مکین کھلے آسمان تل نکل جائیں تو اسے بھی گھر بنا ڈالیں۔

سراج کے قدم اب اکثر صابرہ کے گھر کی طرف اٹھ جاتے تھے۔ ایک عادت سی ہو گئی تھی۔ صابرہ کے گھر کا ہر چکر اس کی پیاس مزید بڑھا دیتا تھا، بے چینی سوار کر دیتا تھا مگر یہ میٹھی میٹھی کسک ہی اسے اب تک کی زندگی کا حاصل لگ رہی تھی۔

آگ برابر میں بھڑک رہی ہو تو کسے پسینہ نہیں آتا۔ لکڑی تک نم ہو جاتی ہے۔ پتھر بھی چیخ جاتے ہیں۔

صابرہ تو پھر ایک گوشت پوشت کی بنی ہوئی لڑکی تھی، غیر محفوظ انسانی درندوں کے جنگل میں بے یار و مددگار۔

اور پھر وہ عورت ہی کیا جو مرد کی نگاہ کو نہ پہچان سکے، اسے ناپ تول نہ سکے، کھرے کھوٹے کا اندازہ نہ لگا سکے۔

ویسے بھی کیوپڈ نے جس بارش میں سراج کو شرابور کر دیا تھا، اس کے چھینٹے صابرہ پر پہلے ہی پڑ چکے تھے۔ یہ بارش بھی عجیب ہوتی ہے، دلوں کی زمین سیراب کرنے کے بجائے مزید شعلے بھڑکا دیتی ہے لیکن اس آگ میں جلنے والے پھر بھی بھسم نہیں ہوتے، کندن بنتے چلے جاتے ہیں۔

پتنگ بہت اونچی چلی جائے تو اس کی ڈور تنی نہیں رہتی، پیٹا لگ جاتا ہے اور تماشائی لنگر ڈال دیتے ہیں۔

صابرہ اور سراج کی چاہت بھی تو ایک پتنگ ہی تھی۔ بلند ہوئی تو پیڑ پا لٹک گیا اور صابرہ کی ماں کے ہاتھ آ گیا۔

''دیکھو بیٹے۔'' صابرہ کی ماں نے ایک دن سراج سے کہا۔

''تم ہمارے محسن ہو۔ ہمیں تمہاری شرافت پر پورا بھروسا ہے مگر تم خود ٹھنڈے دل سے سوچو، میری جگہ اپنے آپ کو رکھ کر غور کرو۔ کیا تمہارا روز روز یہاں آنا ہماری بدنامی کا باعث نہیں بن جائے گا...... ہم شریف لوگ ہیں بیٹا! ہمارے ہاں یہ طریقے نہیں ہیں۔ ان باتوں کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا۔ ہمارے حالات بھی ایسے نہیں کہ کسی کی اٹھائی انگلی کے جواب میں مزاحمت ہی کر سکیں۔ یہ غریب لوگوں کا محلہ ہے کسی سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔''

''لیکن امی...... میں...... وہ......''

سراج نے گڑبڑا کر صابرہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں زمین میں گڑ گئی تھیں۔

''یہ وہ مسئلہ ہے سراج بیٹے جس کے جواب میں کوئی تاویل قابل قبول نہیں ہوتی۔'' صابرہ کی ماں نے اطمینان سے کہا۔

''تم باپ بن جاؤ گے تو پھر تمہیں احساس ہوگا کہ عزت کا کانچ بہت نازک ہوتا ہے، تیز آواز کی گونج ہی سے توڑ دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔''

''آپ لوگوں کی عزت میری بھی آبرو ہے امی۔'' سراج نے اٹک اٹک کر کہا۔

''تو پھر اس آبرو کے درپے کیوں ہو؟'' صابرہ کی ماں نگاہوں ہی نگاہوں میں سراج کو چھان رہی تھی۔

''میں...... میں اس آبرو کا محافظ بننا چاہتا ہوں۔''

سراج کا ٹھوس لہجہ صابرہ کی گردن فخر سے اکڑا دینے کے لیے کلف کا کام کر گیا۔

صابرہ کی ماں نے اطمینان کی اتنی لمبی سانس لی گویا دوبارہ سانس لینے کا موقع نہ جانے کب ملے گا۔

''یہ معاملات تمہارے بزرگوں کے کرنے کے ہیں۔'' صابرہ کی ماں کا لہجہ بے حد پرسکون تھا۔

سراج نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''تو پھر یہ معاملہ کبھی طے نہیں ہو سکے گا۔ میں بزرگوں کے سائے سے محروم ہوں۔''

''اوہ، مجھے افسوس ہے بیٹا کہ میں نے نادانستگی میں تمہارا زخم کرید دیا۔ بہرحال مجھے تم پر اعتماد ہے مگر پھر بھی...... شادی سے پہلے تمہارا یہاں آنا مناسب نہیں۔''

''آپ درست کہہ رہی ہیں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو کل ہی صابرہ کا سائبان بن جاتا لیکن فی الحال میرے پاس پیسوں کی کمی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ صابرہ کو مالی بحران سے دوچار کروں۔ مجھے تھوڑی سی مہلت دیجیے۔''

سراج کی پرعزم آواز نے ماحول پر فسوں سا طاری کر دیا تھا۔ صابرہ کی ماں اسے محبت سے تک رہی تھی۔

''ٹھیک ہے بیٹا! جیسے تمہاری مرضی۔'' خوشی اس کی آواز سے پھوٹ رہی تھی۔

سراج اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ میرا وعدہ ہے امی! اس وقت تک اس گھر میں داخل نہیں ہوں گا، جب تک صابرہ کا حق دار نہیں بن جاتا۔'' وہ باہر جانے لگا لیکن دروازے تک پہنچ کر رک گیا اور بولا۔

''آپ کو بھی ایک وعدہ کرنا پڑے گا؟''

صابرہ کی ماں نے سوالیہ نظروں سے اس کی دیکا تو اس نے کہا۔

''جب تک میں لوٹ کر نہیں آتا، آپ میرا انتظار کریں گی۔ مجھے پیسہ جمع کرنے کے لیے دن رات محنت کرنا ہوگی، ہوسکتا ہے اس میں کافی دن لگ جائیں۔ میرے بزنس کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ آپ کو میرا پابند ہونا پڑے گا۔''

''تم مطمئن رہو سراج! میں نے تمہیں زبان دی ہے اس سے پھروں گی نہیں۔ مگر بہت زیادہ طویل انتظار کی امید نہ رکھنا۔ آخر مجھے بھی اپنی بیٹی بیاہنی ہے۔ میں صابرہ کے بڑھاپے تک انتظار کرنے کا وعدہ نہیں کر سکتی۔''

صابرہ کی ماں نے دوٹوک فیصلہ دے دیا۔

''آپ کی بیٹی بڑھیا نہیں ہوگی امی! آپ کو اتنا

انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔'' یہ کہہ کر سراج باہر نکل گیا۔
سراج نے اپنے خون کی قیمت بڑھادی تھی۔
خون ایسی چیز ہے جس کی قیمت جتنی بھی بڑھادو، کم ہی لگتی ہے۔ مگر صرف بیچنے والوں کو، خریدنے والوں کے لیے تو ہر شے گراں ہے پھر بھی ضرورت کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ ضرورت منہ مانگی قیمت دینے پر مجبور ہوتی ہے۔
سراج کے پاس اور تھا ہی کیا جو بیچ کر اپنی شادی کا بندوبست کرتا؟ اس کی نظر میں تو لہو فروشی ہی سب سے آسان کام تھا۔ جس میں کوئی محنت نہیں کرنا پڑتی تھی، صرف ایک سوئی بازو میں گھسوانا پڑتی ہے اور اس کے بعد جیب میں وزن بڑھ جاتا ہے۔ جسم کھلتا ہے تو کیا ہوا۔ سراج نے اب تک یہی کیا تھا اور یہی اسے آتا تھا۔

تن آسانی کی عادت پڑ جائے تو انسان اپنی بوٹیاں تک بیچنے پر رضا مند ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر بات کی ایک حد ضرور ہوتی ہے۔ چادر سے باہر پاؤں پھیلائے جائیں تو ٹھنڈ لگتی اور مچھر کاٹتے ہیں۔ سراج بھی چادر سے باہر پاؤں نکال چکا تھا اور اب اسے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔
کمزوری رفتہ رفتہ غالب آرہی تھی لیکن اسے پروا نہیں تھی، اس لیے کہ نوٹوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی امربیل کی طرح۔
یہ وہ بیل ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی، بالکل انسانی ہوس کی مانند۔ نہ ہوس ختم ہوسکتی ہے نہ امربیل گھٹ سکتی ہے لیکن سراج گھٹ گیا تھا اور ختم بھی ہوسکتا تھا اس لیے کہ سراج کی برداشت لامتناہی ہرگز نہ تھی۔ اس کی زندگی بھی ڈوری کی طرح لپٹتی جارہی تھی۔

اس نے نوٹ گننے شروع کیے تو اسے یوں لگا جیسے اپنے جسم سے نکلنے والے خون کا ایک ایک قطرہ شمار کر رہا ہو، جیسے یہ نوٹ...... نوٹ نہیں اس کے لہو کی پڑیاں ہیں، جنہوں نے اس کی آرزوؤں کو غازہ تو بخش دیا ہے مگر زندگی کے رخساروں سے لالی چھین لی ہے۔ اس کے باوجود گنتی ختم ہوئی تو اس کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ کی گہری لکیر کھنچتی چلی گئی، دھنسی ہوئی آنکھوں میں چمک لہرانے لگی اور گال تمتمانے کی کوشش میں مٹیالے ہو گئے۔
وہ صابرہ کے گھر میں یوں داخل ہوا جیسے کوئی فاتح اپنی کامیابی کا پرچم گاڑنے کی غرض سے مفتوح علاقے میں وارد ہوتا ہے مگر صابرہ اسے آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہ گئی۔
''سراج تم......!''
سراج جواباً مسکرایا۔
''امی کہاں ہیں؟''
''وہ تو بازار گئی ہیں لیکن تم نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟'' صابرہ کے منہ سے پریشانی کے مارے پوری بات نہیں نکل رہی تھی۔
''سب کچھ تمہاری خاطر کیا ہے؟'' سراج نے کمزور سا قہقہہ لگایا۔
''میری خاطر؟ تو کیا میری خاطر تم جیل چلے گئے تھے۔'' صابرہ کے چہرہ سے تاسف ٹپک رہا تھا۔
''نہیں۔ شادی کے لیے پیسے جمع کر رہا تھا۔ اب میرے پاس بہت پیسے ہو گئے ہیں۔''
''لیکن تم تھے کہاں؟ کیا بیمار ہو گئے تھے؟'' صابرہ کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ سراج پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔
''نہیں بھئی میں بزنس میں اتنا مصروف رہا کہ صحت خراب ہو گئی۔'' سراج بات بے بات مسکرائے جارہا تھا۔
''ایسا کون سا بزنس ہے جس نے تمہاری یہ حالت کردی ہے؟'' صابرہ بھی بال کی کھال اتارنے پر کمربستہ تھی۔
''تمہیں اس سے کیا۔ عورتوں کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔'' سراج انیم دراز ہو گیا۔
''نہیں۔ تمہیں بتانا پڑے گا۔'' صابرہ کے لہجے میں شکوک و شبہات کے سانپ سرسرا رہے تھے۔
''ہے ایک بزنس۔ ایکسپورٹ کا۔'' سراج نظریں چرانے لگا۔ اس نے کبھی صابرہ کو اپنے ''بزنس'' کی ہوا نہ لگنے دی تھی ہمیشہ ٹالا تھا لیکن آج

صابرہ ٹلنے کے موڈ میں نہیں تھی۔
''صاف صاف بتاؤ سراجے! تم نے پہلے بھی کبھی ڈھنگ سے نہیں بتایا۔ آج تمہیں بتانا ہوگا۔''
''بتایا نا، ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔''
صابرہ نے اس کے لہجے کا جھوٹ پڑھ لیا تھا کیونکہ اس کی شکل پر برف سی جم گئی تھی۔
''صاف صاف اور سچ سچ بتادو سراجے! تم کیا ایکسپورٹ کرتے ہو؟'' صابرہ کے سوال نے سراجے کے رگ وپے میں جھرجھری دوڑادی۔
''میں...... میں......'' اس نے صابرہ کو دیکھا۔
صابرہ کی آنکھیں تھیں یا لیزر کی شعاعوں کا مخزن جنہوں نے سراجے کے سارے کس بل ڈھیلے کردیے۔ وہ کوشش کے باوجود جھوٹ نہ بول سکا۔
''میں اپنا خون بیچا کرتا ہوں۔''
صابرہ سن رہ گئی۔ سراجے میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سر اٹھا کر اسے دیکھ سکتا۔ سناٹے کا یہ دورانیہ خاصا طویل ہوگیا تو سراجے نے گردن اٹھائی۔
صابرہ کے سپاٹ چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا، وہ ہونٹ بھینچے خلا میں گھور رہی تھی۔ جیسے سراجا خلا میں معلق ہو اور سراجا بھی خود کو خلا میں ہاتھ پیر مارتا محسوس کررہا تھا، اسے لگ رہا تھا جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو اور سر کے اوپر سے آسمان کھسک گیا ہو۔
''صابرہ!'' اس نے نرمی سے صابرہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو صابرہ چونک کر کھڑی ہوگئی۔
اس نے سراجے کا ہاتھ جھٹک دیا اور سختی سے بولی۔
''سراج الدین! تم جاسکتے ہو کبھی نہ آنے کے لیے۔''
''صابرہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''
''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں سراج الدین! تم یہاں سے چلے جاؤ۔''
حیران و ششدر سراجا اٹھ کھڑا ہوگیا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

''میں نے یہ قربانی صرف تمہارے لیے دی ہے صابرہ! اور تم بدل گئی ہو۔''
''اسی بات کا تو رونا ہے سراج الدین! کہ میں نہیں بدلی۔ وہی ہوں جو پہلے تھی۔ اگر بدل جاتی تو ہمیشہ کے لیے تمہاری بن جاتی۔''
صابرہ کی آواز تھی یا ببول کی شاخ جو سراجے کو ادھیڑے چلی جارہی تھی۔ سراجا نیم مردہ ہوگیا۔
''صابرہ!'' اس کے لبوں سے آہ نکلی۔
صابرہ کے بت میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔
''صابرہ! آخر میرا قصور کیا ہے؟''
صابرہ آہستہ سے اس کی مڑی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولی۔
''تمہارا قصور...... تمہارا قصور یہ ہے کہ تم لہو فروش ہو۔''
''لیکن یہ تو ثواب کا کام ہے۔ اس سے مریضوں کو نئی زندگی ملتی ہے۔'' سراجے نے کہا۔
''ثواب کی قیمت وصول کرلی جائے تو وہ ثواب نہیں رہتا سراج الدین! وہ تجارت بن جاتا ہے، اگر تم اپنا خون صرف ثواب کی نیت سے دیتے تو مجھے تم پر فخر ہوتا لیکن......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر چلانے لگی۔
''چلے جاؤ سراج الدین...... چلے جاؤ یہاں سے...... میں نے تمہیں خون کا عطیہ دینے والا محسن انسانیت سمجھ کر تم سے پیار کیا تھا مگر تم خون کے ایسے بیوپاری نکلے تو مرتے ہوئے مریض کو زندگی دینے کے لیے نہیں اپنی خوشیاں خریدنے...... اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے خون بیچتا ہے...... میں اپنی اولاد کو ایسا باپ دینا چاہتی تھی جس پر وہ فخر کرسکے...... مگر تم نے میرے سارے ارمان توڑ دیے ہیں...... جاؤ نکل جاؤ یہاں سے......''
پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سراجا تھکے تھکے بوجھل قدموں سے واپس چلا گیا۔

☆☆

شیطانوں کا شہر

قانون والا

ایک گلاس فیکٹری میں گزشتہ دو سال سے دس قتل ہوچکے تھے۔ وہاں پر کچھ ایسی چیزیں بنائی جاتی تھیں جن سے ملک کا مستقبل وابستہ تھا اس لحاظ سے اس فیکٹری کا تعلق محکمہ دفاع سے تھا۔ اتفاق سے قتل ہونے والے سب سیکیورٹی فورس کے لوگ تھے جو اندرونی طورپر سازش کا پتا لگانے کے لیے مزدوروں اور کاریگروں کی طرح فیکٹری میں کام کرتے تھے۔

قتل درقتل...... قدم قدم ہنگامے، وہ کوئی شہر تھا یا شیطانوں کا گڑھ

قتل در قتل ـــــ قدم قدم ہنگامے، فتنے
وہ کوئی شہر تھا یا شیطانوں کا گڑھ
جہاں ہر پل، ہر آن قتل و غارتگری کا بازار
گرم رہتا تھا

جنرل کیپو نے میرے سامنے فائل سرکاتے ہوئے کہا:

"گذشتہ دو سال میں یہ دسواں قتل ہے۔"

"قتل کے کیسوں سے ہمارا کیا واسطہ سر ـــ؟" میں نے سوال کیا۔

"ان قتل کے کیسوں سے واسطہ ہے۔" جنرل کیپو نے سگار کا کش لیتے ہوئے جواب دیا۔ "کیونکہ قتل ہونے والے سب سیکیورٹی فورس کے لوگ تھے۔ یعنی جو اندرونی طور پر کسی سازش کا پتہ لگانے کے لیے مزدوروں اور کاریگروں کی طرح فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ اورینٹل گلاس فیکٹری شمالی ہندوستان کی سب سے بڑی فیکٹری مانی جاتی ہے۔ لیکن یہ راز صرف چند لوگ جانتے ہیں کہ اورینٹل گلاس فیکٹری صرف شیشہ کا عام سامان ہی نہیں بناتی بلکہ اس کے ایک حصے میں "گلاس فائبرس" یعنی شیشے کے ریشے بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ ان ریشوں سے شیشے کی باریک نلیاں بنائی جاتی ہیں جن سے لیزر شعاعیں بہ آسانی گزر سکتی ہیں۔ چاہے وہ نلیاں گرہ کی طرح لپٹی ہوئی ہوں۔ یہ نلیاں بال کے مانند باریک بنائی جاتی ہیں مستقبل قریب میں ٹیلیفون کے تاروں کی جگہ یہ گلاس فائبر کی نلیاں لے لیں گی جن کے اندر لیزر شعاعوں کی کرنیں پیغامات لے جانے والے تاروں کا کام دیں گی۔ نظریاتی اعتبار سے ایک لیزر شعاع ایک وقت میں لاکھوں پیغام لے جا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اس فیکٹری میں "آپٹکس" سائنس پر ریسرچ کے لیے لینز اور دوسری چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ ایک طرح سے یہ فیکٹری ڈیفنس سے تعلق رکھتی ہے جس کے ساتھ ہمارے ملک کا مستقبل وابستہ ہے۔

اس فیکٹری میں گزشتہ دو سال میں دس پندرہ بار ہڑتالیں

کرانے کی کوشش کی گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یونین کے لیڈر کچھ لوگوں سے روپیہ لے کر ہڑتالیں کراتے تھے اور وہ لوگ شہر "مور گڑھ" کے معزز لوگ تھے جنھوں نے اس الزام سے سراسر انکار کیا اور ہم ان کے خلاف ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔"

جنرل جھک کر اپنا سگار ایش ٹرے میں ٹھونسے لگے تو میں نے کہا۔

"کیا آپ کو یہ شک ہے کہ کچھ غیر ملکی جاسوس اس فیکٹری کو تباہ کرنا یا بند کرا دینا چاہتے ہیں تاکہ ہمارا ریسرچ کا کام رک جائے۔"

"ہاں ۔۔۔" جنرل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہی میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔"

"کیا ہمارے محکمے کے کچھ آدمی اس سلسلے میں تحقیق کر رہے ہیں؟"

"ہاں۔ ان ہی کی یہ رپورٹ ہے۔ آخری آدمی ایک شخص کرم چند تھا۔ جو گزشتہ ہفتے ہی قتل ہوا ہے۔"

"اور مجرم پکڑا نہیں گیا۔"

"اس رپورٹ کے مطابق تو مجرم پکڑا ہی نہیں جا سکتا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ سارا شہر بے ایمان، دھوکہ باز اور قاتل ہے۔"

"لیکن یہ ناممکن ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ سارا شہر ایسا نہیں ہو سکتا۔

"میں جانتا ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ شہر کے تمام شریف تمام ذمہ دار افسران حتیٰ کہ پولیس افسر تک جرائم پیشہ ذہنیت کے لوگ ہیں۔"

"تو ان افسران کا تبادلہ کیوں نہیں کیا جاتا؟"

"کئی بار تبادلے کیے گئے۔ لیکن وہاں جو جاتا ہے وہیں کے لوگوں جیسا ہو جاتا ہے اس لیے اب میں تمہیں مور گڑھ بھیجنا چاہتا ہوں۔ مور گڑھ پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن گلاس فیکٹری بننے کے بعد وہ چھوٹا سا ہنگامی شہر بن گیا ہے پچھلے آٹھ سال سے شہر کا میئر ایک شخص للت مہتہ تھا۔ دو سال پہلے اس کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ للت اس شہر کا سب سے زیادہ دولتمند اور بارسوخ شخص تھا۔ کئی کوٹھیاں اس کی شہر میں ہیں۔ کئی ہوٹل ہیں اور ایک جوا خانہ چلاتا تھا۔"

"میئر جوا خانہ چلاتا تھا!" میں نے حیرت سے کہا۔

اپنے نام سے نہیں۔ لیکن ہمارے ایجنٹوں کی رپورٹ کے مطابق وہ اس جوا خانے کا مالک تھا جس کو ایک مینیجر چلاتا تھا اور مینیجر للت کا خاص آدمی ہوتا تھا۔ یہ تمام باتیں تمہیں مور گڑھ پہنچ کر خود بخود معلوم ہو جائیں گی۔"

میئر للت کے بارے میں یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ جرائم پیشہ ذہنیت کا آدمی تھا۔ وہ عوام میں بہت مقبول تھا۔ کیونکہ وہ ذاتی طور پر لوگوں کے بہت کام کرتا تھا۔ اسی لیے ہر بار وہ الیکشن بھی جیت جاتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد ہی فیکٹری میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوا اور کئی سیکرٹ ایجنٹ قتل ہوئے۔ چونکہ قتل صرف ہمارے محکمے یا سیکرٹ سروس کے ایجنٹوں کا ہوا ہے اس لئے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ مور گڑھ میں اب کوئی غیر ملکی جاسوس سازشیں کر رہا ہے اور اس نے شاید باقاعدہ تنظیم بنا لی ہے۔"

"آج کل وہاں میئر کون ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک نوجوان شخص رابل کٹاریہ۔"

"میں وہاں کس طرح جاؤں گا۔ یعنی میرا "کور" کیا ہوگا؟"

جنرل نے نیا سگار نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

"للت مہتہ کا ایک بھائی سنیل مہتہ تھا جو بچپن میں ہی گھر سے غائب ہو گیا تھا۔ اس بات کو اب بیس سال ہو چکے ہیں۔ جب وہ بھاگا تھا اس کی عمر دس سال تھی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم سنیل مہتہ بن کر اچانک مور گڑھ پہنچ جاؤ۔ للت کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ جب اس کو قتل کیا گیا ہے۔ صرف چھ ماہ پہلے ہی اس نے اٹھارہ سال کی حسینہ سے شادی کی تھی۔ مرنے کے بعد اس کے وصیت نامے کی رو سے للت کی بیوی توشی اس کی ساری جائداد کی مالک ہے۔ شاید اگر للت کا بھائی ہوتا تو یہ جائداد اس کو ملتی۔ للت مہتہ کا ایک بہت پرانا دوست مسٹر سنتوش بھاٹیہ ہے۔ توشی نے للت کے مرنے کے بعد ان کا خاندانی مکان مسٹر سنتوش بھاٹیہ کو بیچ دیا ہے جس کے ایک حصے کو بھاٹیہ نے ہوٹل بنا دیا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ کو تو مور گڑھ کی پوری تاریخ معلوم ہے" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میرے چار آدمی وہاں مارے جا چکے ہیں۔"

"مجھے کب جانا ہو گا؟"

جتنی جلدی ممکن ہو سکے چلے جاؤ۔"

"کیا جاوید اور سیما کو لے جانے کی ضرورت ہے؟"

"میں کہہ نہیں سکتا۔ اگر تم وہاں للت کے بھائی سنیل مہتہ کی حیثیت سے جا رہے ہو تو شاید یہ تمہاری کچھ مدد نہ کر سکیں۔ پھر میرا مشورہ ہے تم ان کو پہلے سے مور گڑھ بھیج دو۔ یہ دونوں وہاں کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے۔ اس طرح جب تم ضرورت محسوس کرو گے ان کی مدد لے سکو گے۔"

"او کے سر ۔۔۔ لیکن ایک بات میں ابھی تک نہیں سمجھا۔"

"کیا؟"

"آپ مجھے سنیل مہتہ بن کر وہاں جانے کا مشورہ کیوں دے رہے ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے للت مہتہ کو قتل کرنے میں اس کی نوجوان بیوی توشی کا ہاتھ ہے؟"

"مجھے یہی شک ہے۔" جنرل نے جواب دیا۔

"تو آپ کو یہ شک بھی ہے کہ توشی شاید کسی دشمن ملک کی ایجنٹ ہے؟"

"ناممکن نہیں میجر للت کے زمانے میں فیکٹری کے کام میں کبھی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے بھی ہڑتالیں ہوتی تھیں۔ لیکن وہ جائز مطالبوں کے لئے ہوتی تھیں اور مطالبے مان لینے کے بعد یہ ہڑتالیں ختم ہو جاتی تھیں۔ اصل گڑبڑ للت مہتہ کے مرتے ہی شروع ہوئی ہے اور للت شادی کے چھ ماہ بعد ہی قتل کر دیا گیا۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ اس کی بیوی کسی غیر ملک کی ایجنٹ ہو یا غیر ملکی جاسوس کی داشتہ ہو۔"

"کیس دلچسپ ہے۔" میں نے کہا "للت مہتہ کا قتل کس طرح ہوا تھا؟"

"گولی سے۔ وہ اپنے دفتر سے گھر جا رہا تھا کہ کسی نے اس کو گولی مار دی۔ پولیس آج تک قاتل کا پتا نہیں چلا سکی۔"

"پولیس پتا نہیں چلا سکی یا پولیس نے پتا چلانا نہیں چاہا۔"

"میرا خیال ہے دوسری بات صحیح ہے۔"

"اوکے سر۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "یہ فائل میں لے جا رہا ہوں۔ کل ہی میں جاوید اور سیما کو مورگڑھ کے لئے روانہ کئے دیتا ہوں اور دو تین روز بعد خود چلا جاؤں گا۔"

"گڈ لک کرنل۔"

میں نے شکریہ ادا کر کے سیلوٹ دیا اور واپس چل دیا۔

○

مورگڑھ بہت خوبصورت شہر تھا۔ خاص طور پر اس کے قدرتی مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن شہر کی فضا میں واقعی جرائم کی بو محسوس ہوتی تھی۔ یا یہ صرف میرا وہم تھا۔ کیونکہ جنرل کپور نے مجھے اس شہر کے باشندوں کی طرف سے خوف زدہ کر دیا تھا

جاوید اور سیما پہنچ چکے تھے۔ دونوں ہوٹل پلازہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ آنے کے بعد میں نے ایک پبلک فون سے ان کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔

میں آج صبح ہی آیا تھا اور ہوٹل فلورا میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ ہوٹل بیرسٹر سنتوش بھاٹیہ کی ملکیت تھا۔ ہوٹل کی عمارت پرانے طرز کی تھی اور چار منزلہ تھی۔

چلتے چلتے میرے قدم ایک بار کے سامنے رک گئے۔ میں نے سوچا کسی شہر کے بارے میں جاننے کے لئے بار سب سے بہتر جگہ ہوتی ہے۔ کیونکہ بار میں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں اور شراب کے نشے میں ہر طرح کی باتیں بے دھڑک کہہ جاتے ہیں۔

میں بار میں داخل ہوا تو سارا ہال خالی تھا۔ صرف اسٹول پر ایک ادھیڑ عمر جوڑا بیٹھا تھا۔ میں ذرا جلدی بار میں آ گیا تھا۔ ابھی لوگوں کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا

میں بھی ایک اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا۔ بارمین سے میں نے وہسکی کا ایک پیگ مانگا۔ ادھیڑ عمر کے جوڑے میں عورت ضرورت سے زیادہ بے تکلفی باتیں کر رہی تھی۔ بس میں اکتا کر اپنا گلاس لے کر ایک میز پر آ بیٹھا۔

چند منٹ بعد ہی ساٹھ پینسٹھ سال کا ایک بوڑھا بار میں داخل ہوا۔ اس نے بارمین سے ایک بوتل بیئر لی اور میرے برابر والی میز پر آ بیٹھا۔ بیٹھتے بیٹھتے اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے "ہیلو" کہا۔ میں نے بھی جواب میں ہیلو کہہ دیا اور وہ میرے "ہیلو" کو دعوت نامہ سمجھ کر اپنی بوتل اٹھا کر میری میز پر آ گیا۔

"بیئر پیو۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔ میں وہسکی پی رہا ہوں۔"

"تم جوان ہو۔ پھر اکیلے کیوں ہو؟" اس نے بیئر کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو ہر روز نئی محبوبہ میرے ساتھ ہوتی تھی۔"

"میں زندگی کی یکسانیت سے بہت جلد اکتا جاتا ہوں۔" میں نے جواب دیا "اس لئے کبھی کبھی شامیں اکیلے گزارنا پسند کرتا ہوں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" بوڑھے نے سر ہلا کر کہا "زندگی کی یکسانیت تو مجھے بھی بور کر دیتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ سچی خوشی کے لمحے انسان کو زندگی میں بہت کم ملتے ہیں۔"

"لیکن آپ کہہ چکے ہیں کہ آپ کی جوانی بڑی رنگین گزری ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"یہ سچ ہے۔ پھر بھی مجھے سچی خوشی بہت کم ملی ہے۔ انسان خود غرض زیادہ ہے۔ نوے فی صدی لڑکے اور لڑکیاں کسی غرض سے محبت کرتے ہیں۔"

"کیا آپ فلاسفر ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"میں فلسفے کا لیکچرر تھا۔ آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں۔ میں نے شادی نہیں کی۔ اس لئے اکیلا ہوں۔ کچھ جائیداد ہے جس سے ہزاروں روپے مہینے کی آمدنی ہے۔ آرام سے گذر ہو جاتی ہے۔ لیکن خوش پھر بھی نہیں ہوں۔"

"آپ کی اداسی کی وجہ آپ کی تنہائی بھی ہو سکتی ہے۔"

"نہیں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ایک سال پہلے میں نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو مستقل طور پر رکھ لیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ وہ چونکہ طوفانی دور والی عمر سے گزر چکی ہے۔ اس لئے نبھا دے گی۔ لیکن پتا چلا کہ وہ ضرورت سے زیادہ خود غرض نکلی ہیں اس کی موجودگی سے اُداس رہنے لگا تو میں نے اس کو الگ کر دیا۔"

"ہو سکتا ہے اس شہر کی فضا کا اثر ہو۔" میں نے اسے شہر کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے اُکسایا۔

"ہاں یہ ممکن ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس شہر میں گذشتہ بیس سال میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی ہیں۔"

"کیسی تبدیلیاں؟"

"مثلاً یہ کہ یہاں کے لوگ اب ایمان دار نہیں رہے اور لوگوں کی بات چھوڑیئے، ذمے دار افسران ایماندار نہیں رہے۔ میرے خیال میں سارے شہر کے معزز لوگوں میں اور ذمے دار افسروں میں اگر کوئی شخص ایمان دار اور دردمند دل کا مالک ہے تو وہ نیا میئر ہے۔"

"نیا میئر!" میں نے حیرت کی اداکاری کی۔

"کیا تم اس شہر کے رہنے والے نہیں ہو؟"

"رہنے والا اسی شہر کا ہوں۔ لیکن بیس سال بعد آیا ہوں۔ میں نے سنا تھا یہاں کے میئر مسٹر للت مہتہ ہیں۔"

"تھے — وہ دو سال ہوئے مر چکے ہیں۔ ان کو کسی نے گولی مار دی تھی۔ اب راہل کٹاریہ میئر ہے۔ یہ شخص جوان ہے۔ پہلے وکالت کرتا تھا۔ تین چار سال پہلے ہی سیاست میں آیا ہے۔"

"للت مہتہ کو کسی نے گولی ماری تھی اور کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔"

"کیا قاتل گرفتار نہیں ہوا تھا؟"

"میرا خیال ہے پولیس نے قاتل کو گرفتار کرنا نہیں چاہا تھا۔"

"کیوں؟" میں نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔

اس کا جواب میرے پاس نہیں۔ تم لوگ سے مقامی سیاست [illegible]سکتے ہو۔"

"بار میں دو شخص داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک لمبے قد دبلا دُبلا شخص تھا جس کے چہرے پر نوکیلی مونچھیں تھیں۔ دوسرا [illegible]ٹھگنے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا تھا۔ اس کے ماتھے پر کسی نے زخم کی لمبی سی لکیر تھی۔ دونوں کی آنکھیں اور چہرے بتا رہے کہ وہ شریف آدمی نہیں۔ دونوں نے اسٹولوں پر بیٹھ کر وہسکی [illegible] ادھیڑ عمر جوڑا اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر بڈھے [illegible] نے سوال کیا

"تم کہاں سے آئے ہو برخوردار؟"

"دہلی سے۔" میں نے جواب دیا۔

"کسی کاروبار کے سلسلے میں آئے ہو؟"

"نہیں۔ میرا نام سنیل مہتہ ہے۔"

"سنیل مہتہ — !" اس نے حیرت سے کہا۔ "یہ نام تو میں نے کہیں سنا ہے۔"

"میں للت کا بھائی ہوں۔"

"اوہ — ہاں مجھے یاد آ گیا۔ للت کا ایک بھائی بیس بائیس سال پہلے گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ کیا تم وہی بھائی ہو۔"

"ہاں —" میں نے سر ہلا دیا۔

"تم بیس سال بعد واپس آئے ہو۔؟"

"ہاں — آج صبح ہی۔"

"اوہ — پھر تم نے شہر کو کیسا پایا۔ میرا خیال ہے تمھارے بچپن کے زمانے میں اس شہر میں زیادہ ایمان دار لوگ رہتے تھے۔ اس وقت تمھارے بھائی میئر نہیں تھے۔"

"نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "شہر واقعی بہت بدل گیا ہے۔"

تمہیں اپنی بھابی سے جا کر ملنا چاہیئے۔ مگر انہیں دیکھ کر تمہیں حیرت ضرور ہو گی۔"

"کیوں؟"

اس لئے کہ وہ تمھاری عمر کی ہے بے حد خوبصورت۔ للت مہتہ نے ڈھائی سال پہلے شادی کی تھی۔ چھ ماہ بعد وہ قتل ہو گئے۔"

"لیکن بھائی صاحب کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔"

"تو کیا ہوا۔ للت مہتہ رنگین مزاج آدمی تھے۔ ان کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔"

"کیا آپ نے میری بھابی کو دیکھا ہے؟"

"دو بار۔"

"وہ کس قسم کی عورت ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ دھیرے دھیرے تمھارے بھائی کی جائداد بیچ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ للت مہتہ کی موت کے وقت تم یہاں ہوتے تو وہ جائداد تمھیں ملتی۔"

یہ کہتے کہتے وہ اچانک اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی چھوٹی انگلی مجھے دکھاتے ہوئے بولا "میں ابھی آیا۔ آج دوپہر سے بیئر پی رہا ہوں اس لئے۔۔۔"

یہ کہہ کر وہ جھومتا ہوا باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

میری نظریں اچانک ان دونوں آدمیوں پر پڑیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی توجہ ہماری طرف ہے۔ بوڑھا شخص باتھ روم چلا گیا تو ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اپنے گلاس خالی کیے۔ دونوں ٹہلتے ہوئے باتھ روم میں چلے گئے۔

چند منٹ بعد ہی اندر سے ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی غصے سے بول رہا ہو۔ الفاظ واضح نہیں تھے۔

پھر ایک گھٹی ہوئی چیخ سنائی دی۔ ساتھ ہی کوئی چیز دھم سے گرنے کی آواز آئی۔

میں نے بارمین کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہال بالکل خالی تھا۔ بارمین نے بھی یہ آوازیں ضرور سن لی ہوں گی۔ لیکن وہ لاپرواہی سے گلاس تولیے سے صاف کرنے میں لگا رہا۔ اس نے باتھ روم کی جانب نظر اٹھائی۔

میرے دل نے کہا "ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔" اس لیے میں اٹھ کر باتھ روم میں گیا۔ وہاں واقعی گڑبڑ تھی۔

باتھ روم کے بیچ میں لمبے قد والا شخص کھڑا تھا۔ چھوٹے قد کا آدمی شیشے کے سامنے کھڑا کنگھا کر رہا تھا اور بوڑھا شخص ایک دیوار کے قریب زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کی سفید داڑھی پر خون کا ایک قطرہ چمک رہا تھا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو تھے مجھے دیکھ کر لمبے قد کا آدمی سیٹی بجانے لگا۔ چھوٹے قد والا کنگھا جیب میں رکھ کر گھوم کر مجھے دیکھنے لگا۔ بوڑھے نے بچوں کی طرح سسکیاں لیتے ہوئے کہا

"انھوں نے میرے سو روپے چھین لئے ہیں۔ وہ مجھے دلادو اور مجھے مارا بھی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ چھوٹے قد کے آدمی نے کہا۔" اس نے مجھے گالی دی تھی اس لیے میں نے مارا ہے۔"

"یہ جھوٹا ہے۔" بوڑھے نے کہا۔ "انہوں نے میرے سو روپے چھینے ہیں۔"

"شٹ اپ۔ لمبے قد والے نے بوڑھے کو ڈانٹا اور گھونسے دکھاتے ہوئے بولا "کیا اور پٹنے کو جی چاہ رہا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ بوڑھے کی طرف بڑھا تو میں نے کہا۔

"ٹھیرو ۔۔۔ اسے کچھ نہ کہو اور اس کے روپے واپس کر دو۔"

اس بار دونوں غنڈوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ٹھگنے آدمی کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہو گئی جیسے کسی درندے کی آنکھوں میں شکار کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ اس نے کہا۔

"آہا ۔۔۔ کیا تمہارا کوئی ساتھی یہاں ہے جو تمھارے ساتھ مل کر ہم سے روپیہ لے سکے۔"

میں نے پیر سے باتھ روم کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"میں زیادہ باتیں کرنا پسند نہیں کرتا۔ بڑے میاں کے روپے واپس کر دو۔"

"اس کے پاس کوئی روپیہ نہیں تھا۔" لمبے قد والے نے کہا۔ "آؤ جگن ہم چلتے ہیں۔"

وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ لمبے قد والا آگے تھا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جوجٹسو کا ایک وار کیا۔ اس کا پورا جسم قلابازی کھا کر ہوا میں نیم دائرہ بناتا ہوا فرش پر جا پڑا۔

چند لمحوں کے لئے باتھ روم میں ہر چیز ساکت نظر آنے لگی۔ پھر لمبے قد والا چلایا۔

"جگن اس کو لینا۔"

جگن چھلانگ لگا کر مجھ پر آ پڑا۔ ابھی اس کو سنبھالنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ پیچھے سے لمبے قد والے نے میری ٹانگیں کھینچ لیں۔ میں نیچے جا پڑا اور وہ دونوں مجھے چمٹ گئے۔

یہ منظر دیکھ کر بوڑھے شخص نے پیچھے سے لمبے قد والے کی کمر پر گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔ اس نے بوڑھے کو زور سے دھکا دیا۔ بوڑھا پھر پیچھے کی طرف جا پڑا۔

ایک لمحے کے لئے لمبے قد والے کی توجہ بوڑھے کی طرف ہوئی تو مجھے موقع مل گیا۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں اپنے پیٹ میں لگا کر اس کو لمبے قد والے پر دھکیل دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں الجھ کر نیچے گر پڑے۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جیسے ہی ان میں سے ایک اوپر اٹھنے لگا میں نے بوٹ کی ٹھوکر اس کی کنپٹی پر ماری وہ چیخ مار کر پھر نیچے جا پڑا اور وہیں پڑا رہ گیا۔ اس کے بعد لمبا آدمی اچھل کر کھڑا ہوا تو میں نے گھونسوں کی بارش اس کے منہ پر کر دی۔ اور آخر میں "کراٹے" کا ہلکا سا وار اس کی گردن پر کیا۔ وہ بھی کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے جا پڑا۔

"شاباش۔" بوڑھے نے کہا "تم واقعی بہادر بھی ہو اور لڑائی کے فن کے ماہر بھی۔"

"بہادر تم بھی ہو۔" میں نے کہا۔ "تم نے اپنے طور پر میری مدد کرنی چاہی تھی۔"

"چھوٹے قد والے کو ہوش آ رہا تھا۔" بوڑھے نے کہا۔

"میرے روپے اس کی اوپر والی جیب میں ہیں بیس بیس کے پانچ نوٹ ہیں۔"

میں نے اس کی جیب کی تلاشی لی تو روپے نکل آئے میں روپیہ بوڑھے کو دے رہا تھا۔ کہ چھوٹے قد والا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے بوڑھے سے کہا

"تم باہر جا کر ذرا پولیس کو فون کر دو۔ اتنے میں ان کو یہاں روکے ہوئے ہوں۔"

"پولیس کو فون کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔" بوڑھے نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ یہ خود پولیس کے آدمی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ پولیس مین ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ یہ پولیس کے مخبر ہیں۔ دسیوں بار ان کو میں نے پولیس اسٹیشن میں دیکھا ہے۔"

"اچھا تو اب تم جاؤ۔ میں ان کو سمجھ لوں گا۔"

بوڑھا چلا گیا۔ چھوٹے قد کا آدمی مجھے گھور رہا تھا۔ اس میں اب اتنی جرأت نہیں تھی کہ مجھ پر حملہ کرے۔ میں نے بوٹ کی ٹھوکر ہلکے سے اس کی پسلیوں میں مار کر کہا۔

"اٹھو اور اپنے ساتھی کے منہ پر پانی ڈال کر اس کو ہوش میں لاؤ۔"

اس نے اٹھ کر مجھے گھورتے ہوئے کہا

"تم اس شہر میں نئے آئے ہو شاید۔"

"شاید۔"

"پھر تمہیں معلوم نہیں کہ ہم سے ٹکرا کر تم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔"

"بکواس بند کرو" میں نے غصے سے کہا ورنہ میں تمہارے چہرے کا بھرتہ بنا دوں گا۔"

"بہت جلد تمہاری یہ اکڑ فوں نکل جائے گی۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔ میں نے داہنے ہاتھ کا گھونسہ اس کے منہ پر دیا اور بایاں ہاتھ سیدھا کر کے اس کے پیٹ میں گھسا دیا۔ اس کے منہ سے پھر ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی اور وہ تکلیف سے دوہرا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے جن سے خون ٹپکنے لگا تھا۔

"یہ تمہارے لئے پہلا سبق ہے۔" میں نے کہا "اب تو میں تمہیں چھوڑے دیتا ہوں۔ آئندہ اگر تم مجھے ملے تو یاد رکھو چھ ماہ تک ہسپتال میں پڑے رہو گے۔ بہتر ہے کہ اپنے ساتھی کو ہوش میں لا کر فوراً یہاں سے کھسک جاؤ۔"

یہ کہہ کر میں باہر آ گیا۔

بارمین ابھی تک گلاس صاف کر رہا تھا۔ بوڑھا اپنی بیئر ختم کر رہا تھا۔

میں نے بارمین سے کہا

"کیا تم بہرے ہو؟"

"تمہیں کیا چاہیئے؟" اس نے گھورتے ہوئے کہا

"میں نے پوچھا کیا تم بہرے ہو؟ ابھی باتھ روم میں اتنا ہنگامہ ہو گیا اور تم اس طرح ہنستے رہے جیسے تمہیں کچھ پتا نہ ہو۔"

"میں اپنے کام میں مصروف تھا۔" اس نے لاپرواہی سے کہا

"ٹھیک ہے۔ اگر پانچ منٹ تک وہ لوگ باتھ روم سے باہر نہ آئیں تو ہسپتال کو فون کر دینا تاکہ وہ ایمبولینس لے آئیں۔"

"کیا تم اندر لڑ رہے تھے؟" بارمین نے آنکھیں پھیلا کر کہا "شریف لوگوں کا بار ہے۔ یہاں ہم لڑائی دنگا پسند نہیں کرتے"

"میرا خیال ہے دوسری بار مجھے تمہارے دانت توڑ کر اپنے شریف ہونے کا ثبوت دینا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر میں نے بوڑھے سے کہا۔

"کیا تم چل رہے ہو؟"

"ہاں۔۔۔ فوراً۔۔۔"

بوڑھا خالی بوتل پھینک کر میرے ساتھ باہر آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"ردی۔۔۔ روی چند۔۔۔ بیٹا میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔"

"یہ احسان نہیں تھا۔ اگر وہ بدمعاش پھر تمہیں ستائیں تو مجھے بتا دینا۔ میں ہوٹل فلورا میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"تھینکس۔۔۔ تھینک یو ویری مچ۔" بوڑھے نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اور میں ایک طرف کو چل دیا۔

○

رات کے وقت کاؤنٹر پر الو کی شکل کا ایک شخص بیٹھا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کی بھنووں کی وجہ سے مجھے اس کا چہرہ الو جیسا نظر آیا ہو۔ اس کی آنکھیں بھی آدھی کھلی تھیں لیکن اس کا جسم پہلوانوں جیسا تھا۔ میں نے کمرے کی چابی مانگی تو اس نے چابی دے کر پراسرار آواز میں کہا۔

"رات کے لئے کچھ چاہیئے سر؟"

"رات کے وقت تم کیا سپلائی کر سکتے ہو؟"

"جو آپ چاہیں سر۔۔۔ وسکی۔۔۔ لڑکی۔۔۔ یا جو آپ چاہیں۔"

"اوہ آج رات تو میں صرف تنہائی چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ لیکن اس کی بات سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ہوٹل دولت مند عیاشوں کی جنت تھا

دوسری صبح میں ناشتہ کر کے بیرسٹر سنتوش بھاٹیہ سے ملنے

گیا۔ فائل میں اس کے بارے میں جو کچھ درج تھا۔ اس کی رو سے وہ دو سال پہلے تک سرکاری وکیل تھا یعنی جب للت مہتہ قتل ہوا تھا تو وہ سرکاری وکیل ہی تھا۔ اب اس نے پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی تھی۔ وہ مہتہ کا دوست بھی تھا اور قانونی مشیر بھی۔

بھاٹیہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کا سر اور ماتھا ایک ہو چکے تھے۔ مجھے اس نے اپنا نیا موکل سمجھا۔ کچھ دیر چشمے سے مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔

"بیٹھیے۔"

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں سنیل ہوں۔ سنیل مہتہ۔"

ایک لمحے کے لیے تو وہ سمجھا نہیں۔ لیکن پھر ایک گہرا سانس لے کر کرسی سے آدھا اٹھتے ہوئے بولا۔

"اوہ۔ تم سنیل ہو۔ للت کے چھوٹے بھائی۔ وہاٹ اے سرپرائز۔"

"جی ہاں۔" میں نے جھینپنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "جب مورگڑھ سے گیا تھا، اس وقت میری عمر دس سال تھی۔ اسی لئے شاید آپ نہیں پہچان سکے۔ لیکن میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔"

اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور میرے ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے بولا۔

"مگر اب تک تم کہاں تھے؟"

"بس یونہی شہر شہر آوارہ گردی کرتا رہا۔ پھر اچانک مجھے بھائی کی یاد آئی۔ لیکن یہاں آیا تو پتا چلا کہ بھائی مر چکے ہیں۔"

"اوہ۔ تمہیں اب پتا چلا ہے!"

"جی ہاں۔ یہاں آکر مجھے کئی باتوں کا پتا چلا ہے۔ بھائی کو کس نے قتل کیا تھا؟"

ہاں"

اور انھوں نے مرنے سے چھ ماہ پہلے شادی کی تھی؟"

"ہاں۔ تمھیں آنے میں دیر ہو گئی سنیل۔ للت نے تمھیں بہت تلاش کرایا۔ وہ تم سے محبت کرتا تھا۔ اگر تم یہاں ہوتے تو وہ اپنی جائداد اپنی بیوی کے نام نہ چھوڑتا۔ بلکہ یا تو سب یا کم از کم آدھا حصہ تمھارے لیے ضرور چھوڑتا۔"

"تو بھائی ساری جائداد بھابی کے نام چھوڑ گئے ہیں جسے میں نے دیکھا تک نہیں۔"

"ہاں۔"

اور بھابی کے بعد وہ جائداد کس کو ملنی ہے؟"

"توشی یعنی تمھاری بھابی کے مرنے کے بعد اس جائداد کے حق دار تم ہو۔ لیکن توشی ابھی جوان ہے۔ اس کی عمر مشکل سے اٹھارہ سال ہوگی۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے جائداد ملنے کا کوئی چانس نہیں۔"

"سوری۔ فی الحال تو نہیں۔"

"بھائی کی کچھ جائداد آپ کے قبضے میں بھی تو ہے۔"

"میں نے خریدی ہے۔"

"بھابی سے؟"

"ہاں۔"

"مجھے یقین ہے آپ نے بہت سستے داموں پر خریدی ہوگی۔"

"توشی اتنی بے وقوف نہیں۔"

"کیا بھائی کا سارا کاروبار بھابی ہی دیکھتی ہے؟"

"نہیں۔ کاروبار کا منیجر ایک شخص مدن ہے۔"

میں نے چند لمحوں کے وقفے کے بعد کہا۔

"بھائی کو کس نے قتل کیا تھا؟"

"افسوس للت کا قاتل پکڑا نہیں گیا۔"

"پولیس کو کسی پر شبہ ضرور ہوگا۔"

"اگر تھا تو پولیس نے کسی پر ظاہر نہیں کیا۔"

"لیکن آپ بھائی کے دوست تھے اور سرکاری وکیل تھے۔ آپ کو یقیناً معلوم ہوگا کہ پولیس کیا کارروائی کرتی رہی ہے۔ یا بھائی کے مرنے کے بعد آپ نے ان معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی؟"

"یہ بات نہیں سنیل۔ ان ہی دنوں الیکشن کا ہنگامہ شروع ہو گیا تھا اس لئے میں بے حد مصروف ہو گیا تھا۔ اگر تم کیس کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو انسپکٹر قریشی سے مل لو۔ وہی کیس کا انچارج تھا۔"

"کیا میری بھابی ابھی تک اسی مکان میں رہتی ہے جس میں بھائی رہتے تھے؟"

"ہاں۔"

"اوکے شکریہ۔"

یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مسٹر بھاٹیہ سے مل کر یہ اندازہ ضرور ہوا کہ وہ للت مہتہ کے بھائی سے مل کر خوش نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا اندازِ گفتگو اور میرا لہجہ اسے پسند آیا ہو۔

میری دوسری منزل انسپکٹر قریشی کا مکان تھا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کو فون کرنے پر مجھے جواب ملا تھا کہ انسپکٹر قریشی اس دن چھٹی پر ہے۔ وہیں سے مجھے اس کے گھر کا پتہ چلا تھا۔

میں نے اس کے گھر کے دروازے پر دستک دی تو ایک بوڑھی عورت نے آکر دروازہ کھولا جس کے گرد سات بچے منڈلا

ہے تھے۔ یہ قریشی کی بیوی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔
"انسپکٹر قریشی سے مجھے ملنا ہے۔"
"مکان کے پچھلی طرف چلے جاؤ۔" قریشی کی بیوی نے جواب
۔ "وہاں گیرج میں وہ موٹر ٹھیک کر رہے ہیں۔"
میں گیرج میں گیا۔ چالیس پینتالیس سال کے ایک شخص
ے مجھے متجسس نظروں سے دیکھا۔ اس کے بال سفید تھے اور
کھوں میں ذہانت کی چمک بھی تھی۔ میں نے چند رسمی باتوں کے
ر کہا۔
"میرا نام سنیل مہتہ ہے۔ میں مرحوم للت مہتہ کا بھائی
ں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بھائی کے قتل کی تحقیقات آپ ہی
ہت تھے۔"
"ہاں میں ہی کر رہا تھا۔" انسپکٹر قریشی نے جواب دیا۔
"میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ پولیس کس نتیجے پر پہنچی تھی؟"
"نتیجہ صفر رہا تھا۔ ہم قاتل کا پتا نہیں چلا سکے تھے۔"
"پتا چلا نہیں سکے تھے۔ یا پتا چلانا نہیں چاہا تھا۔" میں
اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
اس نے چونک کر تیز نظروں سے میری جانب دیکھا او

"کیا مطلب؟"
"میرا مطلب ہے چونکہ اس شہر میں سیاست زیادہ چلتی
اس لئے ممکن ہے آپ پر دباؤ ڈالا گیا ہو کہ آپ قاتل کو تلاش
یں۔"
"تم مجھ پر رشوت کا الزام لگا رہے ہو؟" اس نے اٹھ کر غصے
ہا۔
"اگر آپ جیسا ذہین پولیس افسر بغیر کسی خاص وجہ کے ناکام
و بہت سے لوگوں کے دلوں میں بہت سے سوالات اٹھ سکتے
بھی کبھی انسان ایسے کام کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے جن
لئے اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا ہے۔ کیا میں پوچھ
ہوں، قتل کن حالات میں ہوا تھا۔؟"
"تمہارے بھائی روزانہ شام کو چھ بجے دفتر سے اٹھ کر
ہی راستے سے گھر واپس جاتے تھے۔ وہ وقت کے بہت
تھے۔ قاتل کو ان کی اس عادت کا پتا تھا۔ چنانچہ ایک دن
راستے میں ایک خالی مکان کے دومنزلے پر چھپ کر بیٹھ گیا
جب مسٹر للت گزرے ان کو گولی مار دی۔
اس کے بعد جب تک پولیس موقع واردات پر پہنچی
فرار ہو چکا تھا۔ قاتل بہت ذہین تھا اس نے پلاننگ کر کے
قتل کیا تھا۔ اس لئے کوئی ایسا سراغ اپنے پیچھے نہیں چھوڑ گیا
تھا جس سے اس کا پتا چل سکتا تھا۔
البتہ چند روز بعد ہمیں وہ پستول مل گیا تھا جس سے
مسٹر للت پر گولی چلائی گئی تھی۔"
"پھر تو قاتل کو گرفتار کرنا آسان تھا۔ اگر پستول کا لائسنس تھا
تو مالک کے نام پتا لگایا جا سکتا تھا۔" میں نے کہا
"وہ ہم نے پتہ لگا لیا تھا۔ پستول ایک صاحب سیٹھ دھرم داس
کا تھا۔ سیٹھ کے مرنے کے بعد ان کے لڑکے نے پستول ایک دکاندار
کو بیچ دیا تھا جو اسلحہ کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ دکاندار امی چند ایک
بوڑھا شخص ہے۔ ذرا سا سنکی ہے۔ سیاست سے بھی دلچسپی رکھتا
ہے۔ امی چند نے تسلیم کیا کہ اس نے پستول خریدا تھا اور اس کے شوروم
میں رکھا تھا وہاں سے چوری ہو گیا تھا۔ اس نے مقامی پولیس اسٹیشن
چوری کی رپورٹ بھی درج کرا دی تھی۔"
"ہو سکتا ہے وہ رپورٹ بھی سازش کا ایک حصہ ہو۔"
"ہاں یہ ممکن ہے۔" انسپکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن
جس شام قتل ہوا ہے امی چند اس شہر میں نہیں تھا۔ اس بات
کے ثبوت مل چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کا مسٹر للت سے کوئی
تعلق نہیں تھا، اس لئے ہمیں اس بات کا یقین کر لینا پڑا۔"
"ہر جرم کی تہہ میں ایک مدعائے جرم ہوتا ہے۔" میں نے
کہا "کیا آپ نے اس زاویئے سے تحقیق کی تھی۔؟"
"ہاں۔" انسپکٹر نے جواب دیا "مسٹر للت کی موت سے
صرف تمہاری بھابی کو فائدہ پہنچتا تھا۔ لیکن تمہاری بھابی اس
قدر کم عمر اور معصوم ہے کہ اس پر قتل کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"
"میری بھابی کہاں کی رہنے والی ہیں؟"
"کیا تم ابھی تک اپنی بھابی سے نہیں ملے؟"
"نہیں۔"
"وہ بمبئی کی رہنے والی ہیں۔ شروع میں مسٹر للت ان کو
سیکرٹری کے طور پر اپنے ساتھ لائے تھے۔ بعد میں شادی کر لی۔"
میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا "اس کے باوجود میں
کہوں گا کہ میرے بھائی کے قتل کے سلسلے میں پولیس نے دلچسپی
سے کام نہیں کیا۔ میں حیران ہوں کہ گذشتہ چند سال سے اس
شہر میں کیا ہو رہا ہے۔"
"کیا ہو رہا ہے اس شہر میں؟" انسپکٹر نے مجھے ترچھی نظروں سے
دیکھتے ہوئے کہا۔
"قتل، جوا، عیاشی کے اڈے، رشوت خوری، بے
انصافی، بدانتظامی کیا نہیں ہے یہاں؟ کیا اس شہر کے تمام ایماندار
آدمی مر گئے ہیں۔"

"کبھی کبھی لوگوں کو اپنی روزی اور اپنی عزت محفوظ رکھنے کے لئے بھی بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔"
میں نے چونک کر انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا
"کیا آپ نے بھی میرے بھائی کے قاتل کی تلاش نہیں کی تھی؟"
"جو کچھ میں کر سکتا تھا میں نے کیا۔" اُس نے شانوں کو اُچکا کر کہا۔ "اب تم جانتے ہو میں بہت مصروف ہوں۔"
میں سمجھ گیا اب وہ کچھ نہیں بتائے گا، اس لئے میں واپس چل دیا۔ لیکن انسپکٹر کے آخری جملے سے ایک بات صاف ہو گئی تھی للت مہتہ کے قتل کا کیس دبا دیا گیا تھا۔ انسپکٹر ایمان دار شخص تھا۔ مگر اُسے اپنے بچوں کو پالنا تھا اس لئے وہ مجبور تھا سازش اونچے پیمانے کی تھی جس کے سامنے انسپکٹر کو جھکنا پڑا۔

○

میری تیسری منزل میری فرضی بھابی یعنی للت مہتہ کی بیوی تھی۔
دروازے کی گھنٹی تین چار بار بجانے پر دروازہ کھلا اور میرے منہ سے حیرت کا ایک گہرا سانس نکل گیا۔
اگر یہی للت کی بیوی توشی تھی تو میں للت کی قسمت پر رشک کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ پتلا دُبلا نازک جسم، گورا رنگ، بڑی بڑی کالی آنکھیں جن میں ہیروں جیسی چمک تھی۔ سر کے بال بھونروں کی طرح چمک دار۔ گدرائے ہوئے ہونٹ۔
مجموعی طور پر وہ حسن اور معصومیت کا بہترین نمونہ تھی۔
اگر میں پہلے سے دل پھینک ہوتا تو اس پر پہلی نظر میں ہی عاشق ہو سکتا تھا۔ توشی کو ایک نظر دیکھ کر کوئی مرد خود پر قابو نہیں رکھ سکتا اور کوئی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ ایسی معصوم لڑکی کسی جرم کے بارے میں سوچ بھی سکتی ہے۔
"کہئے — آپ کون ہیں؟" توشی نے پوچھا۔
"تم واقعی خوبصورت ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا "اب میں سمجھا کہ بھائی نے اس بڑھاپے میں تم سے کیوں شادی کی تھی۔"
اس کی آنکھوں سے حیرت جھانکنے لگی۔ اس نے کہا۔
"آپ کون ہیں؟"
"تم مجھے اپنا دیور سمجھ سکتی ہو۔ میرا نام سینیل ہے۔"
"اوہ — تم میرے شوہر کے وہ بھائی ہو جو دس سال کی عمر میں ان کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔"
"بالکل وہی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔
"آؤ — آؤ — اندر آؤ۔"
میں اس کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ فرنیچر سے امارت اور سلیقہ دونوں چیزیں جھلک رہی تھیں۔
اُس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی سینیل۔ میں تم سے عمر میں چھوٹی ہوں لیکن رشتہ بڑا ہے۔ اس لئے میں تمہارا نام لے رہی ہوں۔ تمہارے بھائی تمہیں بہت یاد کرتے تھے۔"
"اسی لئے وہ اپنی جائداد تمہارے نام چھوڑ گئے ہیں۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔
اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔
"اس میں میرا قصور نہیں اور پھر تم بیس سال سے لاپتہ تھے پھر تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ میں ان کی بیوی تھی۔ تم جانتے ہو تمہارے علاوہ ان کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا اس لئے جائداد مجھے ہی ملنی تھی۔"
"جو تم نے فوراً ہی بیچنی شروع کر دی ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
"میں کیا کرتی — میں عورت ہوں۔ سارا کاروبار میں نہیں سنبھال سکتی۔"
"کاروبار اب کون سنبھالتا ہے؟"
"میں نے ہوٹل ٹھیکے پر دے دیئے ہیں۔ نائٹ کلب ایک شخص مدن چلاتا ہے۔"
"وہی نائٹ کلب جس میں جُوا کھلانے کی مشینیں ہیں۔"
"تم جانتے ہی ہو۔ کیا تم مجھ سے نفرت کرتے ہو کیونکہ میں تمہارے بھائی کی جائداد کی اکیلی مالک ہوں؟"
"مجھے جائداد سے غرض نہیں۔ مجھے اپنے بھائی کی موت کا افسوس ہے جو قدرتی نہیں تھی۔"
"تم کیا سمجھتے ہو مجھے ان کی موت کا دُکھ نہیں؟"
"تم بطور بیوی ان کے ساتھ کتنا عرصہ رہی ہو؟"
"چھ ماہ —"
"اور میرے بھائی کی عمر تم سے ڈھائی گنا تھی۔ کیا تم چھ ماہ میں ایک بوڑھے آدمی سے محبت کر سکتی تھیں۔"
"پلیز سینیل — ہم دوست بن کر بھی بات کر سکتے ہیں"
"میں حیران ہوں کہ بھائی کا قاتل گرفتار کیوں نہیں ہوا؟" میں نے کہا۔
"اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"
"نہیں قاتل کی گرفتاری پر دس بیس، پچاس ہزار کے انعام کا اعلان کرنا چاہئے تھا۔ لاکھوں روپے کی جائداد تمہارے قبضے میں آئی تھی۔ کیا تم اتنا نہیں کر سکتی تھیں؟"

"میرا ارادہ تھا" اُس نے نروس انداز میں جواب دیا۔ "لیکن کچھ دوستوں نے منع کر دیا۔ ان کا خیال تھا اس طرح پولیس کے کام میں رخنہ پڑے گا۔"

"کس کے دوستوں نے؟ تمہارے یا بھائی کے؟"

"تمہارے بھائی کے دوست ہی میرے دوست تھے۔"

اس بار توشی نے قدرے غصے سے کہا۔

"کیا تم مجھ پر الزام لگانا چاہتے ہو کہ تمہارے بھائی کے قتل میں میرا ہاتھ تھا؟"

"ناممکن تو نہیں" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "لاکھوں کی جائداد اور کاروبار کے لئے سب کچھ کیا جا سکتا ہے"

وہ مجھے کچھ دیر گھورتی رہی پھر بولی۔

"پہلے تو میں یہ جاننا چاہوں گی کہ تم واقعی میرے شوہر کے بھائی ہو یا نہیں؟"

میں نے فوراً اپنے کاغذات نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے جو نے سے پہلے میں نے تیار کر لئے تھے جن میں میرا نام سنیل مہتہ ولد سرین مہتہ درج تھا۔ کاغذات دیکھ کر اس نے مجھے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں یقین دلاتی ہوں سنیل کہ تمہارے بھائی کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ تم نہیں جانتے یہ دو سال میں نے کس طرح گزارے ہیں"

"کس طرح گزارے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ڈر ڈر کر"

"کس سے ڈر کر؟"

"تمہارے بھائی کے قاتل سے۔ اب جائداد کی مالک میں ہوں۔ وہ مجھے بھی قتل کر سکتا ہے"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرکے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے شوہر کا بھائی ہوں۔ اگر تمہارے دل میں ذرا بھی انصاف ہے تو آدھی جائداد اور کاروبار تم میرے نام کر دو"

"میرا بھی مستقبل ہے۔ جب میں نے ان سے شادی کی تھی اپنی پوری زندگی ان کے حوالے کر دی تھی۔ اپنی جوانی، اپنا حسن۔ اب اُن کے مر جانے کے بعد میرا کون ہے۔ وہ جائداد اپنی مرضی سے انہوں نے میرے نام لکھی تھی۔ اگر وہ چاہتے تو آدھی تمہارے نام لکھ سکتے تھے، آدھی میرے نام۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ پھر میں کیسے کر سکتی ہوں؟"

"میں نے ہنس کر کہا، "تمہیں معلوم ہے تمہاری موت کے بعد یہ ساری جائداد مجھے مل جائے گی۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف قدم بڑھایا۔ وہ خوف زدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور گھبرا کر بولی۔

"نہیں ـــ نہیں میرے قریب مت آؤ۔ میرے قریب مت آؤ۔"

"ڈرو نہیں" میں نے ایک قہقہہ لگا کر کہا "تمہیں فی الحال قتل کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔"

یہ کہہ کر میں تیزی سے باہر کی طرف چل دیا۔

توشی سے اس طرح کی باتیں میں نے محض اس لئے کی تھیں کہ میں اس کو خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ مجرم جب خوف زدہ ہو جاتے ہیں تو وہ ایسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں جن سے اُن کے جرموں کا راز فاش ہو جاتا ہے اگرچہ وہ صورت سے معصوم نظر آتی تھی لیکن حالات اس قدر پُر اسرار تھے کہ میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے للت کی موت کا کوئی دُکھ نہیں تھا۔ اگر توشی نے اُس کو قتل کرایا تھا اس سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس شہر کی سیاست پر کس کا قبضہ ہے۔ وہ کون سی طاقت ہے جو پولیس پر بھی حاوی ہے اور گلاس کمپنی میں حکومت کے ایجنٹوں کو قتل کرا رہی ہے

○

تین بجے لنچ میں نے ایک ڈھابے نما ہوٹل میں کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اس اسلحہ ساز امی چند سے بھی ضرور ملنا چاہیئے۔ میرے پاس اس کا پتا نہیں تھا۔ لیکن امی چند کو تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کسی شہر میں اسلحہ سازوں کی دوکانیں دو چار سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ چنانچہ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ایک اسلحہ کی دوکان تلاش کی۔ اس کے مالک سے مجھے امی چند اسلحہ ساز کا پتہ چل گیا۔

آدھے گھنٹے بعد میں امی چند کی دوکان میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ پچھتر سال کا ایک بوڑھا جو آدمی سے زیادہ ایک مردہ ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا اپنی گدی پر بیٹھا رائفل کی نال صاف کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے رائفل رکھ دی اور بولا۔

"کہیئے"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے پہلو میں ہی ایک کتاب رکھی تھی۔ "مارکس اور اس کی تعلیمات"

مجھے یاد آیا انسپکٹر نے کہا تھا کہ بوڑھا سنکی ہے اور سیاست سے دلچسپی رکھتا ہے۔ میں نے اس سے سوال کیا۔

"کیا آپ کو مارکس سے بہت دلچسپی ہے مسٹر امی چند؟"

"مارکس اس دور کا عظیم فلاسفر تھا" اس نے جواب دیا

"تم کمیونسٹ ہو؟"

"ہاں ـــ اور مجھے فخر ہے"

"مجھے خوشی ہوئی۔ میرا نام ناہد ہے۔ میں کمیونسٹ اخبار

"جنتا" کا نمائندہ ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔
وہ مسرت سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ میرے لیے چائے منگائی۔ بہت دیر تک اخبار کی پالیسی اور موجودہ سیاست پر بحث کرتا رہا۔ آخر میں اس نے پوچھا
"اب مجھے بتاؤ کہ تم مورگڑھ کیوں آئے ہو؟"
میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
"تمہیں معلوم ہے مسٹر امی چند کہ کمیونسٹ وطن دوست ہوتا ہے۔"
"یہ بات تو یقینی ہے۔ ایک سچا کمیونسٹ ہمیشہ وطن دوست ہوگا۔ وہ اپنے ملک میں سوشلزم لانے کے لیے اندرونی طور پر حکومت سے جدوجہد کرتا رہے گا لیکن جب کبھی ملک کو کسی بیرونی طاقت سے خطرہ ہوگا وہ دشمن کے خلاف سینہ سپر ہو جائیگا۔"
"بالکل ٹھیک۔ اب یہ بتاؤ کہ گذشتہ دس یا پانچ سال میں اس شہر میں کچھ تبدیلیاں آئی ہیں؟"
"تبدیلیاں۔" اس نے حقارت سے کہا۔ "جب سے یہاں وہ گلاس فیکٹری بنی ہے۔ یہ شہر انسانوں کا شہر نہیں رہا شیطانو کا شہر ہو گیا ہے۔ یہاں اب جرائم پیشہ لوگوں کی حکومت ہے۔ کسی کی داد فریاد نہیں۔ کوئی انصاف نہیں۔"
"ایسا کیوں ہوا؟"
"مجھے کیا معلوم۔"
"میں تمہیں بتا سکتا ہوں، بشرطیکہ میں جو کچھ بتاؤں اس کو تم محفوظ رکھو۔"
میں نے دنیا دیکھی ہے برخوردار۔ میرے سینے میں نہ جانے کتنے راز دفن ہیں۔ تم بے کھٹکے جو کہنا چاہو کہہ سکتے ہو۔"
حقیقت یہ ہے کہ وہ فیکٹری حکومت کی ایک خفیہ لیبارٹری ہے جس میں بہت اہم چیزوں پر ریسرچ ہو رہی ہے کچھ دشمن ملکوں کے ایجنٹوں کو یہ راز معلوم ہو گیا ہے اور وہ کسی طرح لیبارٹری اور فیکٹری کو ختم کرنا چاہتے ہیں اس لیے وہ پہلے دھیرے دھیرے شہر پر قبضہ کر رہے ہیں۔"
"تمہارا مطلب ہے اس میں غیر ملکی جاسوسوں کی سازش ہے۔" اس نے حیرت سے کہا۔
"ہاں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں، سی۔ آئی۔ اے نے ہمارے ملک میں جال پھیلا رکھا ہے۔"
"کیا تم ان کو جانتے ہو؟"
"یہی جاننے آیا ہوں۔ میرا خیال ہے دشمن دو سطحوں پر کام کر رہے ہیں یعنی ایک طرف وہ جرائم پیشہ بن کر شہر پر چھا جانا چاہتے ہیں، تا کہ جس کو چاہیں قتل کر سکیں اور دوسری طرف وہ اعلیٰ عہدوں تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت میئر للت مہتہ کا قتل ہے۔"
"کیا تمہارے خیال میں للت مہتہ کا قتل بھی سیاسی تھا؟"
"میرا یہی اندازہ ہے۔"
"اور وہ احمق پولیس والے مجھ پر شک کر رہے تھے۔"
"مجھے معلوم ہے۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی ابھی پولیس کا فائل دیکھ کر آ رہا ہوں۔ اس میں آپ کا ذکر ہے۔ کیا واقعی یہ سچ ہے کہ وہ پستول آپ کے پاس سے چوری ہو گیا تھا؟"
"ہاں یہ سچ ہے۔"
"کیا آپ کو پتا ہے کہ چوری کس نے کیا تھا۔ کسی پر تو آپ کو شبہ ہوگا۔"
"یہ سوال مجھ سے پولیس نے نہیں پوچھا تھا۔" بوڑھے نے مسکرا کر کہا "کیوں کہ وہ مجھ پر شبہ کر رہے تھے اور اسی غصے میں میں نے ان کو سچ بات نہیں بتائی تھی۔"
"سچ بات کیا تھی؟"
"ہاں سچ بات میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔" بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے معلوم ہے پستول کس نے چرایا تھا۔
"کس نے چرایا تھا؟"
"اس کا نام راجندر ہے۔ دراصل اس دوکان کے ساتھ ہی میرا مکان ہے اور بہت بڑا مکان ہے۔ وہ میں نے اس شخص راجندر کو کرائے پر دے دیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی پرمیلا بھی تھی۔ میں جلد ہی ان پر بھروسہ کرنے لگا۔ راجندر نے وہ پستول چرا لیا۔ اس کا مجھے پتا نہ چلتا۔ اگر ایک روز میں دونوں میاں بیوی کو باتیں کرتے نہ سنتا۔ وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا کہ اسکو پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے اس نے میرے شوروم سے پستول نکال کر بیچ دیا ہے۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے طے کیا ہے کہ پولیس کو بتا دوں کہ چور کون ہے کہ دوسرے ہی دن میئر کا قتل ہو گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے فوراً یہ شک گزرا کہ یہ قتل اسی پستول سے ہوا ہے۔ اس لیے میں خاموش ہو گیا۔
بعد میں مجھے دو نئی باتوں کا پتا چلا۔ ایک تو یہ کہ راجندر دوکانوں سے چیزیں چرانے کے جرم میں دو سال کی سزا کاٹ چکا ہے اور دوسرے یہ کہ پرمیلا اس کی بیوی نہیں تھی بلکہ داشتہ تھی۔ اور وہ اس کی دلالی کرتا تھا۔ یہ باتیں معلوم ہونے کے بعد میں نے ان دونوں کو اپنے گھر سے نکال دیا۔"
"آپ نے ان کو پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا؟"
بیٹے۔ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اس لیے میں الجھنوں سے

گھبراتا ہوں۔ تین چار دن بعد ہی پولیس وہ پستول لے کر میرے پاس آگئی۔ میں اپنی بے گناہی کا ثبوت دے سکتا تھا، اس لئے میں نے راجندر کا نام ان کو نہیں بتایا۔ اگر بتا دیتا تو مقدمے میں مجھے بھی گواہ کے طور پر کھنچے پھرنا پڑتا۔"

میں کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا۔ [illegible] میرے اندر ایک جوش بھر دیا تھا۔ گاڑی کچھ آگے کھسکتی نظر آرہی تھی۔ میں نے سوچا اس شخص راجندر سے ضرور ملنا چاہیئے ـــ ہوسکتا ہے قتل اُس نے کیا ہو۔" بلند آواز سے میں نے امی چند سے پوچھا۔

"کیا آپ کے خیال میں راجندر قاتل ہوسکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے، نہیں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں وہ لالچی آدمی ہے اس لئے اس نے ضرور پستول کسی کو بیچ دیا ہوگا، جس وقت وہ پرمیلا کو یہ بات بتا رہا تھا اُسے پتا نہیں تھا کہ میں بھی اس کی باتیں سن رہا ہوں اس لئے اُس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ہونے کو تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ اب وہ کہاں رہتا ہے؟"

"ہاں۔ ابھی دس روز پہلے وہ مجھے بازار میں مل گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ آج کل وہ اپنی بہن کے ساتھ رہتا ہے جو گارڈن روڈ پر رہتی ہے۔ مکان نمبر شاید 13/ا ہے۔ ہاں یہی ہے۔ مجھے نمبر اُس لئے یاد ہے کہ اس بلڈنگ میں میرا ایک دوست بھی رہتا ہے۔"

"او کے مسٹر امی چند۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اب میں اجازت چاہوں گا۔"

"اتنی جلدی۔ رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔"

"پھر کسی روز ـــ آج میں مصروف ہوں۔"

چند رسمی الفاظ کہہ کر میں واپس چل دیا۔

میں نے امی چند کے بتائے ہوئے پتے پر دستک دی۔ پچیس چھبیس سال کی خوبصورت عورت نے دروازہ کھولا مجھے حیرت سے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر پوچھا

"کس سے ملنا ہے؟"

"آپ راجندر کی بہن ہیں؟"

"ہاں۔"

"مجھے راجندر سے ملنا ہے۔"

"کیوں؟"

"کچھ بزنس کی بات ہے۔"

"وہ تو ہے نہیں۔"

"میرا بزنس بہت ضروری ہے جس میں راجندر کا بھی فائدہ ہے۔ میں اس کو کہاں تلاش کرسکتا ہوں؟"

"یہ بتانا تو بہت مشکل ہے۔ البتہ یہ میں بتا سکتی ہوں کہ وہ رات کو نو بجے کہاں ہوگا۔"

"یہی بتا دیجیے۔"

"نو بجے وہ بارڈی کے پاس ہوگا۔"

"بارڈی کون ہے؟"

"تم بارڈی کو نہیں جانتے۔ وہ مدن کے لئے کام کرتا ہے۔"

"مدن بلو نائٹ کلب والا۔"

"وہی۔" عورت نے سر ہلایا۔

"بارڈی کہاں رہتا ہے؟"

اس نے مجھے ایک پتا بتا دیا جو میں نے ڈائری میں نوٹ کرلیا اور عورت کا شکریہ ادا کرکے واپس چل دیا۔

اب نو بجے تک مجھے فرصت تھی اس لیے اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا ـــ دوسری طرف سے جواب ملا۔

"ڈیڈی ـــ" یہ جاوید کی آواز تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں تین بار فون کرچکا ہوں۔"

"کیوں؟"

"میں اس شہر سے اکتا چکا ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ یہاں ایک تو کوئی کام نہیں۔ دوسرے یہاں کی لڑکیاں عجیب ہیں۔ میری طرف توجہ ہی نہیں دیتیں۔"

"کیا کرتی ہیں؟"

"بس دیکھتی ہیں۔ کاندھے اُچکاتی ہیں اور پاس سے گزر جاتی ہیں۔"

"تم بالوں کا اسٹائل بدل دو۔"

"صبح سے چار اسٹائل بدل چکا ہوں۔"

"تو مونچھیں بڑھالو ـــ میرا مطلب ہے نقلی لگالو۔"

"تین قسم کی مونچھیں بھی بدل چکا ہوں۔"

"داڑھی لگا کر دیکھ لو۔"

"وہ بھی کرلیا۔ ایک لڑکی انکل کہہ کر گزر گئی ـــ دوسری ڈیڈی کہنے والی تھی کہ میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔"

"یہاں کی لڑکیاں ذہین معلوم ہوتی ہیں۔"

"ذہین! یہاں کی لڑکیوں سے زیادہ احمق لڑکیاں مجھے ساری

دنیا میں نہیں ملیں۔"

"پھر تو ایک ہی صورت ہے۔"

"کیا؟"

"خودکشی کر لو۔"

"ابھی نہیں۔ ابھی تو بہت سے ارمان دل میں باقی ہیں چار شادیاں کرنی ہیں۔ کم از کم دو درجن بچے تخلیق کرنے ہیں۔ مرنے کے بعد اولاد ہی تو نشانی رہ جاتی ہے۔ میں اپنے بچوں میں سے دو کو جاسوس اور دو کو جرائم پیشہ ضرور بناؤں گا۔ باقیوں کو مختلف برانچوں میں لگادوں گا۔ ڈاکٹر، فلاسفر، شاعر، پہلوان ہر قسم کا آدمی خاندان میں ہو ہی جائے تو فائدہ رہتا ہے۔"

اچانک ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے کہا۔

"تم تنہائی سے بور ہو چکے ہو۔"

"جی ہاں۔"

"تو میں تمہیں کام بتاتا ہوں۔ اور کام بہت خوبصورت ہے۔"

"کوئی لڑکی ہے؟"

"اگر یہ بات ہے تو میں چند گھنٹوں کے لئے اپنے ہوٹل کی فون آپریٹر پہ عاشق ہونے کا ارادہ ملتوی کر سکتا ہوں۔"

"گویا ابھی تک تم عاشق نہیں ہوئے۔"

"دن کی ڈیوٹی میں ایک بوڑھی آپریٹر تھی ـــ رات کو جوان آنے والی ہے۔"

"اچھا تو تم پتا لکھ لو۔ یہ مسٹر للت مہتہ کا پتہ ہے۔"

"اوہ آپ اس کی بیوہ کی نگرانی کرانا چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔"

"چوبیس گھنٹے؟"

"نہیں ـــ فی الحال دن ہی دن میں ٹھیک رہے گی۔ رات آٹھ نو بجے تک۔"

"او کے پتہ لکھا دیجئے۔"

میں نے جاوید کو پتا لکھا دیا۔ اور فون رکھ کر وقت گزارنے کے لئے سو گیا۔

○

ٹھیک نو بجے میں نے ایک چار منزلہ عمارت کی چوتھی منزل کے اکیلے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دراصل یہ فلیٹ بھی نہیں تھا بلکہ برساتی کا کمرہ تھا۔ دروازے کے باہر کافی بڑا ٹیرس تھا۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا۔ گورے رنگ اور ٹھگنے قد کے ایک آدمی نے دروازہ کھولا جس کے چہرے میں نسوانیت تھی۔ اور جب وہ بولا تو آواز میں بھی کسی قدر نسوانیت تھی۔ اس نے پوچھا۔

"فرمایئے۔"

"مجھے مسٹر راجندر سے ملنا ہے۔"

"کیوں؟" اس نے مجھے متجسس نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا

"کچھ بزنس کی بات کرنی ہے۔"

"کس بزنس کی؟"

"یہ میں ان ہی کو بتاؤں گا۔"

"مجھے کیوں نہیں بتاؤ گے؟"

"کیا تم مسٹر راجندر کے سکریٹری ہو۔ میں نے جل کر کہا۔ اگر وہ یہاں ہے تو اس سے کہہ دو مجھے اس سے کچھ کام ہے۔"

اس آدمی نے حلق سے عجیب آواز نکالی اور اندر چلا گیا۔

دو منٹ بعد تئیس چوبیس سال کا ایک خوب صورت شخص باہر آیا۔ مجھے دیکھ کر کہا۔

"تمہیں مجھ سے ملنا ہے؟"

"اگر تمہارا نام راجندر ہے تو تم سے ہی ملنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا یہی نام ہے۔ ویسے ہارڈی نے تمہیں پسند نہیں کیا۔"

"مجھے بھی ہارڈی پسند نہیں آیا۔"

"جس شخص کو ہارڈی پسند نہیں کرتا۔ مجھے بھی وہ شخص پسند نہیں آتا۔" اس نے کاندھے اچکا کر جواب دیا۔ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا۔

"مجھے ایک پستول کی ضرورت ہے۔"

ہم دونوں ٹہلتے ہوئے ٹیرس کے کنارے تک پہنچ گئے تھے۔ ایک گز اونچی دیوار کے دوسری طرف چار منزلہ گہرائی تھی۔ اس نے اچانک رک کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو میرے پاس کیوں آئے ہو؟ شہر میں بہت سی دکانیں ہیں۔"

"پولیس میری تلاش میں رہتی ہے۔ اس لئے مجھے بغیر لائسنس کا پستول چاہیئے۔"

"پھر بھی تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"دو سال پہلے تم نے میرے ایک دوست کو بغیر لائسنس کا پستول بیچا تھا ـــ" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"کس دوست کو؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"تم جانتے ہو اس نے اپنا نام نہ لینے کی ہدایت کر دی تھی۔"

اس بار اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو؟"

"میرا نام سنیل مہتہ ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا اور میں مرحوم للت مہتہ کا بھائی ہوں۔"

بالکل ایسا لگا جیسے راجندر نے بٹن دبایا ہو اور چاقو اس کے ہاتھ میں آ گیا ہو۔ میں پہلے سے ہوشیار تھا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے وار کیا۔ میں نے جھک کر اس کا وار خالی کر دیا اور پھر اٹھتے

ہوئے اس کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی۔ وہ طاقت ور تھا لیکن ناتجربہ کار تھا۔ اس نے کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ میں نے جوجٹسو کا آسان وار کیا اور اس کا جسم ہوا میں دائرہ بناتا ہوا فرش پر آپڑا۔

میں نے پھرتی سے اس کا چاقو اٹھا لیا اور اپنا بوٹ اس کے منھ پر رکھ کر ذرا سا زور دیا۔ اس کے منھ سے چیخ نکلی۔ اسی وقت ایک آواز نے کہا۔

"زیادہ زور سے مت دبانا ورنہ اس کا خوبصورت چہرہ بگڑ جائے گا اور اس کی محبوبائیں تمہیں گالیاں دیں گی۔"

میں نے سر گھما کر آواز کی جانب دیکھا۔ ہم سے چند گز کے فاصلے پر ہارڈی کھڑا تھا اور ہارڈی کے ہاتھ میں پستول تھا۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ راجندر جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا منھ سہلاتے ہوئے بولا

"اس سے کہو یہ میرا چاقو تو دے دے۔"

ہارڈی نے مجھے مخاطب کر کے کہا "سنا تم نے؟"

"میں یہ چاقو اپنے پاس رکھوں گا راجندر کی نشانی کے طور پر" میں نے جواب دیا۔

"تم جانتے ہو میں تمہیں گولی مار سکتا ہوں۔"

"میرے جس دوست نے مجھے یہاں بھیجا ہے وہ یہ ہرگز پسند نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ تمہارے پستول کی گولی کھا کر بھی میں تم میں سے ایک کو چھت سے نیچے پھینک سکوں گا۔"

اس بار ہارڈی نے راجندر کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے سر میں سوراخ نہیں کر سکتا۔ ذرا اس کو بتا دو راجندر کہ میرا نشانہ کیسا ہے۔"

"ہارڈی" راجندر نے ٹھوڑی ملتے ہوئے کہا "یہ میر ملت ہمتہ کا بھائی ہے اور تم جانتے ہو کہ لڑکیاں آنے والی ہیں اس لئے میں یہاں ہنگامہ نہیں چاہتا۔ اس کو جانے دو۔"

"تم اس سے بدلہ نہیں لینا چاہتے؟"

"اب نہیں — اگر یہ مور گڑھ میں رہے گا تو بدلہ لینے کے بہت چانس ملیں گے۔"

"او کے مسٹر" ہارڈی نے مجھ سے کہا "تم خوش قسمت ہو اس لئے اب فوراً یہاں سے کھسک جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ میں یا راجندر اپنا ارادہ بدل دیں۔"

"مجھے امید ہے کہ تم دونوں سے جلد ہی پھر ملاقات ہو گی" میں نے زینے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اس وقت میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ میرے گھومتے ہی گولی نہ چلا دے۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا اور میں بخیریت سڑک پر واپس آ گیا۔

○

بلو نائٹ کلب کا ذکر فائل میں تھا اور کچھ مدن کے بارے میں بھی۔ رپورٹ کے مطابق مدن کا نوشی پر کافی اثر تھا۔ یا تو وہ آپس میں محبت کرتے تھے یا مدن کا نوشی پر کوئی دباؤ تھا چنانچہ میں نے ایک نظر بلو نائٹ کلب دیکھنا بھی ضروری سمجھا۔

کلب عام کلبوں کی طرح تھا۔ پہلے ایک بڑا سا ہال تھا جس کے ایک سرے پر بار تھا اور دوسرے سرے پر چھوٹا اسٹیج جس پر ایک نیم عریاں لڑکی بڑے فحش قسم کا رقص کر رہی تھی۔ اسٹیج کے سامنے بال روم ڈانس کے لئے بھی چھوٹی سی جگہ تھی۔ میں ایک خالی ٹیبل پر جا کر بیٹھ گیا اور بیرے کا انتظار کرنے لگا۔

بیرے سے پہلے ایک لڑکی آ گئی

"کیا آپ اکیلے ہیں؟" لڑکی نے پوچھا۔

"فی الحال تو اکیلا ہی ہوں۔"

"اگر آپ کو ساتھی کی ضرورت ہو تو میں . . . ؟"

وہ خوبصورت تھی۔ عمر پچیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کلب کی جانب سے گاہکوں کو بے وقوف بنانے کے لئے ہے — یعنی دولت مند نوجوانوں کو پھانس کر اپنے لئے وسکی منگاتی رہے اور ہر بار بیرا اس کے گلاس میں کوکو کولا لاتا ہے۔ بل میں سے جو تہائی اس کا حصہ —؟ یہ جانتے ہوئے میں نے مسکرا کر کہا

"بیٹھ جاؤ۔ مجھے اگر چہ ساتھی کی ضرورت نہیں لیکن یہ تمہاری روزی کا معاملہ ہے۔ تم کسی گاہک کے ساتھ بیٹھ کر وسکی نہیں پیو گی تو کمیشن کیسے ملے گا۔"

اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور بیٹھتے ہوئے بولی۔

"آدمی خطرناک نظر آتے ہو۔"

"عورتیں مجھے خطرناک یعنی اپنی ناک کے لئے خطرہ سمجھتی ہیں۔ کیا پیو گی؟"

"اگر تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں بے وقوف بناؤں گی تو پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"یہ میرا فرض ہے کیونکہ اب تم میری مہمان ہو۔"

"او کے میرے لئے وسکی منگا دو۔"

میں نے بیرے کو بلا کر وسکی کا آرڈر دیا۔ پھر اس سے کہا۔

"اگر تم مناسب سمجھو تو ہم آپس میں تعارف کر لیں۔ میرا نام سنبل ہے۔"

"میرا نام پرمیلا ہے۔"

پرمیلا نام سن کر میں چونکا۔ آج ہی امی چند نے راجندر اور پرمیلا کا ذکر کیا تھا۔

"کیا آج کل تم راجندر کے ساتھ نہیں رہتیں؟" میں نے

فوراً اندھیرے میں تیر چلایا۔
"تم راجندر کو جانتے ہو؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔
"ہاں ---"
"لیکن میں نے کبھی تمہیں اس کے ساتھ نہیں دیکھا۔"
"میں زیادہ عرصہ باہر رہتا ہوں۔ آج ہی آیا ہوں۔ راجندر ان دنوں کہاں رہتا ہے؟"
"مجھے معلوم نہیں۔" پرمیلا نے ہونٹ بچکا کر کہا۔ "میں اس کے ساتھ نہیں رہتی۔"
"کیوں؟"
"وہ کمینہ ہے۔ میں نے اس کے لئے سب کچھ کرنا قبول کیا اور اب اس کے پاس پیسہ آنے لگا ہے تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔"
"پیسہ کہاں سے آنے لگا ہے؟"
"آج کل وہ کوکین، ہیروئن اور چرس کا دھندا کر رہا ہے۔"
"کس کے لئے؟"
"اپنے لئے۔"
"لیکن اس کا دوست ہارڈی تو اس کلب کے منیجر مدن کے لئے کام کرتا ہے۔"
"تم سب کچھ جانتے ہو۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔
"سب کچھ نہیں --- بہت سی باتیں میں جاننا چاہتا ہوں۔"
"کیسی باتیں؟"
"مثلاً یہ کہ اس کلب میں کھلے عام جوا ہوتا ہے اور پولیس کبھی چھاپا نہیں مارتی --- کیوں ---؟"
"پیسے میں بڑی طاقت ہے۔"
"تمہارا مطلب ہے شہر کی تمام پولیس مدن کی غلام ہے۔"
"تقریباً۔"
"پھر تو مدن دیکھنے کی چیز ہے۔"
"یقیناً ہے۔ اگر تم نے کبھی انسان نما مینڈک۔ یا مینڈک نما انسان نہیں دیکھا تو مدن کو ضرور دیکھو۔ لیکن ذرا ہوشیار رہنا اور اس کے ساتھ کوئی چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرنا --- بہت خطرناک ہے۔"
"تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔"
"میں نہیں جانوں گی تو اور کون جانے گا۔ میں اس کی ملازم ہوں۔ جب اس کا جی چاہتا ہے وہ مجھے بلا لیتا ہے۔"
مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے لہجے میں حقارت اور نفرت تھی میں نے کہا۔
"اس کا مطلب ہے وہ تمہیں پسند نہیں۔"
"بس اس وقت اچھا لگتا ہے جب وہ مجھے تنخواہ دیتا ہے۔"
مدن کا اتنی بار اور اتنے لوگوں سے ذکر سن چکا تھا کہ اب اس سے ملے بغیر چارہ نہیں رہا تھا۔ میں نے پرمیلا کو دو پیگ اور منگا کر دیئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ پھر بہانہ کر کے اسکو ٹال دیا اور گھومتا ہوا برابر والے ہال میں آیا۔ جہاں بہت سی مشینیں جوا کھیلنے کے لئے تھیں جن پر لوگ جوا کھیل رہے تھے اور ہار رہے تھے۔
جوا کھیلنے اور کھلانے کے بارے میں یہ مسلّم اصول ہے جوا کھلانے والا ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے۔ جوا کھیلنے والے کا چانس صرف ایک فی صد ہوتا ہے۔
میں ایک رولٹ مشین پر جا کھڑا ہوا۔ چند روپے ہارنے کے بعد میں نے مشین کے انچارج سے پوچھا۔
"کیا یہاں بڑا گیم ہوتا ہے؟"
"پچاس ہزار تک اندر کمرے میں۔" اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں اس دروازے میں داخل ہوا تو دیکھا یہ بھی ایک چھوٹا سا ہال تھا اور مختلف ٹیبلوں پر لوگ تاش کھیل رہے تھے --- رمی --- فلیش، برج --- غرض کہ ہزاروں روپے کی ہار جیت ہو رہی تھی۔
کمرے میں دو تین آدمی سیاہ سوٹ پہنے پھر رہے تھے جن کی صورتوں سے غنڈہ پن برس رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ کمرے میں سکون اور امن و امان قائم رکھنے کے لئے ہیں۔
میں نے آگے بڑھ کر ان میں سے ایک سے پوچھا۔
"کیا مسٹر مدن یہاں کلب میں موجود ہیں؟"
"ہاں ہیں --- کیا بات ہے۔"
"میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"کیوں ---؟"
"کام ان ہی کو بتاؤں گا۔"
اس نے ایک دروازے کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "باہر کوری ڈور میں ان کا آفس ہے۔"
میں اس کمرے سے باہر نکلا تو ایک کوری ڈور تھا اور آخری سرے پر ایک دروازہ تھا جس پر مدن کے نام کی تختی لگی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی اندر سے جواب ملا۔
"کم ان ---"
میں اندر داخل ہوا۔ کمرے میں اس وقت صرف دو آدمی تھے۔ ایک چھ سوا چھ فٹ قد کا کریل آدمی صوفے پر لیٹا تھا۔ دستے پر ایک ہولسٹر لٹکا ہوا تھا جس میں پستول تھا۔

مدن میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ پریمیلا نے اس کا بالکل صحیح حلیہ بتایا تھا۔ واقعی ایسا لگتا تھا کہ وہ انسان اور بیڈگ کی مخلوط نسل ہے۔

مدن نے مجھے گھور کر دیکھا اور بڑے پُر اخلاق لہجے میں کہا۔ فرمایئے — میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"میں نے سُنا ہے کہ آپ اس شہر کے بے تاج بادشاہ ہیں۔"

"یہ مبالغہ ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے یہ بزنس سنبھالے صرف دو سال ہوئے ہیں۔"

"اس کے باوجود شہر بھر میں آپ کی شہرت ہے۔"

"شکریہ۔ کیا آپ صرف میری تعریف کرنے آئے تھے۔"

"جی نہیں — میں نے سُنا ہے کہ آپ بہت اچھے آقا بھی ہیں — آپ کی ملازمت کر کے ہر شخص خوش رہتا ہے۔ میں بھی ملازمت چاہتا ہوں۔ میں کسی قسم کے خطروں سے نہیں گھبراتا ور آرڈر ملنے پر کوئی سوال نہیں پوچھتا۔"

اس بار اس نے مجھے تنقیدی نظروں سے اوپر نیچے دیکھا۔ پھر سوال کیا۔

"خطروں سے تمھاری کیا مراد ہے؟"

"میں موت سے نہیں ڈرتا۔"

"تو میرے پاس ہی کیوں آئے ہو؟"

"آپ کے کئی ملازموں سے میری بات چیت ہوئی ہے ان سب کی رائے یہ ہے کہ آپ اپنے ملازموں کو خوش رکھنا جانتے ہیں۔"

مدن کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی جس سے اس کا چہرہ اور بھیانک ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"تم کیا کر سکتے ہو؟"

"دنیا کا ہر کام — میرا مطلب ہے میں ٹکنیکل کام نہیں جانتا ہاتھوں اور جسم سے جو کام لئے جا سکتے ہیں وہ میں سب کر سکتا ہوں۔"

"پستول چلانا جانتے ہو؟"

"میں پچیس گز کے فاصلے سے سوئی گولی سے اُڑا سکتا ہوں۔"

"لڑنا جانتے ہو؟"

"لڑ سکتا ہوں۔"

"گارگی۔" اس بار اس نے صوفے پر پڑے دیو کو مخاطب کر کے کہا۔ "ذرا کھڑے ہونا، میں دیکھنا چاہتا ہوں کیا یہ شخص تم سے لڑ سکتا ہے۔"

گارگی نے ایک جماہی لی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ دو تین بار ہاتھ گھمائے اور میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

اس سے لڑنا آسان کام نہیں تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ کا گھونسا چلایا۔ اس کا سر تیزی سے ایک طرف ہو گیا۔ لیکن میں نے اسکو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ جیسے ہی اس نے میرے بائیں گھونسے سے بچنے کے لئے سر پیچھے کیا میں نے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کے پیٹ میں گھسا دیا۔

اس گھونسے کو گارگی نے اپنی توہین سمجھا اور اس نے مجھ پر دشمنوں کی طرح وار کرنے شروع کر دیئے۔ مشکل یہ تھی کہ میں مدن کو یہ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں لڑائی کے کئی فنون میں ماہر ہوں، اسلئے میں اناڑیوں کی طرح ہاتھ چلا رہا تھا۔

آخر ایک بار موقع پا کر میں نے اس کی گردن پر ہلکا سا کراٹے کا وار کیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس وار سے پریشان ہو جاتا۔ گارگی کی صرف آنکھیں پھیل گئیں اور اس کے جسم کی رفتار سُست پڑ گئی۔ چونکہ یہ صرف دوستانہ مقابلہ تھا اس لئے میں نے اپنے سر کی ٹکر اس کے سینے میں اس طرح ماری کہ وہ صوفے پر جا گرا اور وہیں بیٹھا رہ گیا۔

○

بس اب اُٹھنے کی ضرورت نہیں گارگی —" اس نے کہا۔ "میں نے صرف اس لڑکے کو آزمانے کے لئے تمھارے ساتھ کھڑا کیا تھا۔ تم نے اس سے سچ مچ لڑنا شروع کر دیا۔ لڑکا واقعی پھرتیلا ہے۔" "اس نے دھوکے سے میرے گھونسا مارا تھا۔" گارگی نے غصے سے کہا۔ "ورنہ اس تِنکے کی کیا حیثیت ہے کہ میرے ہاتھ مار سکے۔"

"او کے — غصہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" پھر اس نے مخاطب کر کے کہا۔ "آل رائٹ۔"

"میں تمہیں ملازم رکھ سکتا ہوں۔ کل دوپہر کو تم میری کوٹھی پر آ کر مجھ سے ملو۔"

"تھینک یو سر۔" نے سیلوٹ دے کر کہا

"تمہارا نام کیا ہے۔"

"سنیل۔"

"اچھا۔ اب تم جاؤ۔"

"میں دوسری بار سیلوٹ کر کے واپس چل دیا۔ لیکن میں جیسے ہی دروازہ بند کر کے کوری ڈور میں واپس آیا، سامنے والے دروازے سے بارڈی کوری ڈور میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی بجلی کی سی تیزی سے اس نے پستول نکال لیا۔ اور مجھے نشانہ بناتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ہارڈی کو وہاں دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ ملازم ہونے کا میرا سارا ڈرامہ بے کار ہو گیا۔
پھر بھی میں نے ہمت سے کام لے کر کہا
"اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
"شٹ اپ تم جانتے ہو میں مسٹر مدن کے لئے کام کرتا ہوں۔ چلو گھوم کر باس کے دفتر میں واپس چلو۔"
"اور اگر میں نہ جاؤں؟" میں نے اس کی طرف ایک قدم بڑھا کر کہا۔
"اور آگے مت بڑھو۔" ہارڈی نے خود ذرا سا پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "اگر تم آگے بڑھے تو میں گولی مار دوں گا۔"
"میرا خیال ہے مسٹر مدن یہ پسند نہیں کریں گے۔" میں نے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
"دیکھو دیکھو۔۔۔ میں آخری وارننگ دیتا ہوں، ٹھہرو۔ ورنہ گولی۔۔"
اس کے الفاظ ادھورے رہ گئے۔ میرے پیچھے دفتر کا دروازہ کھلا۔ میں نے ذرا گھوم کر کنکھیوں سے دیکھا۔
وہ گارگی تھا جس کو ابھی ابھی میں نے اپنا دشمن بنا لیا تھا۔
"گارگی اس پر حملہ کر دو۔" ہارڈی بولا "یہ خطرناک ہے۔"
گارگی کو اپنا بدلہ چکانے کا موقع مل گیا۔ اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی ۔۔۔ میں تیار تھا، پھرتی سے میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کے منہ پر گھونسا مارا۔
وہ منہ کے بل دھم سے زمین پر گرا۔ میری توجہ گارگی پر تھی۔ ہارڈی نے اچانک دوسری طرف سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں اس کے حملے سے بچنا چاہتا تھا کہ نیچے گرے ہوئے گارگی نے میری ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیں۔ میں نیچے گر پڑا۔ دونوں مجھ پر سوار ہو گئے۔ اسی وقت پھر دروازہ کھلا۔ اس بار باہر سے آنے والا مدن تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ایک لمحے کے لئے وہ ساکت رہ گیا پھر غصے سے بولا۔
"گارگی میں نے کہا تھا کہ میں اپنے ملازموں کے درمیان لڑائی پسند نہیں کرتا اور ہارڈی تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
ہارڈی جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اور پھر مجھے پستول سے نشانہ بناتے ہوئے بولا۔
"باس یہ آدمی خطرناک ہے۔"
"کیا تم اسے جانتے ہو؟"
"ہاں باس ۔۔۔ یہ مرحوم للت مہتہ کا بھائی ہے۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے یہ راجندر کی تلاش میں میرے پاس آیا تھا۔ اس نے راجندر کو مارا۔ یہ اس سے اپنے بھائی کے قتل کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔"
مدن نے میری طرف تیز نظروں سے دیکھا۔ پھر ہارڈی سے سوال کیا۔
"کیا راجندر نے اسے کچھ بتایا؟"
"نہیں۔ میں عین وقت پر آ گیا تھا۔"
"یہ راجندر بھی اب خطرہ بنتا جا رہا ہے۔ وہ اب کہاں ہے؟"
"مجھے معلوم نہیں باس۔"
"لیکن وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے۔"
"نہیں باس ۔۔۔ بالکل نہیں۔"
"تم اس کو تلاش کر کے میرے پاس لاؤ، لیکن پہلے بال سے پرشاد کو بلا لو اور تم گارگی اس دھوکے باز کو اندر لے آؤ۔ میں ایسے آدمیوں کو قطعی پسند نہیں کرتا جو مجھ سے جھوٹ بولیں۔"
گارگی کے پاس پستول تھا۔ اس نے نال میرے سر سے لگا کر کہا "چلو آگے چلو۔"
میں اس کے ساتھ دوبارہ دفتر میں آ گیا۔ ہارڈی واپس چلا گیا۔ دو منٹ بعد ہی وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی کے ساتھ واپس آیا۔ مدن نے اس سے کہا۔
"مسٹر پرشاد۔ یہ شخص میرے دفتر میں چوری کرنے آیا تھا۔ عین وقت پر پکڑا گیا۔ تم اس کو گرفتار کر لو۔"
پرشاد سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے جیب سے ہتھکڑیاں نکال کر مجھے پہنا دیں۔ اب مجھے پتا چلا کہ وہ کوئی پولیس افسر تھا۔ اس واقعے سے مجھے یہ بھی یقین آ گیا کہ شہر کی تمام پولیس مدن کی زرخرید تھی۔ گویا مدن واقعی سارے شہر کا باس تھا۔
لیکن یہ بات عجیب تھی۔ مدن چالاک ہو سکتا تھا۔ مگر اتنا ذہین نہیں ہو سکتا کہ باقاعدہ کوئی تنظیم چلا سکے۔
"اس پر کیا کیا جرم عائد کروں مسٹر مدن؟" پولیس افسر نے پوچھا۔
"ڈاکہ اور قاتلانہ حملہ کافی رہے گا۔"
"جی ہاں ۔۔۔ اور پولیس افسر کے کام میں رکاوٹ ڈالنا ڈیوٹی پر موجود پولیس افسر کو گالی دینا وغیرہ وغیرہ۔"
"لیکن نہیں ۔۔۔" اچانک مدن نے ہاتھ اٹھا کر کہا "مسٹر پرشاد میں اس آدمی کو ایک چانس دینا چاہتا ہوں۔ یہ للت مہتہ کا بھائی ہے اس کو جان لینا چاہئے کہ اس شہر میں اب اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس کو شہر سے چند میل باہر چھوڑ آؤ۔ اگر یہ عقل مند ہو گا تو پھر کبھی اس شہر میں واپس نہیں آئے گا اور اگر یہ پھر واپس آ جائے تو تم جانتے ہو کہ تم کیا کرو گے؟"

"بہت اچھا مسٹر مدن — آپ واقعی رحم دل ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے "تم خوش قسمت ہو احمق آدمی تمہیں مسٹر مدان کا احسان مند ہونا چاہیئے۔"

میں نے بات بڑھانی مناسب نہ سمجھی اس لئے کہا — "میں احسان مند ہوں۔"

میں پولیس افسر کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے کلب کے پچھلے دروازے سے باہر لایا۔ جہاں ایک کار کھڑی تھی۔ وہ مجھے کار میں بٹھا کر چل دیا۔

میرے ہاتھوں میں ابھی تک ہتھکڑیاں تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا یہ تمہاری اپنی کار ہے؟"

"ہاں —"

"اس شہر میں پولیس والوں کو بہت زیادہ تنخواہیں ملتی ہیں"

"ہونہہ تنخواہ — تنخواہ کی کس کو پرواہ ہے۔ تم واقعی خوش قسمت ہو مسٹر۔ اگر مسٹر مدن چاہتے تو تم اس وقت جیل میں ہوتے۔"

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"فکر مت کرو۔ میں تمہیں ایسی جگہ چھوڑوں گا جہاں تمہیں دوسرے شہر کے لئے بس مل جائے گی۔"

میں خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم شہر سے باہر نکل آئے آخر تین چار میل دور اس نے ایک جگہ گاڑی روک کر کہا۔

"یہاں اتر جاؤ۔"

"کیا میں ہتھکڑیوں کے ساتھ جاؤں گا؟"

"باہر نکلو۔ میں ہتھکڑیاں کھولتا ہوں۔"

میں باہر نکل آیا۔ اس نے ہتھکڑیاں کھول کر جیب میں رکھ لیں۔

میں نے پوچھا۔

"کیا تم انسپکٹر ہو؟"

"سب انسپکٹر۔"

"شہر کے حالات سے مطمئن ہو؟"

"کیوں نہیں۔ شہر میں کیا خرابی ہے؟"

"کچھ نہیں۔ صرف یہاں قانون نہیں۔"

"قانون ہم ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی

اس کے جانے کے بعد مجھے آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ ب کہیں جا کر ایک ٹرک نظر آیا۔ ٹرک والے نے دس روپے ے لالچ میں مجھے ٹرک میں بٹھا لیا اور واپس شہر پہنچا دیا۔

○

اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے میں ایک ریسٹوران میں گھس گیا اور کافی منگا کر پینے لگا۔ ٹیبل پر شام کا اخبار پڑا تھا میری نظر اس کی ایک سرخی پر پڑ گئی۔

"گلاس فیکٹری کے باہر ایک لاش پائی گئی۔"

نیچے خبر کی تفصیل اس طرح تھی

"آج دوپہر اورینٹل گلاس فیکٹری کے باہر نالے میں ایک ادھیڑ عمر مرد کی لاش پائی گئی۔ بعد میں تحقیق پر پتا چلا کہ وہ شخص فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ وہ مزدوروں کے خلاف مالکوں کو بھڑکاتا رہتا تھا۔ اندازہ ہے کہ مزدوروں نے غصے میں اس کو قتل کر دیا — پولیس تحقیق کر رہی ہے۔"

خبر پڑھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ بھی ضرور کوئی ہمارے محکمے کا آدمی ہوگا۔ یہ گیارھواں قتل تھا۔

جس بیرے نے مجھے کافی لا کر دی تھی، وہ قریب کھڑا تھا — میں نے اس سے سوال کیا۔

"کیا اس شہر میں اکثر قتل ہوتے رہتے ہیں؟"

"قتل ہر شہر میں ہوتے ہیں سر" اس نے جواب دیا — "یہاں زیادہ قتل فیکٹری میں ہوتے ہیں۔ جہاں غنڈے بھرے ہوتے ہیں۔"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اچانک ریسٹوران کے دروازے میں ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ وہ راجندر تھا۔

میں نے جلدی سے دوسری طرف منہ پھیر لیا کہ کہیں وہ مجھے پہچان نہ لے۔

راجندر نے دروازے میں رک کر ایک نظر پورے ہال پر ڈالی۔ پھر کاؤنٹر پر پہنچ کر کچھ کہا۔ فوراً کاؤنٹر کلرک نے چمڑے کا بریف کیس اٹھا کر اس کو دے دیا۔ راجندر بریف کیس لے کر واپس چل دیا۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میرے ذہن میں خیال پیدا ہوا۔ مجھے اس کا پیچھا کرنا چاہیئے۔

یہ سوچ کر میں نے جلدی جلدی کافی حلق میں انڈیل لی۔ پلیٹ میں دو روپے رکھے اور بیرے کو روپے اٹھانے کا اشارہ کر کے باہر کی طرف چل دیا۔

باہر نکل کر دیکھا کہ راجندر پیدل ہی ایک طرف کو جا رہا ہے میں کچھ فاصلہ دے کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔

تقریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد وہ ایک بلڈنگ میں گھس گیا۔ میں اس بلڈنگ کے تاریک دروازے میں چھپ گیا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا اب اس کے ساتھ ایک

عورت تھی۔ اندھیرے میں میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا صرف آواز سن سکتا تھا۔ وہ خوشامد کے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"راجندر یہ تو سوچو تم کبھی مجھ سے محبت کرتے تھے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" راجندر کی آواز سنائی دی۔ "لیکن بزنس بزنس ہے مالتی۔"

"میں نے تمہاری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ تم نے میری عزت میرا حسن اور میری جوانی سب کچھ لوٹ لیا۔"

"میں یہ قصے سننے نہیں آیا۔"

"مگر میں مر رہی ہوں۔ تین دن سے مجھے نیند نہیں آئی اگر آج تم نے میری سپلائی نہ دی تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

"میں تمہیں پچھلے ہفتے بھی ادھار دے گیا تھا۔"

"میں جانتی ہوں۔ لیکن اس ہفتے میں صرف چند گاہک ملے جن سے گھر کا خرچ بھی مشکل سے چل سکا۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ پچھلے ہفتے کے تیس روپے دو۔ میں سپلائی تمہیں دے دوں گا۔"

"اتنے کٹھور مت ہو راجندر پلیز۔"

"بزنس میں میرا ایک پارٹنر ہے جس کو مجھے حساب دینا ہوتا ہے۔"

ایک گہرا سانس لے کر لڑکی نے کہا۔

"اچھا ظالم۔۔۔ بے مروت۔۔۔ یہ لے تیس روپے۔ اس کے بعد میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ میری بچی بیمار ہے۔ کل کو اس کی دوا بھی نہ آسکے گی۔"

"میں نے دنیا بھر کے خاندانوں کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔" راجندر نے جواب دیا۔ پھر کچھ نوٹ کھڑکھڑانے کی آواز سنائی دی۔ پھر عورت کے گہرا سانس لینے کی آواز۔

میں سمجھ گیا کہ راجندر نے افیم یا کوکین کی سپلائی لڑکی کو دے دی ہے۔ اس کے بعد لڑکی اوپر واپس چلی گئی اور راجندر باہر کی طرف چل دیا۔

کچھ فاصلہ دے کر میں پھر اس کے پیچھے چل دیا۔ مجھے خوشی تھی کہ وہ پیدل چل رہا تھا۔ اگر اس کے پاس گاڑی ہوتی تو اس کا تعاقب کرنا مشکل ہو جاتا۔

ایک گھنٹہ ہم آگے پیچھے چلتے رہے۔ اس دوران وہ کئی عمارتوں میں گیا اور دو چار منٹ رہ کر واپس آگیا۔ میں سمجھ گیا کہ ان عمارتوں میں اس کے گاہک رہتے ہیں۔

پھر وہ چلتے چلتے للت مہتہ کے مکان تک پہنچ گیا۔ اسی وقت پیچھے سے ایک کار کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ پھر سامنے کی طرف دیکھا تو راجندر غائب ہو چکا تھا

نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ خطرہ ہے۔ اس لئے میں بھی جلدی سے ایک درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ وہ کار میرے قریب سے گزری تو مجھے پتا چلا کہ میری چھٹی حس نے خطرے کو صحیح طور پر محسوس کیا تھا۔۔۔ گاڑی میں ہارڈی تھا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو شہر کی پولیس میری تلاش میں لگ جاتی۔ اور بہت ممکن تھا کہ پولیس کی جانب سے اعلان ہوتا کہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔

ہارڈی کی کار للت مہتہ کی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر ذرا سست ہوئی اور پھر آگے بڑھ گئی۔ کار کے نظروں سے غائب ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ راجندر ایک عمارت کی آڑ سے نکلا اور للت مہتہ کی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ میں تیز چلتا ہوا کوٹھی تک پہنچا تو وہ دوسری بار غائب ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ کوٹھی کے اندر چلا گیا تھا۔

یہ عجیب بات تھی۔ میں نے سوچا، راجندر رات کو روشی سے ملنے کیوں گیا ہے؟ میرے نقطہ نظر سے راجندر جرائم کی مشینری میں اتنا اہم پرزہ نہیں تھا کہ روشی اس سے محبت کا کھیل کھیلتی۔ میرا تجسس اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ میں دبے قدموں سے کوٹھی کے دروازے تک پہنچا اور آہستہ سے ہینڈل گھما کر دیکھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

میں گھومتا ہوا عمارت کی پشت پر پہنچا۔ اس طرف کمرے میں ایک روشنی دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ راجندر اندر ہے۔۔۔ باورچی خانے کا دروازہ اس طرف بھی کھلتا تھا۔ اس وقت اس میں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال لیا اور تالا کھولنے لگا۔ معمولی تالا تھا۔ اس لئے آدھے منٹ میں ہی کھل گیا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ اندر دھکیل کر کوئی آواز سننے کی کوشش کی۔ لیکن وہاں بالکل سناٹا تھا۔

میرے پاس پستول اب بھی نہیں تھا۔ دبے قدموں سے میں اندر داخل ہو گیا اور اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اندرونی دروازے سے باہر آگیا۔ دوسری طرف ایک ہال تھا۔ اس میں بھی اندھیرا تھا۔ میں دیوار کے سہارے چلتا رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کسی چیز سے ٹکرا نہ جاؤں۔ آخر ایک دروازہ محسوس ہوا۔ میں نے اس کا ہینڈل گھمایا۔ تو دروازہ کھل گیا۔

ایک بار پھر میں نے کوئی آواز سننے کی کوشش کی لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ اس لئے میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ یہاں مدھم سی چمک تھی۔ کیوں کہ سامنے ہی ایک اور دروازہ تھا جس کے اوپر والے حصے میں سن شیشے لگے ہوئے تھے اور ان شیشوں سے باہر نکلنے والی روشنی نے اس کمرے کو ہلکا سا روشن کر دیا تھا۔

میں سمجھ گیا یہ وہی کمرہ ہے جس کی کھڑکی باہر کی جانب کھلتی

ہے۔ میں دبے قدموں سے دروازے تک پہنچا۔ شیشے سے جھانکا۔ اندر دو سائے نظر آئے اور مدھم سی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے چابی کے سوراخ سے جھانکا۔ کمرے کے ایک کونے میں مجھے چار ٹانگیں نظر آئیں جن میں سے دو ٹانگیں کسی مرد کی تھیں اور دو ٹانگیں عورت کی۔ کمرے کے بیچ میں میز پر راجندر کا بریف کیس پڑا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا وہ راجندر اور توشی تھے اور دونوں ایک دوسرے سے چپکے کھڑے تھے۔

آخر کچھ دیر بعد وہ کونے سے ہٹ کر بیچ میں آ گئے۔ میں نے سوراخ سے آنکھ ہٹا کر اپنا کان لگا دیا۔

○

"تم آخر اس شخص سنیل سے خوف زدہ کیوں ہو؟" راجندر کی آواز سنائی دی۔

"آج وہ مجھ سے ملنے آیا تھا اور اس نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔" یہ توشی کی آواز تھی۔

"قتل ـــ" راجندر نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ "وہ مچھر تمہیں کیا قتل کرے گا ـــ تم چاہو تو میں اُسے اس شہر سے بھگا سکتا ہوں۔"

"تم جانتے ہو میرے مرنے کے بعد ساری جائداد اس کو مل سکتی ہے۔"

"ہاں ـــ کیا تم اسی لئے اُس سے خوفزدہ ہو؟"

اب چونکہ وہ کمرے کے بیچ میں آ گئے تھے اس لئے ان کا ہر ا جسم میں دیکھ سکتا تھا۔ راجندر نے ابھی تک اس کو آغوش میں لے رکھا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کو پیار بھی کرتے جا رہے تھے۔

"میں صرف سنیل سے ہی خوف زدہ نہیں ہوں راجندر۔"

"کسی اور سے بھی تمہیں خوف ہے؟"

"ہاں، اسی لئے آج میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔ آج میں ن بھر تمہارے ٹھکانوں پر فون کرتی رہی ہوں۔ لیکن تم ..."

"مجھے تمہارا پیغام مل گیا تھا۔ اسی لئے آیا ہوں۔ دسرا شخص کون ہے جس سے تم خوفزدہ ہو؟"

"کیا تم میری مدد کرو گے راجندر ڈیئر؟"

"تم جانتی ہو ـــ میں تمہارے لئے قتل بھی کر سکتا ہوں۔ یہ تم ہی ہو جو مجھ سے دور دور رہتی ہو۔"

"یہ بات نہیں، دراصل میں واقعی خوف زدہ ہوں۔ لئے میں تم سے بچی بچی رہتی تھی۔"

"کس سے خوف زدہ ہو مجھے بتاؤ۔"

توشی نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا

"نئے دھندے سے تم کتنا کما لیتے ہو؟"

"یہی دو تین سو روپے روزانہ۔"

"تمہیں معلوم ہے میرے پاس کتنی بڑی جائداد ہے اور کتنا بڑا کاروبار ہے۔"

"ہاں۔"

"ہم دونوں پوری زندگی اس جائداد اور کاروبار کے سہارے عیش سے گزار سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"تمہیں ایک قتل کرنا ہو گا۔"

"قتل ـــ!" راجندر کی آواز میں حیرت تھی "کس کا؟"

"پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم میرے لئے۔ اور شاندار مستقبل کے لئے کسی کو قتل کر سکتے ہو؟"

"یقیناً کر سکتا ہوں۔"

"تو تمہیں مدن کو قتل کرنا ہو گا!"

"اوہ ـــ" راجندر اس کو چھوڑ کر ایک قدم پیچھے اس طرح ہٹا جیسے توشی نے اس کے طمانچہ مار دیا ہو۔ "میں سمجھتا تھا تم مدن سے محبت کرتی ہو اسی لئے تم نے اپنا سارا کاروبار اس کو سونپ رکھا ہے۔"

"یہ بات نہیں ڈارلنگ۔ میں مدن سے نفرت کرتی ہوں۔"

"پھر تم نے اس کو کلب کا منیجر کیوں بنایا؟"

"اس لئے کہ میں مجبور تھی۔ تم اس کو قتل کر دو گے تو میں کلب کا منیجر تمہیں بنا دوں گی اور ہم پھر آزادی سے مل سکیں گے۔ جانتے ہو کلب سے کتنی آمدنی ہے؟"

"مگر مدن کو قتل کرنا مشکل ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ گارگی اور بارڈی دونوں ہر وقت اس کے باڈی گارڈ کی طرح ساتھ رہتے ہیں۔"

"اگر میں کسی طرح گارگی کو اس کے پاس سے کچھ دیر کے لئے ہٹا دوں تو۔"

"تو شاید ممکن ہے۔ مگر تم گارگی کو کیسے ہٹا سکتی ہو؟"

"اوہ یہ کچھ مشکل نہیں۔ وہ جب یہاں آتا ہے مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ میرے ذرا سے اشارے پر کتے کی طرح دم ہلاتا چلا آئے گا۔"

"لیکن اتفاق سے میں پکڑا گیا۔" راجندر نے سوچ کر کہا۔ "یہ پولیس ان کی مٹھی میں ہے۔ پولیس مجھے کبھی نہیں چھوڑے گی۔"

"ان کے مرنے کے بعد پولیس کو جب یہ معلوم ہو گا کہ کلب کے منیجر تم ہو تو پولیس تمہاری غلام ہو جائے گی۔ پولیس

روپے کی غلام ہے۔ مدن کی نہیں۔ وعدہ کرو کہ تم اس کو قتل کر دو گے۔"

"قتل تو میں کر دوں گا۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیا؟"

"تم اسے قتل ہی کیوں کرانا چاہتی ہو۔ کلب سے الگ کیوں نہیں کر دیتیں۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔ مجبور ہوں۔"

"کیا وہ تمہیں بلیک کرتا ہے؟

"ہاں۔"

"کس بات پر؟"

"یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گی۔ تم اسے قتل کر دو گے تو سب کچھ بتا دوں گی۔ دو سال سے میں کانٹوں پر زندگی بسر کر رہی ہوں۔ ہر وقت ایک نامعلوم خوف ذہن پر چھایا رہتا ہے۔ وعدہ کرو تم اسے قتل کر دو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"تم نے اس کے دفتر کا کمرہ دیکھا ہے؟" توشی نے سوال کیا۔

"ہاں۔"

"اس میں ایک تجوری ہے۔ جب اسے قتل کر دو تو اس تجوری کو کھولنا۔ اس میں میرے نام کا ایک لفافہ رکھا ہے وہ لفافہ بند کا بند مجھے لا کر دے دو گے۔"

"اس لفافے میں تمہارا کوئی راز ہے؟" راجندر نے پوچھا۔

"ہاں۔ وعدہ کرو کہ تم اس لفافے کو کھولو گے نہیں تم میرے وفادار رہو گے تو زندگی بھر عیش کرو گے راجندر۔"

"او کے ڈارلنگ میں ۔۔۔۔"

الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے۔ میری آنکھ اس وقت سوراخ سے لگی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ دہشت سے راجندر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر مجھے پانچ چھ ٹانگیں ایک ساتھ نظر آئیں۔

جس کمرے میں وہ دونوں کھڑے تھے اس کے دو دروازے تھے، ایک دروازہ تھا جس سے میں جھانک رہا تھا۔ دوسرا دروازہ داہنی جانب دیوار میں تھا۔

اچانک وہ دروازہ کھلا تھا اور اس سے تین آدمی اندر داخل ہوئے تھے جن کو دیکھ کر راجندر خوفزدہ ہوا تھا۔

وہ تینوں آگے بڑھے تو مجھے اُن کے چہرے نظر آئے

ان کو دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ مدن، ہارڈی اور رنگارگی تھے۔

مدان دو قدم آگے بڑھ کر رک گیا اور کولھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"احمق عورت تو اس کتے کے پلّے سے مجھے قتل کرانا چاہتی ہے۔"

اُس کا یہ جملہ سن کر مجھے بھی سخت حیرت ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ مدن نے ان کی گفتگو سنی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ بھی دروازے کے پیچھے چھپ کر ان کی باتیں سن رہا تھا اس نے کمرے کے ہر کونے میں مائیک چھپا رکھے تھے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ وہ اچانک وہاں کیسے پہنچ گیا۔

پھر فوراً ہی مجھے خیال آیا۔ میں نے ہارڈی کو گاڑی ڈرائیو کرتے دیکھا تھا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر میری نظر نہیں گئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر اندھیرا تھا اس لیے ممکن تھا کہ مدن اور رنگارگی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوں اور ہو سکتا تھا کہ مدن توشی کے ساتھ رات گزارنے آ رہا ہو۔ اگر وہ توشی کو بلیک میل کر سکتا تھا تو اس کو اپنے ساتھ سونے پر بھی مجبور کر سکتا تھا۔

یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس کے پاس باہر کے دروازے کی چابی ہوگی۔ وہ اندر داخل ہوا تو اسے پتا چلا کہ توشی کے ساتھ راجندر ہے۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سننے لگا۔

راجندر کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"باس! میں نے اس عورت کی بات پر کبھی بھروسہ نہیں کیا۔ میں تو اس کو باتوں میں لگا کر اس کا راز معلوم کر رہا تھا، تاکہ تمہیں بتا دوں۔"

"میں تمہاری فطرت کو جانتا ہوں راجندر۔"

"میں قسم کھاتا ہوں باس۔ میں ۔۔۔"

"قسم کھانے کی ضرورت نہیں راجندر۔ ویسے بھی تمہارا وجود اب میرے لئے خطرہ بنتا جا رہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں غنڈوں سے کہا۔

"اس کی تلاشی لو اور ان کو بوٹ ہاؤس میں لے چلو۔"

اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ راجندر کو قتل کرانا چاہتا ہے۔ میرا اب وہاں رہنا خطرناک تھا اس لئے میں چپکے سے باہر آ گیا اور تیزی سے ایک طرف چل دیا۔

○

بلو نائٹ کلب میں پولیس سب انسپکٹر نے جس طرح کا برتاؤ کیا تھا اس سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ پورا پولیس کا عملہ رشوت خور بن چکا ہے اور مدن کا غلام ہے۔ اس لئے کسی پولیس

افسر سے مدد کی توقع رکھنا بے کار تھا۔ یہ مجھے یقین تھا کہ مدن
راجندر کو قتل کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کیونکہ راجندر
جانتا تھا کہ پستول اس نے کس کو دیا تھا جس سے للت مہتہ کو
قتل کیا گیا تھا۔ اور توشی راجندر کے ذریعے مدن کو قتل کرانا
چاہتی تھی۔ مدن بے وقوف نہیں تھا جو وہ راجندر کی باتوں
میں آجاتا۔ وہ جانتا تھا کہ موقع ملتے ہی راجندر اس کو قتل کرنے
سے نہیں چوکے گا، اس لئے راجندر کو ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا
دینا ہی اس کے حق میں بہتر تھا، لیکن میں اس قتل کو روکنا چاہتا تھا۔
اچانک میرے ذہن میں اس بوڑھے کا خیال آیا جس کو میں
نے دو غنڈوں سے بچایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس پورے شہر
میں اگر کوئی ایمان دار شخص ہے تو وہ ہے میئر راہل کٹاریہ ہے۔
رات کے دو بج رہے تھے جب میں نے میئر کے
دروازے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ تین چار بار گھنٹی بجانے کے
بعد دروازہ کھلا۔ تیس پینتیس سال کے ایک شخص نے دروازہ
کھولا۔

"کہیئے ۔۔۔ اس نے کسی قدر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"مجھے مسٹر راہل سے ملنا ہے۔"
"رات کے اس وقت؟"
میئر شہر کا مالک ہوتا ہے۔ شہر اور شہر میں بسنے والے لوگوں
کی سلامتی اور ان کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہوتا ہے، اس لئے ہر
شہری کو جو کسی تکلیف میں ہو دن رات کے کسی حصے میں بھی
جگانے کا حق حاصل ہے۔"
میری بات سے وہ کچھ مرعوب ہو گیا اور بولا۔
"اندر آجائیے۔"
میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں گیا۔ اس نے مجھے
صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔
"میرا ہی نام راہل کٹاریہ ہے۔ میرا خیال ہے میئر بھی انسان
ہوتا ہے اور اسے بھی آرام کرنے کا حق ہوتا ہے۔ لیکن اب آپ
آ گئے ہیں تو بتائیے۔ آپ کس تکلیف میں مبتلا ہیں؟"
"مجھے تکلیف یہ ہے کہ میں ایک قتل روکنا چاہتا ہوں۔"
"قتل ۔۔۔ کس کا قتل؟" اس نے چونک کر کہا۔
آپ بلو نائٹ کلب کے منیجر مدن کو جانتے ہیں؟"
"میں نے محسوس کیا کہ راہل کے چہرے پر ایک رنگ آکر
گزر گیا۔
"ہاں۔ میں نے اس کا نام سنا ہے۔"
"آپ اس شہر کے میئر ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے
شہر کی ساری پولیس مدن کی مٹھی میں ہے۔"
"پولیس کے محکمے سے میرا کیا تعلق ہے؟"
سٹی میئر کا ہر محکمے سے تعلق ہوتا ہے۔ بہرحال اس وقت
میں لمبی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔۔ میری معلومات کے مطابق
مدن ایک شخص کو قتل کرنے کے لئے لے گیا ہے۔"
"تو آپ کو پولیس اسٹیشن جانا چاہیئے تھا۔"
"پولیس اسٹیشن میرا جانا بے کار تھا۔ پولیس انسپکٹر
مدن کے خلاف کچھ نہیں کرے گا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ فوراً
سپرنٹنڈنٹ پولیس یا کسی دوسرے بڑے افسر سے مل کر مدن کو
روکنے کی کوشش کریں۔"
"آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ مدن کسی کو قتل کرنے کیلئے گیا
ہے؟" "یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں پھر کسی وقت بتاؤں گا۔"
"آپ کون ہیں ۔۔۔ اور مجھے کیا پتہ ہے کہ آپ سچ
بول رہے ہیں یا نہیں۔"
واقعی یہ سوال مشکل تھا۔ وہ بغیر مجھے جانے میری بات
پر کیسے اعتبار کر سکتا تھا اور ابھی میں اپنی اصل شخصیت ظاہر
نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔
"میرا نام سنیل مہتہ ہے۔ میں مرحوم للت مہتہ کا بھائی
ہوں۔"
"اوہ تم سنیل ہو؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "میں نے
للت مہتہ سے کئی بار تمہارے بارے میں سنا تھا۔ تم مورگڑھ کب
آئے؟"
"کل ہی آیا ہوں۔ پلیز مسٹر راہل یہ باتوں کا وقت نہیں
کچھ کیجیئے۔"
"کیا کروں۔ مجھے کیا معلوم کہ مدن کہاں ہے۔ آخر وہ
کس کو قتل کرنا چاہتا ہے۔"
"یہاں کوئی بوٹ ہاؤس ہے؟" میں نے سوال کیا۔
"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں
جما کر کہا۔ "جھیل کے کنارے ایک ہی عمارت ہے جو بوٹ ہاؤس
کہلاتی ہے۔ اور تمہارے بھائی اس کے مالک تھے۔"
"اس کا اعتراض درست تھا۔ میں نے جلدی سے بات
بنانے کے لئے کہا۔
"میں بیس سال بعد مورگڑھ آیا ہوں۔"
"کیا تمہیں یقین ہے کہ مدن بوٹ ہاؤس میں کسی کو
قتل کرنے کے لئے گیا ہے؟"
"ہاں۔"
"کس کو؟"
"ایک شخص جس کا نام راجندر ہے۔"

"راجندر کا نام سن کر وہ پھر چونکا۔ اس نے کہا۔
"راجندر — یہ راجندر کون ہے؟"
یہ شخص دلالی سے بیکر افیم، چرس تک کا کاروبار کرتا ہے۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ مدن سے دشمنی ہے، کیونکہ اس نے سارے شہر کو جہنم بنا رکھا۔ وقت کم ہے اگر آپ مدن کے بارے میں جانتے ہیں تو اس کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرانے کا سنہری موقع ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ براہ راست کسی بڑے پولیس افسر سے بات کریں۔ میں بوٹ ہاؤس جاتا ہوں اگر وہ لوگ وہاں ہیں تو میں آپ کو فون کر دوں گا آپ پولیس کو لیکر وہاں پہنچ جائیں۔"
مجھے بوٹ ہاؤس کا پتہ چل چکا تھا۔ اب وہاں رہ کر وقت ضائع کرنا بے کار تھا اس لئے میں راہل سے رخصت ہو کر چل دیا۔
چند منٹ انتظار کے بعد ایک ٹیکسی مل گئی۔ پندرہ منٹ میں اس نے جھیل کے کنارے بوٹ ہاؤس سے کچھ فاصلے پر مجھے چھوڑ دیا۔
بوٹ ہاؤس میں روشنی تھی۔ جھیل شہر سے باہر تھی، اس لئے ہر طرف سناٹا تھا۔ میں دبے قدموں سے چلتا ہوا بوٹ ہاؤس تک پہنچا اور ایک کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ یہ کمرہ خالی تھا برابر میں ہی ایک پائپ اوپر چھت تک چلا گیا تھا۔ جوتے نیچے اُتار کر میں پائپ کے ذریعے اوپر چھت پر پہنچ گیا۔ چھت پر کئی روشن دان بنے ہوئے تھے۔ میں نے ایک روشن دان سے جھانک کر دیکھا۔ اس کمرے میں سب موجود تھے منظر کافی دلچسپ تھا۔
اندر کمرے میں ایک کرسی پر راجندر بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی جانب کر کے کارگی نے پکڑ رکھے تھے۔ ہارڈی ایک طرف کھڑا تھا۔ توشی ایک اسٹول پر راجندر کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔
"چاقو لاؤ —" مدن نے اچانک کہا
ہارڈی نے فوراً ایک چاقو اس کو دے دیا۔ مدن نے چاقو کھول کر اس کی دھار دیکھی۔ پھر توشی سے بولا۔
"تم اپنے ہاتھوں سے اس کو قتل کرو گی۔"
"میں تیرا گلا کاٹ سکتی ہوں۔" توشی نے غصے سے کہا۔
یہ بعد کی بات ہے۔ اٹھو ورنہ میں تمہارا بھی یہی حشر کروں گا، جو اس کا ہوا ہے۔"
ارے جا کتے —" توشی نے پھر حقارت سے کہا۔
"اسے ننگا کر دو۔" اس نے ہارڈی کو حکم دیا۔
"توشی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور بڑھ گئی۔
"بول تو میرا حکم مانتی ہے......؟"
"آل رائٹ۔" توشی نے کہا۔ "لاؤ چاقو مجھے دو۔"
وہ اٹھ کر راجندر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ مدن نے چاقو اس کو دے دیا۔ توشی نے چاقو لیکر ایک بار اس کی دھار دیکھی۔ پھر اس کا ہاتھ اٹھا — لیکن راجندر پر حملہ کرنے کی بجائے اچانک وہ گھومی۔ چاقو والا ہاتھ نیچے آ کر مدن کے گال میں گھس گیا۔ مدن کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

O

نیچے کمرے میں ایک لمحے کے لئے سناٹا سا چھا گیا تھا پھر اچانک ہارڈی اچھلا اور اس نے توشی کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا۔ مدن ایک منٹ تک زمین پر چلاتا رہا۔ پھر ہانپتا ہوا اٹھا۔ اس کے گال سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ اس نے ہارڈی کے ہاتھ سے چاقو لے لیا۔ توشی پر جیسے سکتہ کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ مدن نے اس کے چہرے پر وحشیانہ انداز میں چاقو مارنے شروع کر دیئے۔ توشی نیچے گر پڑی تو اس نے بیٹھ کر اس کے جسم پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ تین چیخیں مار کر توشی کا جسم ساکت ہو گیا لیکن وہ پاگلوں کی طرح چاقو مارتا رہا۔
ایک بار میرا جی چاہا کہ اس کو روکنے کی کوشش کروں لیکن پھر میں نے خود کو روک لیا۔ وہ سب قاتل اور جرائم پیشہ تھے۔ اچھا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو ختم کر رہے تھے لیکن مدن کو گرفتار کرانے کا سنہری موقع تھا، اس لئے میں پائپ کے ذریعے ہی اُتر کر تیزی سے شہر کی طرف بھاگا۔ اس وقت کسی سواری کا ملنا دشوار تھا۔ لیکن اتفاق سے ایک کار گزری کار کا مالک شریف آدمی تھا۔ اس نے مجھے بستی میں چھوڑ دیا۔
میں نے ایک پبلک فون سے مہر کا نمبر ملایا۔ بہت دیر گھنٹی بجنے کے بعد ایک نسوانی آواز نے کہا۔
"کون ہے؟" آواز نیند سے بوجھل تھی۔
"میں مسٹر راہل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"وہ تو ہیں نہیں۔"
"کہاں گئے؟"
"پتہ نہیں۔"
میں سمجھ گیا کہ راہل کسی پولیس افسر سے ملنے گیا ہوگا۔ اس لئے میں نے کہا
"وہ جیسے ہی آئیں اُن سے کہہ دینا کہ وہ پولیس لے کر

فوراً بوٹ ہاؤس پہنچ جائیں۔ پلیز یہ بہت ضروری ہے۔"
یہ کہہ کر میں نے جواب کا انتظار کئے بغیر فون رکھ دیا۔
اور ایک بار پھر بوٹ ہاؤس کی طرف چل دیا۔

اس بار مجھے پہنچنے میں چالیس منٹ کے قریب لگے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا مکمل سناٹا تھا۔ بوٹ ہاؤس کے صرف ایک کمرے میں روشنی تھی۔ مدن کی کار جو گیٹ پر کھڑی تھی وہ غائب تھی۔

میں ایک درخت کے پیچھے کھڑا سوچ رہا تھا اب مجھے کیا کرنا چاہیئے کہ اندر سے ایک آدمی باہر آتا نظر آیا۔ اس کے قد سے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ گارگی تھا۔ آسمان پر ساتویں آٹھویں تاریخ کا چاند تھا جس کی روشنی میں اس کو پہچاننا آسان تھا۔ گارگی کے کاندھے پر ایک پھاوڑا تھا۔ باہر آ کر ایک جگہ وہ زمین کھودنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ توشی یا راجندر کے لئے یا دونوں کے لئے قبر کھود رہا ہے۔ مدن شاید اپنے زخم کی مرہم پٹی کرانے چلا گیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا گارگی کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں جھاڑیاں اور درخت کافی تھے۔ اس لئے خود کو چھپانا آسان تھا۔ گارگی اپنے کام میں مصروف تھا۔ جب دو تین گز کا فاصلہ رہ گیا تو میں نے ایک پتھر اٹھایا اور نشانہ باندھ کر پوری قوت سے اس کے سر پر مارا

اتفاق سے نشانہ صحیح بیٹھ گیا۔ اگر اس کے پتھر نہ لگتا تو وہ ضرور یہ دیکھنے کے لئے جھاڑیوں کے قریب آتا کہ پتھر کس نے پھینکا ہے۔ اس وقت میں اس پر قابو پانے کی کوشش کرتا۔ پتھر پوری قوت سے لگا تھا، اس لئے وہ منہ کے بل زمین پر جا پڑا۔ میں اچھل کر باہر نکلا اور میں نے اس کے قریب پہنچ کر بوٹ کی ٹھوکر اس کی کنپٹی پر ماری۔ وہ بے ہوش ہو گیا تو میں نے اس کا پستول اپنے قبضہ میں کر لیا اور دبے قدموں سے عمارت کی طرف چل دیا۔

پستول ہاتھ میں لئے آہستہ سے دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہو گیا اور اندر سے اس کمرے کی طرف بڑھا جس میں کچھ دیر پہلے یہ ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔

ایک کمرے اور ایک چھوٹے سے صحن سے گزر کر وہ کمرہ آ گیا۔ اس میں ابھی تک روشنی تھی۔ میں نے پہلے کوئی آہٹ سننے کی کوشش کی۔ جب کوئی آواز سنائی نہ دی تو میں اندر داخل ہوا۔

اندر کا منظر دیکھ کر مجھے متلی سی ہونے لگی۔ سارے کمرے میں خون کے چھینٹے تھے۔ ایک طرف راجندر کی ننگی لاش پڑی تھی۔ اس کے ماتھے میں گولی کا سوراخ تھا۔ قریب ہی توشی کی لاش پڑی تھی۔ اس کے جسم اور چہرے پر بیشمار زخموں کے نشان تھے جن سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔

اچانک مجھے توشی کے سینے میں حرکت سی محسوس ہوئی۔ میں جلدی سے بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ اس کا جسم گرم تھا اور واقعی وہ ابھی زندہ تھی، لیکن وہ کچھ دیر کی ہی مہمان تھی۔

اسی وقت ایک آواز نے کہا۔

"اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو پستول نیچے ڈال اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔"

آواز ہارڈی کی تھی۔ میں نے ذرا سا سر گھما کر دیکھا۔۔۔ وہ دروازے میں کھڑا تھا اور اس نے پستول سے مجھے نشانہ بنا رکھا تھا۔ مجھے اپنے اوپر سخت غصہ آیا۔ پہلے مجھے سارے مکان کی تلاشی لے کر اپنا اطمینان کر لینا چاہئے تھا۔ لیکن میں مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا بہت جلد راحل پولیس کو لیکر پہنچنے والا ہو گا۔

میں نے پستول نیچے ڈال دیا اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ ہارڈی نے جلدی سے پستول اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ کر کہا۔

"تم یہاں کیسے پہنچے؟"

"پیدل" میں نے جواب دیا۔

"باس نے تم پر رحم کھا کر تمہیں باہر پھنکوا دیا تھا۔ اگر تم سمجھدار ہوتے تو واپس نہ آتے۔ اب تم واپس نہیں جا سکو گے۔"

جواب میں میں صرف شانوں کو اچکا کر رہ گیا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں گارگی کو دیکھ چکا ہوں۔ چلو تم باہر چلو اور گارگی کو اٹھا کر اندر لاؤ۔ تم نے اس کا سر پھاڑ دیا ہے۔"

میں مجبور تھا اس لئے باہر کی طرف چل دیا۔ وہ پستول لئے میرے پیچھے تھا۔ گارگی اسی طرح بے ہوش پڑا تھا۔ اس کو اٹھانے کے لئے جب جھکا تو میں نے دیکھا اس کے سر کا پچھلا حصہ کافی زخمی تھا جس سے خون رس رہا تھا۔ پتھر کافی زور سے لگا تھا۔ میں نے بمشکل اس کا وزنی جسم اٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور پھر واپس مکان میں آ گیا۔ ہارڈی نے ایک کمرے میں پلنگ پر گارگی کو لٹوا دیا۔ پھر مجھ سے بولا۔

"گارگی زخمی ہے۔ وہ قبر نہیں کھود سکتا اس لئے تم چل کر یہ کام کرو۔ میں تمہیں قتل کر دینا چاہتا ہوں، لیکن اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ شاید باس تم سے کوئی کام لینا چاہے۔ دوسرے قبر کھودنا بھی ضروری ہے۔ جب تک قبر تیار ہو گی باس آ جائے گا۔"

میں نے اس کو باتوں میں لگانے کی غرض سے کہا۔
"نوشی ابھی زندہ ہے!"
"مجھے معلوم ہے۔ باس ڈاکٹر پیکو کو لینے گیا ہے۔ باس ابھی اس عورت کو قتل کرنا نہیں چاہتا تھا، لیکن زخمی ہونے سے اس کو غصہ آ گیا تھا۔"
"کیا ڈاکٹر یہ نہیں پوچھے گا کہ نوشی کو کیا ہوا ہے؟"
"اس کی کیا جرأت ہے۔ وہ باس کا غلام ہے۔ اسکی پریکٹس کا لائسنس ضبط ہو چکا ہے، کیونکہ اس نے ایک حاملہ لڑکی کا آپریشن کر کے اس کو مار دیا تھا۔ باس نے اس کو اسی طرح کی ایمرجنسی کے لئے پال رکھا ہے۔ چلو تم اب باہر چل کر قبر کھودو — مجھے باتوں میں لگا کر وقت ضائع مت کرو!"
مجبوراً میں باہر آ کر قبر کھودنے لگا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ پھاوڑا ابھر کر مٹی اس پر ڈال دوں۔ لیکن وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر تھا کہ میں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔
صبح ہونے کے قریب تھی کہ قبر تیار ہو گئی۔ ساتھ ہی مدن کی گاڑی آ کر دروازے کے سامنے رک گئی۔ میں نے دو آدمیوں کو مکان کے اندر جاتے دیکھا۔
میں سمجھ گیا کہ مدن ڈاکٹر پیکو لے کر آیا تھا۔
چند منٹ بعد ہی اندر سے مدن کی آواز سنائی دی۔
"ہارڈی — ہارڈی۔ تم کہاں ہو؟"
"آیا باس — ہارڈی نے بھی بلند آواز سے جواب دیا۔ پھر مجھے پستول دکھاتے ہوئے بولا۔
"چلو اندر چلو۔ اب باس تمہاری قسمت کا فیصلہ کریگا۔"
میں اندر کی طرف چل دیا۔

مدن کوریڈور میں ہی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر حیرت سے بولا۔
"یہ کہاں سے آ گیا؟"
"پتہ نہیں کہاں سے آ ٹپکا۔ ہارڈی نے جواب دیا۔" اس نے گارگی کو بے ہوش کر دیا تھا۔ میں نے اس کو قبر کھودنے کے کام پر لگا دیا۔ اب جو آپ اس کا کرنا چاہیں۔"
مدن نے کچھ سوچ کر کہا۔
"ڈاکٹر پیکو کہتا ہے کہ نوشی مر چکی ہے۔ اچھا ہوا کہ یہ آ گیا۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی ہے۔"
یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اس نے میرے بالوں کی لٹ پکڑ کر جھٹکا دیا۔ بال اس کے ہاتھ میں آ گئے۔ پھر اس نے میرے کوٹ کا ایک بٹن کھینچ کر توڑ لیا اور دونوں چیزیں لفافے میں بند کر کے جیب میں رکھ لیں۔ میری جیب کی تلاشی لینے پر اس کو وہ چاقو مل گیا جو میں نے راجندر سے چھینا تھا۔ اس نے وہ چاقو بھی اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ نوشی کے قتل کا الزام میرے سر لگانا چاہتا ہے۔ اور ثبوت کے بطور یہ چیزیں لاش کے پاس چھوڑنا چاہتا ہے۔
قبر تیار ہے؟" اس نے ہارڈی سے پوچھا۔
"ہاں —"
"تو اس میں راجندر کی لاش ڈلوا دو۔"
ہارڈی نے پھر میری کمر میں پستول کی نال لگا کر کہا۔
"چلو۔ آگے بڑھو!"
مجبوراً مجھے اس کے حکم مطابق راجندر کی لاش قبر تک ....لے جانا پڑی۔ پھر اس کو قبر میں ڈال کر زمین ہموار کرنی پڑی۔ میں اب بڑی طرح تھک چکا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں تھکا ہارا ہارڈی کے ساتھ مکان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ نوشی کی لاش وہاں نہیں ہے۔ مدن نے کہا۔
"میں جا رہا ہوں۔ تم اس کی نگرانی رکھو۔ نوشی کی لاش اس کے بیڈ روم میں رکھ کر واپس آؤں گا۔ اتنے تم اس کو یہاں سنبھالے رہو!"
"بہت اچھا باس!" ہارڈی نے جواب دیا۔
مدن چلا گیا تو وہ مجھے ایک اندرونی کمرے میں لے آیا۔ میں ایک کونے میں دیوار سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ کافی فاصلے پر کرسی لے کر بیٹھ گیا۔
میں نے دیوار سے کمر لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر بعد ہی خراٹے لینے لگا۔
دس پندرہ منٹ میں نے کرسی کے چرچر کرنے کی آواز سنی۔ پھر قدموں کی چاپ۔ میں سمجھ گیا کہ ہارڈی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ رہا ہے۔ وہ شاید اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ میں واقعی سو چکا ہوں یا بہانہ کر رہا ہوں۔
قدموں کی چاپ میرے قریب آ کر رک گئی۔ یہی میں چاہتا بھی تھا۔ میں نے اچانک آنکھیں کھول دیں اور اس سے پہلے کہ ہارڈی کچھ کر سکتا، اپنی دونوں ٹانگیں اس کے پیٹ میں ماریں۔ وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھا، اس لئے پیچھے کی جانب گر پڑا۔ میں فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پستول اس کی مٹھی میں تھا، اس نے ہاتھ اٹھانا چاہا۔ میں نے پھرتی سے اپنا پاؤں اس کی کلائی پر پوری قوت سے مارا۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز سنائی دی — ساتھ ہی ہارڈی کے منہ سے چیخ نکلی۔ میں نے اس کا پستول چھین کر دستہ اس کے سر پر مارا — وہ بیہوش

ہو گیا۔

اب صبح ہو چکی تھی۔ پولیس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا راہل کو میرا پیغام نہیں ملا تھا یا پولیس افسر اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔

میں اگرچہ بے حد تھک چکا تھا لیکن مدن کے اور اس کے غنڈوں کے بارے میں کچھ کرنا ضروری تھا، اس لئے میں دوبارہ میئر کی کوٹھی پر پہنچا۔

گھنٹی بجانے پر ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا جو لباس سے ملازمہ معلوم ہوتی تھی۔ میں نے کہا

"مسٹر راہل ہیں؟"

"ہاں ابھی آدھا گھنٹہ ہوا ہے، آئے ہیں، اس لئے مل نہیں سکتے۔"

"وہ مجھ سے ضرور ملیں گے، ان سے کہنا سنیل جھنہ آیا ہے۔"

ملازمہ چلی گئی۔ دو منٹ بعد اس نے واپس آکر کہا۔

"میرے ساتھ آیئے۔"

میں اندر گیا۔ ملازمہ مجھے سیدھی راہل کی خواب گاہ میں لے گئی۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"کیا آپ کو میرا پیغام نہیں ملا؟"

"نہیں تو۔ میں ابھی ابھی آیا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"میں پولیس سپرنٹنڈنٹ سے ملنے گیا تھا۔ وہ اپنے مکان پر نہیں تھا۔ میں ہیڈ کوارٹر گیا، وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ صبح تک میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ نہ آیا تو میں واپس آ گیا۔"

"آپ عجیب میئر ہیں۔" میں نے غصے سے کہا۔ "میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ مدن راجندر کو قتل کرنے لے گیا ہے۔ اگر سپرنٹنڈنٹ نہیں تھا تو آپ پولیس انسپکٹر کو لے کر وہاں پہنچتے۔"

"میں تمہارے پیغام کا منتظر تھا۔ میں نے گھر پر ایک بار فون بھی کیا تھا کہ شاید تمہارا کوئی پیغام آیا ہو، لیکن میری بیوی گہری نیند سو رہی تھی، اس نے فون ہی نہیں اٹھایا۔ اب تم مجھے بتاؤ وہاں کیا ہوا؟ کیا واقعی کوئی قتل ہو گیا ہے؟"

"ایک نہیں دو۔ مدن نے راجندر اور توشی دونوں کو قتل کر دیا ہے۔"

"کیا واقعی!" وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔

"آپ خود جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ مدن وہاں سے توشی کی لاش لیکر چلا گیا ہے۔ لیکن راجندر کو انہوں نے عمارت کے اندر دبا دیا ہے۔ اس کے دونوں غنڈے بوٹ ہاؤس میں بے ہوش پڑے ہیں۔"

"بے ہوش کیوں؟"

"میں ان کو بے ہوش کر کے آیا ہوں۔ اب بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ آپ فوراً پولیس کو لے کر بوٹ ہاؤس پہنچ جائیں۔ راجندر کی لاش وہاں مل جائے گی اور اس کے دونوں غنڈے اپنی جان بچانے کے لئے سچ بولنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس طرح آپ مدن کو گرفتار کر سکیں گے۔"

"او کے۔ میں ابھی جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور لباس تبدیل کرتے ہوئے بولا۔ "اگر مدن گرفتار ہو گیا تو میں یقیناً تمہارا شکر گزار رہوں گا مسٹر سنیل۔ اس شخص نے واقعی پورے شہر کو جہنم بنا دیا ہے۔ شہر کی پوری دولت مند سوسائٹی اس کی مٹھی میں آ چکی ہے۔ کیونکہ وہ جوا کھلاتا ہے لڑکیاں سپلائی کرتا ہے۔ پولیس والے بھی اس کے قابو میں ہیں۔ میں اکیلا ان سب کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔"

"بہرحال اگر آپ شہر کو شیطانوں سے صاف کرنا چاہتے ہیں تو یہ بہترین موقع ہے۔"

"او کے۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔"

مجھے خوشی ہوئی کہ شہر میں ایک آدمی تو ایماندار نکلا۔ اس وقت تک میں بہت تھک گیا تھا۔ میرا جسم چور چور ہو چکا تھا، اس لئے واپس اپنے ہوٹل کی طرف چل دیا۔

* * *

ہوٹل پہنچ کر سب سے پہلے میں نے گرم پانی سے غسل کیا۔ پھر ناشتہ کیا اور سو گیا۔ دس بجے فون کی گھنٹی کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو جاوید کی آواز سنائی دی۔

"آپ اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں رات بھر آپ کو فون کرتا رہا۔"

"میں مصروف تھا۔ تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اپنے ہوٹل سے۔ ناشتہ کر کے میں اس خوبصورت بیوہ کی نگرانی کرنے جا رہا تھا۔ میں نے سوچا آپ کو بھی فون کر کے دیکھ لوں۔"

"اب وہاں جانے کی ضرورت نہیں، میں خود وہاں جا رہا ہوں۔ وہ مر چکی ہے۔"

"اوہ۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"سو فی صدی۔ اور شاید اس کے قتل کا الزام مجھ پر لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔"

"پھر تو مبارکباد۔ کیا میں آپ کے ساتھ چلوں؟"

"نہیں۔ تم دن بھر اپنے کمرے میں رہو۔ شاید مجھے تمہاری ضرورت پڑے۔ ضرورت ہوئی تو فون کر دوں گا۔"

"اوکے باس۔"

میں نے فون بند کر کے سیما کے کمرے کا نمبر ملایا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

○

گیارہ بجے میں تیسری بار للت مہتہ کے مکان پر پہنچا۔ باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں سازش کی بو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ سازش کس طرح کی گئی ہے۔ اندر مکان میں بالکل سناٹا تھا۔ میں نے دروازے کے اندر ہی رک کر پکارا۔

"کوئی ہے؟"

کوئی جواب نہ ملا تو آگے بڑھا۔ تیسرا کمرہ خوابگاہ تھا۔ خوابگاہ میں مسہری پر توشی موجود تھی۔ اس کے زخموں سے ...... خون رِسنا بند ہو گیا تھا اور لاش سخت ہونے لگی تھی میں نے آگے بڑھ کر قریب سے دیکھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ میرے بال جو مدن نے اکھاڑے تھے لاش کی مٹھی میں تھے۔ میرے کوٹ کا بٹن مسہری میں پڑا تھا اور وہیں میرے چاقو جیسا دستے والا چاقو پڑا تھا۔ چاقو اس وقت خون آلود تھا اور مجھے یقین تھا اس چاقو پر میری انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔

میں نے لاش کی مٹھی سے بال نکالے۔ اپنا بٹن اٹھایا اور جھک کر چاقو اٹھا ہی رہا تھا کہ ایک آواز نے کہا۔

"تمہیں اس بے دردی سے اپنی بھابی کو قتل نہیں کرنا چاہیے تھا سینل۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے میں سب انسپکٹر پرشاد کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

چال پوری طرح بچھایا گیا تھا۔ مدن کو یقین تھا کہ میں جلد یا بدیر للت مہتہ کے مکان میں ضرور آؤں گا۔

مجھے سازش کی توقع ضرور تھی۔ لیکن یہ امید نہیں تھی کہ پولیس انسپکٹر میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ اس وقت نہ میں گرفتار ہونا چاہتا تھا اور نہ ابھی کسی پولیس افسر پر اپنی شخصیت ظاہر کرنا چاہتا تھا، اس لیے میں نے کہا۔

"اس کو قتل میں نے نہیں کیا ہے۔ مدن نے کیا ہے۔"

"یہ بات عدالت میں کہنا۔ میں نے تمہیں موقعۂ واردات پر پکڑا ہے۔ لاؤ چاقو آہستہ سے میری طرف سرکا دو۔"

میں نے چاقو کا پھل پکڑا اور اس کی جانب ایک قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

"انسپکٹر صاحب میری بے گناہی کا ثبوت یہ ہے کہ میں بخوشی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔ میں چونکہ حق پر ہوں اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ کو جلد یا بدیر میری بے گناہی کا یقین ضرور ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیئے اور کہا۔

"لیجئے آپ مجھے ہتھکڑی پہنا سکتے ہیں۔"

سب انسپکٹر پرشاد بے وقوف تھا۔ وہ میرے چکمے میں آ گیا۔ اس نے پستول جیب میں رکھ کر جیب سے ہتھکڑی نکالی۔ مجھ سے چاقو لے کر ایک طرف رکھا اور جیسے ہی میری کلائیوں میں ہتھکڑی پہنانے کے لئے اس نے ہاتھ بڑھائے میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنا سر اس کے سینے میں مارا وہ فرش پر دھم سے گر پڑا۔ دوسرا وار میں نے جھک کر اس کی شہ رگ پر کیا تھا۔ انسپکٹر وہیں بے ہوش ہو گیا۔ میں نے جلدی سے خون آلود چاقو اٹھایا اور باہر کی طرف چلا آیا۔ میں دروازے پر پہنچا تو اچانک دروازہ کھلا اور دو سپاہی اندر داخل ہوئے میرا دل زور سے اچھلا۔ میں نے فوراً ان سے کہا۔

"اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں تمہیں ہی بلانے جا رہا تھا۔ انسپکٹر پرشاد تم لوگوں کو اندر بلا رہے ہیں۔"

وہ دونوں مجھے گھورتے ہوئے اندر چلے گئے اور میں دروازہ بھول کر باہر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

میری خوش قسمتی سے ایک بس اسی وقت مکان کے سامنے سے گزر رہی اور اچانک سامنے سے ایک گائے آ جانے کی وجہ سے بس کی رفتار سست ہو گئی۔ میں دوڑ کر بس میں چڑھ گیا۔ اسی وقت وہ دونوں سپاہی دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ مجھے بس میں چڑھتے دیکھ کر انہوں نے غل مچایا۔

"پکڑو۔ پکڑوا سے یہ قاتل ہے۔"

"بس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ سڑک پر چلتے لوگ سپاہیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ بس کے لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اگلے اسٹاپ پر میں بس سے اتر گیا اور ایک ٹیکسی لے کر بلو نائٹ کلب کی طرف چل دیا۔

اب مدن سے فیصلہ کن بات کرنے کا وقت آ گیا تھا

○

کلب ابھی بند تھا۔ اس کا مطلب تھا مدن وہاں نہیں تھا۔ یا ممکن ہے راہل اس کو گرفتار کر کے لے گیا ہو۔ میں واپس چلنے لگا تھا کہ مجھے ان کی تجوری کا خیال آیا۔ توشی نے کہا تھا کہ اس کی تجوری میں ایک لفافہ ہے جس پر توشی کا نام لکھا تھا۔ لفافے میں شاید ایسے کاغذات تھے جن سے ... وہ توشی کو بلیک میل کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں اس گلی میں گھس گیا جس میں کلب کا پچھلا دروازہ تھا۔ خوش قسمتی سے گلی سنسان تھی میں چاہتا ہوں

کا گچھا نکال کر تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اگر کوئی آجاتا تو یقیناً مجھے چور سمجھتا۔ ایک منٹ کی کوشش سے آخر دروازہ کھل گیا اور میں اندر داخل ہوا تو دیکھا مدن کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔

میں دبے قدموں سے چلتا ہوا آفس کے دروازے تک پہنچا۔ مدن نے میرے قدموں کی آہٹ سن لی۔ وہ اندر سے بولا

"کون ہے — کیا تم گارگی ہو؟"

میں نے پستول ہاتھ میں لے کر دروازہ ٹھوکر مار کر کھول دیا۔ اور کہا۔

"گارگی نہیں، یہ میں ہوں مسٹر مدن۔"

مدن اس وقت صوفے پر نیم دراز تھا۔ اس کے گال کے زخم پر پٹی چڑھی ہوا تھا اور ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے پستول دکھاتے ہوئے کہا۔

"خاموش بیٹھے رہو ورنہ گولی سے سر میں سوراخ کر دوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں خوف جھانکنے لگا۔ کئی بار اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آواز نہ نکل سکی۔ میں نے کہا۔

"توشی کے قتل کے جرم میں مجھے پھنسانے کی تمہاری سازش بے کار ہو چکی ہے، مگر اب میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم توشی کو کس وجہ سے بلیک میل کر رہے تھے۔"

"تم بچ نہیں سکتے سنیل۔" اس بار اس نے بمشکل کہا۔ "تم اس شہر سے زندہ نہیں جا سکتے۔ تم نے اپنے زندہ جانے کا چانس کھو دیا ہے۔"

میں نے آگے بڑھ کر پستول کا دستہ اس کے زخمی گال پر مارا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ صوفے پر لڑھک کر ہانپنے لگا۔

"تجوری کی چابی لاؤ۔" میں نے اس سے کہا۔

"چابی میرے پاس نہیں ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

میں نے پستول کی نال اس کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں سات تک گنتا ہوں، اگر پورے ہونے تک تم نے چابی نہ دی تو گولی مار دوں گا۔ ایک — دو — تین ..."

"اچھا اچھا چابی دیتا ہوں۔"

"میں خود نکال لوں گا۔ کیا تمہاری جیب میں ہے؟"

اس نے سر ہلا دیا۔ میں نے اس کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال لیا۔ پھر پستول کا دستہ اس کی کنپٹی پر مارا اور وہ بیہوش ہو کر لڑھک گیا۔

اب میں اطمینان سے تجوری کی تلاشی لے سکتا تھا۔

تجوری کا دروازہ کھلتے ہی سامنے کے خانے میں مجھے کئی لفافے رکھے نظر آئے۔ یہ سب لفافے سیل بند تھے۔ ہر لفافے پر ایک نام لکھا تھا۔ ان ہی میں توشی کے نام کا لفافہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ان لفافوں میں شہر کے مختلف لوگوں کے ایسے راز ہوں گے جن سے وہ ان کو بلیک میل کرتا ہوگا۔

ان لفافوں میں ایک لفافہ انسپکٹر پرشاد کے نام کا بھی تھا۔ میں نے توشی کے نام والا لفافہ کھول کر دیکھا۔

اندر ایک تصویر تھی اور شادی کا ایک سرٹیفکیٹ تھا۔ تصویر میں توشی اور مدن برابر کھڑے تھے۔ دونوں کے گلوں میں ہار تھے اور سرٹیفکیٹ سے پتہ چلتا تھا کہ توشی اور مدن برابر کھڑے تھے۔ دونوں کے گلے میں ہار تھے اور سرٹیفکیٹ سے پتہ چلتا تھا کہ توشی اور مدان چار سال پہلے شادی کر چکے تھے اس سے بات صاف ہو جاتی تھی۔ توشی نے چار سال پہلے کسی لالچ یا دباؤ میں مدان سے شادی کر لی تھی۔ لیکن جلد ہی اکتا کر اس کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اتفاق سے اس کی ملاقات للت مہتہ سے ہو گئی۔ وہ خوب صورت جوان تھی۔ اس نے للت مہتہ کو پھانس لیا اور اس کو قتل کر کے للت کی ساری جائیداد کی مالک بن گئی۔ مدان کو پتہ چل گیا تو وہ توشی کو بلیک میل کرنے لگا۔ کیونکہ پہلے شوہر سے طلاق لیے بنا وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی۔ یعنی للت مہتہ سے اس کی شادی غیر قانونی تھی۔ اس لیے وہ اس کی جائیداد کی مالک بھی نہیں بن سکتی تھی۔

میں ابھی سرٹیفکیٹ دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے آہٹ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے گھوم کر دیکھا۔ انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ دروازے میں کھڑا تھا۔

"آل رائٹ سنیل — اپنا پستول نیچے ڈال دو۔" اس نے مجھے اپنے پستول سے نشانہ بناتے ہوئے کہا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس بار انسپکٹر قریشی دو مسلح سپاہیوں کے ساتھ تھا۔

وہ چونکہ تین تھے اس لیے میں نے خاموشی سے پستول نیچے ڈال دیا۔

⊗

"میرے مسٹر راہل کہاں ہیں؟" میں نے پہلا سوال کیا۔

"وہ اپنے آفس چلے گئے۔" "میں تمہیں ہارڈی کے قتل کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔"

"ہارڈی کے قتل کے جرم میں —" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیا وہ مرگیا؟"

"جیسے تمہیں معلوم نہیں۔ اس کو تم نے گلا گھونٹ کر مارا

ہے۔ مسٹر راہل مجھے ساتھ لے کر بوٹ ہاؤس گئے تھے، وہاں نہیں ہارڈی کی لاش ملی جب کہ تم نے مسٹر راہل سے یہ کہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔"

"جب میں وہاں سے آیا ہوں تو وہ زندہ تھا۔ کیا وہاں گارگی نہیں تھا؟"

"نہیں"

"کیا تمہیں راجندر کی لاش مل گئی"

"ہاں"

"اس کے باوجود تم مجھے قاتل سمجھتے ہو۔"

"کیا ثبوت ہے کہ تم نے راجندر اور توشی کو قتل نہیں کیا۔ ہم یہاں مسٹر مدن سے کچھ سوالات پوچھنے آئے تو تم ان کی تجوری کھولے کھڑے ہو اور مسٹر مدن بے ہوش ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تم قاتل ہو۔"

میں نے سوچا اب وقت آگیا ہے کہ اپنی شناخت ظاہر کر دی جائے۔ اس لئے میں نے کہا۔

"آل رائٹ آپ مجھے گرفتار کر سکتے ہیں۔"

میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ انسپکٹر قریشی نے مجھے ہتھکڑی پہنادی۔ انسپکٹر نے ایک سپاہی سے کہا

"تم یہیں رہ کر مسٹر مدن کی دیکھ بھال کرو۔ ان کو ہوش آجائے تو تم واپس آجانا اور مسٹر مدن سے کہہ دینا کہ میں ان سے کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

یہ ہدایات دے کر انسپکٹر مجھے ساتھ لے کر چل دیا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ کر میں نے کہا۔

"میں فوراً مسٹر راہل سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں۔" انسپکٹر قریشی نے پوچھا۔

"شاید وہ میری بے گناہی ثابت کر سکیں۔"

"تم احمق ہو وہ اپنی آنکھوں سے ہارڈی کی لاش دیکھ چکے ہیں۔"

"اس کے باوجود میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک قیدی کی حیثیت سے اتنا کم از کم مجھے حق ہے کہ میں شہر کے میئر سے مل سکوں اور اپنی بے گناہی کا ثبوت فراہم کر سکوں۔"

انسپکٹر نے مجھے گھورتے ہوئے ٹیلی فون اپنی جانب سرکایا اور ایک نمبر ملانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا

"ہیلو مسٹر راہل — سنیل آپ سے ملنا چاہتا ہے مجھے معلوم نہیں بات کرا دیتا ہوں۔" اس نے فون میری جانب بڑھا کر کہا۔

"لو بات کرو۔"

میں نے ریسیور لے کر کہا۔ "مسٹر راہل۔"

"یس اسپیکنگ۔ سنیل۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھے بھی دھوکا دینے کی کوشش کی۔"

میں نے دھوکا نہیں دیا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ جب میں بوٹ ہاؤس سے آیا تو ہارڈی اور گارگی دونوں زندہ تھے۔ آپ کو مغالطہ ہو گیا ہے قاتل مدن ہے۔ اس کا ثبوت ہے کہ وہ شہر کے بہت سے لوگوں کو بلیک میل کرتا تھا۔ اس کی تجوری میں شہر کے بڑے بڑے لوگوں اور افسروں کے نام کے لفافے ہیں جن میں آپ کے نام کا بھی ایک لفافہ ہے۔ توشی کے نام کا بھی ایک لفافہ ہے۔ میں نے صرف توشی کا لفافہ دیکھا ہے۔ اس میں موجود سرٹیفکیٹ کی رُو سے توشی نے چار سال پہلے مدن سے شادی کی تھی، اس لئے توشی کی شادی ہیرے بھائی سے ناجائز تھی۔ اس طرح وہ ان کی جائداد کی حق دار نہیں بن سکتی تھی۔ وہ توشی کے ذریعے میری جائداد پر قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن توشی راجندر کے ذریعے اس کو قتل کرانا چاہتی تھی۔ اس لئے مدن نے غصے میں آکر راجندر اور توشی کو قتل کر دیا۔

میں خاموش ہوا تو راہل نے کہا

"کیا کہا تم نے میرے نام کا بھی لفافہ ہے۔"

"یہ آپ کے لئے بہترین موقع ہے۔ قاتل مدن ہے۔ اگر آپ نے اس موقعہ کو ہاتھ سے کھو دیا تو زندگی بھر پچھتائیں گے۔ آپ سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملئے یا آئی جی کو ٹیلی گرام کر کے بلا لیجئے۔ اگر آپ اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں اور اگر آپ واقعی ایمان دار ہیں تو مدن کو گرفتار کرائیے۔ گرفتاری کے بعد وہ زبان کھولنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"اوکے۔ اچھا سنیل میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو لے کر پولیس اسٹیشن آتا ہوں۔"

اس کے بعد میں نے فون رکھ دیا۔ میں نے ریسیور رکھ کر کہا۔ "مسٹر راہل سپرنٹنڈنٹ پولیس کو لے کر یہاں آرہے ہیں"

انسپکٹر قریشی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو ان باتوں سے تم بچ جاؤ گے؟"

"ذرا عقل سے کام لو انسپکٹر قریشی۔ اگر میں ہارڈی کو قتل کرتا تو مسٹر راہل کو بوٹ ہاؤس بھیجتا ہی کیوں؟"

"اس لئے کہ تم مسٹر راہل سے ایک بار پہلے مل کر اپنے اس شک کا اظہار کر چکے تھے کہ مدن، راجندر اور توشی کو قتل کر کے بوٹ ہاؤس لے گیا ہے۔ پھر تم یہ بہانہ کر کے وہاں گئے کہ تم وہاں کے حالات دیکھ کر مسٹر راہل کو فون کرو گے۔ یہ سب تمہاری سازش تھی۔"

آل رائٹ، اگر یہ میری سازش تھی تو تم نے گارگی کو گرفتار

کیوں نہیں کیا۔ وہ بھی وہاں موجود تھا۔"

"یہ تم کہتے ہو؟"

"تم گارگی کو گرفتار کر کے پوچھو وہ سچ سچ بتا دے گا۔ وہ وہاں موجود تھا۔"

"آل رائٹ، تم اصرار کرتے ہو تو میں گارگی کو بلواتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک سب انسپکٹر کو بلا کر حکم دیا کہ وہ گارگی کو لے آئے اور مجھے اس نے حوالات میں بھجوا دیا۔

جس وقت انسپکٹر قریشی کو میں نے دیکھا تھا، میں نے سوچ لیا تھا کہ اس بار میں اپنی اصل شخصیت ظاہر کر دوں گا۔ لیکن راستے میں ایک نیا خیال میرے ذہن میں آ گیا۔ میں نے ایک داؤ کھیلا تھا اور اب مجھے اس کے نتیجے کا انتظار تھا۔

* — * — * — *

میں حوالات میں نہ جانے کتنی دیر رہا، کیونکہ تنہائی ہو جانے پر میں پتھر کی بینچ پر لیٹ کر سو گیا۔ آخر ایک سپاہی نے مجھے جگا کر کہا۔

"چلو انسپکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

میں اس کے ساتھ چل دیا۔ انسپکٹر قریشی کے دفتر میں آیا تو دیکھا گارگی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ قاتل ہے — تو شی کو اس نے قتل کیا ہے۔"

"کیا تم اس وقت وہاں موجود تھے جہاں میں نے قتل کیا ہے؟"

میں نے اس سے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"پھر یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے مسٹر مدن نے بتایا تھا۔"

"کیا مدن وہاں تھا؟"

"نہیں۔"

"پھر انہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مسٹر مدن کے معلومات حاصل کرنے کے اپنے ذرائع ہیں۔ اس کی پہونچ بہت دور تک ہے۔"

میں نے انسپکٹر کو مخاطب کر کے کہا۔

"کیا یہ بہتر نہ ہو گا مسٹر مدن کو بلا کر پوچھا جائے کہ انھوں نے قتل کے بارے میں کس سے سنا تھا — اور یہ کہ تو شی کو اگر میں نے قتل کیا ہے تو راجندر کو کس نے قتل کیا؟"

"راجندر کو بھی تم نے قتل کیا ہے؟" گارگی بولا۔

"اور ہارڈی کو؟"

"ہارڈی کو — !" اس بار گارگی کا منہ حیرت سے پھیل گیا۔ "کیا ہارڈی مر گیا؟"

"ہاں — اور اس کی لاش بوٹ ہاؤس سے ملی ہے۔"

"بس تو اسی نے مسٹر مدن کو بتایا ہو گا۔"

میں گارگی کے سامنے جا کھڑا ہوا، اور اس کے چہرے پر نظریں جما کر سوال کیا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے سر میں چوٹ کیسے آئی؟"

"میں گر پڑا تھا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم راجندر کی قبر کھود رہے تھے۔ جب میں نے پتھر تمہارے سر پر مار کر تمہیں بے ہوش کیا بعد میں تمہاری لاش اٹھا کر میں بوٹ ہاؤس میں لے گیا تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں آج بوٹ ہاؤس کی طرف گیا ہی نہیں۔"

اب مسٹر مدن کو بلانا ضروری ہو گیا ہے انسپکٹر۔" میں نے قریشی سے کہا۔

"یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے کہ کس کو بلانا ہے کس کو نہیں تم ایک ملزم ہو۔ مجھے مشورہ یا حکم دینے کا تم کو اختیار نہیں۔"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ مجھے گرفتار ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ جو میں نے داؤ کھیلا تھا اگر وہ کامیاب تھا تو جو کچھ میں چاہتا تھا وہ ہو چکا تھا، اس لئے میں نے انسپکٹر سے کہا "آل رائٹ انسپکٹر — تم ذرا ایک منٹ کے لئے میرے ساتھ دوسرے کمرے میں چلو۔"

"کیوں؟"

"میں تنہائی میں تمہیں اپنی بے گناہی کا ایک ثبوت دکھانا چاہتا ہوں۔"

انسپکٹر کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا

"اچھا میرے ساتھ آؤ۔"

تجوری اسی طرح کھلی ہوئی تھی۔ اس میں رکھے لفافے نیچے بکھرے ہوئے تھے۔ قتل کئے جانے والا پستول بھی وہیں پڑا تھا۔

بڑی دیر کے بعد سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

"یہ کیا ہوا؟"

میں نے راہل کی جانب دیکھا۔

"کم از کم مدن کے قتل کا الزام مجھ پر نہیں لگ سکتا۔ راہل نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"تم نے فون پر کہا تھا کہ تجوری میں ان لوگوں کے ناموں کے لفافے تھے جن کو مدن بلیک میل کرتا تھا۔"

میں نے جواب دینے کے بجائے آگے بڑھ کر لفافوں

میں سے توشی کے نام کا لفافہ نکالا اور اس کے اندر رکھا
فوٹو اور سرٹیفکیٹ دکھایا۔ یہ چیزیں غور سے دیکھنے کے بعد راہل
نے کہا۔
"بس تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ یقیناً کوئی ایسا آدمی
مدن کو قتل کر گیا ہے جس کو وہ بلیک میل کرتا ہوگا۔ ہاں یاد
آیا تم نے کہا تھا کہ میرے نام کا لفافہ بھی ان میں موجود ہے۔
میں حیران ہوں کہ میرے بارے میں مدن نے کیا معلومات
اکٹھی کر رکھی تھیں اور اگر اسے میرے کسی جرم کا پتہ بھی تھا تو
اس نے مجھے اب تک بلیک میل کیوں نہیں کیا تھا۔"
میں نے دوبارہ سارے لفافے دیکھ کر کہا۔
"ان میں تو نہیں۔ ہو سکتا ہے مجھے مغالطہ ہو گیا ہو۔"
"میرا مشورہ ہے کہ جن لوگوں کے نام کے لفافے ہیں ان
سب کو بلا کر پوچھا جائے کہ آج دن بھر وہ کیا کرتے رہے ہیں۔"
راہل نے مشورہ دیا۔
"یہ بے کار ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ جس نے بھی
مدن کو قتل کیا ہے، وہ اپنے نام کا لفافہ یہاں چھوڑ کر نہیں
جا سکتا۔"
"یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے کہا اور
مجھے یقین ہے اس پستول پر سے انگلیوں کے نشانات بھی
صاف کر دیئے گئے ہوں گے۔ پستول بھی چوری کا ہونا چاہیئے
قاتل اگر چالاک تھا تو اپنے خلاف کوئی ثبوت چھوڑ کر نہیں گیا ہوگا۔"
اس کے بعد دو گھنٹے وہیں لگ گئے۔ پولیس کے
ماہرین بلائے گئے۔ لاشوں کو بھیجا گیا۔ اس دوران میں نے
سپرنٹنڈنٹ سے اجازت لے کر جاوید کو فون کر دیا تھا اور اس
کو ہدایت کر دی تھی کہ اب اس کو کیا کرنا ہے۔
دو گھنٹے بعد ہم پولیس سٹیشن واپس پہنچے تو توشی اور
راجندر کی لاشوں کی ڈاکٹری رپورٹ آ چکی تھی۔ اس بار
سب انسپکٹر پرشاد بھی پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔ اس
نے مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ رپورٹ
کے مطابق دونوں کی موت رات کو تین چار بجے کے درمیان
ہوئی تھی۔ جب کہ مجھے لاش کے ساتھ ساڑھے دس بجے دیکھا
گیا تھا، اس وقت تک لاش اکڑنے لگی تھی۔ انسپکٹر قریشی
اب میرے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ اس نے رپورٹ سپرنٹنڈنٹ
کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا۔
"اس سے مسٹر سنیل کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔
سر اس لیئے میں مسٹر سنیل کو رہا کیئے دیتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے سر ہلا دیا۔ اب یہ بات
اب صاف ہو گئی کہ توشی اور راجندر کو مدن نے قتل کیا تھا
اور مدن کو کسی نامعلوم آدمی نے قتل کر دیا۔"
راہل نے فوراً مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔
"مبارک باد مسٹر سنیل۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ پر
سے الزام ہٹ گیا۔"
میں نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور باہر کی طرف چل دیا
انسپکٹر قریشی میرے ساتھ ساتھ باہر تک آیا۔ باہر آ کر اس نے
کہا۔
"کیا آپ مطمئن ہیں؟"
"ہاں — میں نے جواب دیا۔ مگر اب ہمیں مدن کے
قاتل کی تلاش ہے۔ میں اب کارگی سے چند منٹ بات کرنا
چاہوں گا۔"
"ابھی آپ اپنی شخصیت ظاہر نہیں کرنا چاہتے؟"
"نہیں۔"
"تو آپ آدھے گھنٹے بعد آ جائیے۔ اس وقت تک یہ لوگ
چلے جائیں گے۔"
"او کے انسپکٹر۔ تھینکس۔"
یہ کہہ کر میں ایک طرف کو چل دیا۔

○

پندرہ بیس منٹ بعد ہی سپرنٹنڈنٹ پولیس اور راہل
وہاں سے چلے گئے تھے۔ میں پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے ہی
ایک کافی ہاؤس میں بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ان کے جاتے ہی
میں پولیس اسٹیشن میں واپس آ گیا۔ انسپکٹر قریشی نے کارگی کو
اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ مجھے آزاد دیکھ کر کارگی کا منہ کھلا رہ
گیا تھا۔ اس کے بعد جب انسپکٹر نے اس کو یہ بتایا کہ مدن
مر چکا ہے تو ایسا محسوس ہوا جیسے غبارے میں سے ہوا نکل گئی ہو
وہ بے جان سا ہو کر کرسی پر گر پڑا۔ کچھ دیر وہ سر پکڑے بیٹھا رہا
پھر سر اٹھا کر مرے ہوئے لہجے میں بولا
"کیا یہ سچ ہے کہ مدن اور ہارڈی مر چکے ہیں۔"
"قتل ہو چکے ہیں۔" میں نے جواب دیا "اور تمہاری
اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں بھی خفیہ پولیس کا افسر ہوں۔ میں
للت مہتہ کے قتل کی تحقیق کرنے آیا تھا۔ تم مدن کے ساتھی ہو
اس وقت اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو میں تمہاری سفارش
کر سکتا ہوں کہ عدالت تمہارے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کرے
دوسری صورت میں تم اپنا انجام سمجھ سکتے ہو۔"
"تم — تم پولیس افسر ہو۔" اس نے گھٹے ہوئے لہجے میں
کہا۔ "ہاں۔ ہمیں یہ شک تھا کہ یہاں کے پولیس افسر مدن

نے اپنے قابو میں کر لیے ہیں۔ اس لیے تحقیق کے لیے میں آیا ہوں۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ للت مہتہ کو کس نے قتل کیا تھا؟"

"وہ مجھے کچھ دیر گھورتا رہا۔ پھر بولا۔

"میرا خیال ہے ہارڈی نے قتل کیا تھا۔"

"صرف خیال ہے، یقین نہیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ مجھے ممبئی سے ہارڈی ہی یہاں لایا تھا۔ ایک طرح سے ہارڈی میرا باس تھا اور ہارڈی کا مدن تھا۔ مدن اس وقت تک کلب کا منیجر نہیں تھا۔ ہارڈی ان دنوں روز گاڑی میں مہتہ کا پیچھا کرتا تھا۔ للت مہتہ کے دفتر سے ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ میں گاڑی ڈرائیو کرتا تھا۔ ہارڈی پیچھے رہتا تھا۔

آٹھ دس دن ہم اس کا پیچھا کرتے رہے۔ پھر ایک دن جب ہم مارٹن روڈ کے قریب پہنچے تو ہارڈی نے گاڑی رکوا کر کہا۔

"تم گاڑی واپس لے جاؤ۔ میں آجاؤں گا۔"

میں گاڑی واپس لے گیا۔ اسی دن رات کو میں نے سنا کہ مہتہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ قتل ہارڈی نے کیا ہے۔"

وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

"کیا بعد میں تمہاری ہارڈی سے اس سلسلے میں کوئی بات ہوئی تھی؟"

"نہیں۔"

"تم مدن کو پہلے سے جانتے تھے؟"

"نہیں۔"

"مدن ہارڈی کو جانتا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ مجھے تو ہارڈی یہاں ساتھ لایا تھا۔ ہمارے آنے کے دس دن بعد ہی للت مہتہ کا قتل ہو گیا۔ اس وقت مدن کو میں نے نہیں دیکھا تھا، اس لیے مجھے پتا نہیں کہ پہلے سے وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے یا نہیں۔ ایک ماہ بعد جب مدن کلب کا منیجر ہو گیا تب ہارڈی نے مجھے مدن سے ملایا اور مجھ سے کہا کہ میں آئندہ مدن کے باڈی گارڈ کی طرح اس کے ساتھ رہوں گا۔"

"اور تم مدن کے ساتھ چوبیس گھنٹے رہتے تھے؟"

میں نے سوال کیا۔

"چوبیس گھنٹے نہیں جب تک وہ ضرورت محسوس کرتا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔"

"کیا مدن کبھی گلاس فیکٹری بھی جاتا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"کبھی گلاس فیکٹری میں کام کرنے والا کوئی مزدور یا یونین کا کوئی لیڈر ملنے آتا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ البتہ ایک بار میں نے ایک آدمی کو ہارڈی کے ساتھ دیکھا تھا۔ ہارڈی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ فیکٹری میں کام کرتا ہے۔"

"تم راجندر کو جانتے تھے؟"

"ہاں۔"

"وہ کس کے لیے کام کرتا تھا؟"

"پہلے مدن کے لیے اور پھر بعد میں اس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔"

"کیا راجندر کا فیکٹری سے یا فیکٹری کے کسی آدمی سے کوئی تعلق تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ البتہ ہارڈی، راجندر کی بہن کے یہاں اکثر جاتا رہتا تھا۔"

اس کمرے میں بھی فون تھا۔ میں نے انسپکٹر سے کہا۔

"کیا میں ایک فون کر سکتا ہوں؟"

"کس کو؟"

"ایک دوست کو جو میری بے گناہی کا ثبوت لیکر آئے گا۔"

"اچھا کرلو۔"

میں نے فون اپنی جانب سرکا کر جاوید کے ہوٹل کا نمبر ملایا جاوید میری ہدایت کے مطابق کمرے ہی میں تھا۔ میں نے جاوید سے کہا۔

"جاوید۔ میں اس وقت پولیس سٹیشن میں ہوں۔ پولیس نے مجھے قتل کے جرم میں گرفتار کر رکھا ہے۔ میں اب انسپکٹر قریشی کو اپنے کاغذات دکھا رہا ہوں، لیکن ممکن ہے یہ مجھ پر اعتبار نہ کریں۔ اس لیے تم ایک گھنٹہ میرا انتظار کرنا۔ اگر ایک گھنٹے تک میں واپس نہ پہنچوں تو تم ملٹری ہیڈ کوارٹر کو فون کر دینا اور جنرل سیکو کو ٹرنک کال پر حالات بتا دینا۔ میرا خیال ہے یہاں پولیس کا پورا ڈیپارٹمنٹ بے ایمان اور لالچی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ مجھے قتل کرنے کی کوشش کریں۔ ان حالات میں تم خود سمجھ سکتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔ میری گفتگو سن کر انسپکٹر کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہو گئے تھے اور اس کی آنکھوں میں خوف کی ہلکی سی جھلک نظر آنے لگی تھی۔

"یہ تم نے کس کو فون کیا تھا؟" اس نے پوچھا۔ "اور تم

کون ہو؟"

میں نے اپنے اصلی کاغذات نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

وہ کچھ دیر کاغذات دیکھتا رہا پھر میری جانب بے اعتباری سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن تم نے اپنا نام سینل مہتہ بتایا تھا؟"

"وہ میرا کور ہے۔"

"کیا ثبوت ہے کہ یہ کاغذات جعلی نہیں۔؟"

"کوئی ثبوت نہیں۔ تم فون پر میری گفتگو سن چکے ہو ایک گھنٹے کے اندر اندر اگر میں یہاں سے نہ گیا تو پولیس کا پورا محکمہ ملک سے غداری کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے گا۔"

"ملک سے غداری!" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ـــ یہ معاملہ صرف بے ایمانی اور رشوت خوری کا نہیں۔ انسپکٹر اس ملک میں غیر ملکی جاسوسوں کی کوئی زبردست تنظیم کام کر رہی ہے جو ملک کے ایک اہم پراجیکٹ کو تباہ کر دینا چاہتی ہے۔ اس تنظیم کو چھپانے کے لئے دوسرے ہولناک جرم کئے جاتے ہیں تاکہ حکومت کی نظر اصل سازش پر نہ پڑ سکے"

"اوہ ـــ اگر یہ سب کچھ ہے اور یہ کاغذات ٹھیک ہیں تو آپ میرے افسر ہیں کرنل۔"

"یہ تمہارے لئے یہ آخری موقعہ ہے انسپکٹر۔ اس وقت اگر تم نے میرے ساتھ تعاون کیا تو تم اپنا انجام سوچ سکتے ہو۔"

"او کے کرنل میں آپ پر بھروسہ کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھے باقاعدہ سیلوٹ دیا۔ میں نے سیلوٹ کا جواب دے کر اپنے کاغذات جیب میں رکھے اور کہا۔

"ابھی تم میرے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گے اور یہاں سے نکل کر تم مجھے ساتھ لے کر مدن کو گرفتار کرنے جاؤ گے۔"

"او کے سر ـــ" انسپکٹر نے جواب دیا۔

ہم باہر آئے ـــ انسپکٹر نے اپنے دوسرے ماتحت کو جیپ گاڑی لانے کو کہا۔

اسی وقت راہل کٹاریہ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اندر داخل ہوئے راہل نے کہا۔

"میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کو تلاش کر کے لے آیا ہوں مسٹر سینل۔ میں نے تمہیں آخری چانس دینے کیلئے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ مسٹر مدن کو گرفتار کر لیں۔ مسٹر مدن ایک معزز شہری ہیں۔ اگر تمہارا الزام غلط ثابت ہو گیا تو تم جانتے ہو تمہارا کیا حشر ہوگا؟"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میں ساتھ چلنا چاہوں گا۔"

میری بات منظور کر لی گئی اور ہم جیپ گاڑیوں میں سوار ہو کر بلو نائٹ کلب کی طرف چل دیئے۔

مدن کے آفس میں ابھی تک روشنی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو سپرنٹنڈنٹ نے دروازے دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔

ہم سب اندر داخل ہوئے۔ لیکن اندر کا منظر دیکھتے ہی ہر شخص حیران رہ گیا۔ اندر صوفے پر مدن کی لاش پڑی تھی اور اس کے برابر میں ہی اس پولیس والے کی لاش پڑی تھی جس کو انسپکٹر قریشی مدن کی دیکھ بھال کے لئے چھوڑ گیا تھا

"کیا وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"کبھی تم نے ہارڈی سے اس بارے میں نہیں پوچھا؟"

"نہیں۔"

"اور کوئی ایسی بات تم بتا سکتے ہو جس کا تعلق گلاس فیکٹری سے ہو؟"

"نہیں ـــ؟"

میں نے انسپکٹر کو مخاطب کر کے کہا۔

"انسپکٹر ـــ آپ اس کو واپس بھیج سکتے ہیں، میرا انٹرویو ختم ہوا"

انسپکٹر نے گارگی کو واپس بھجوانے کے بعد مجھ سے سوال کیا۔

"آپ بار بار فیکٹری کے بارے میں کیوں سوال کر رہے تھے ـــ؟"

"اس لئے کہ فیکٹری دراصل گورنمنٹ کا ایک اہم ریسرچ سینٹر ہے جس کو تباہ کرنے کے لئے غیر ملکی جاسوس سازش کر رہے ہیں۔ فیکٹری کی حفاظت کے لئے محکمہ انٹیلی جنس اور سیکرٹ سروس کے آدمی اندر رہتے ہیں۔ اس وقت تک گیارہ ایسے آدمی قتل ہو چکے ہیں۔"

"اوہ۔" انسپکٹر قریشی نے کہا "آپ کا خیال ہے للت مہتہ کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

"یہ صرف شبہ ہے، کیونکہ فیکٹری میں گڑبڑ للت مہتہ کی موت کے بعد ہی شروع ہوئی ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو گارگی کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ غیر ملکی جاسوس ہارڈی اور مدن تھے۔"

"ہاں اس کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہے۔"

"کیا آپ کو اطمینان نہیں ہوا؟"
"نہیں۔"
"کیا آپ کو کسی اور پر شبہ ہے؟"
"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"
"کس چیز کا؟"
"کسی حادثے کا۔ اگر مستقبل میں کوئی حادثہ پیش نہیں آتا تو میں سمجھوں گا کہ مجرم صرف پارڈی اور مدن تھے۔ جس کا مجھے یقین اس لیے نہیں آتا کہ غیر ملکی جاسوس اتنی آسانی سے قتل نہیں ہو سکتے تھے۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔
انسپکٹر نے کہا "ایسا لگتا ہے آپ کچھ چھپا رہے ہیں"
"ہاں۔" میں نے ... کہا۔ "ابھی میں اپنے شکوک ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ جلد ہی جب کوئی فیصلہ کن ثبوت مل جائے گا پھر میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ فی الحال میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں واپس چل دیا۔

O

مجھے جاوید کے فون کا انتظار تھا کیوں کہ میں نے اس کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی۔ میں اپنے کمرے پر انتظار کر رہا تھا۔ رات کا کھانا بھی میں نے کمرے پر ہی منگا لیا تھا۔ آخر دس بجے فون آ گیا۔ اس نے کہا۔
"پہلی بار وہ گھر سے نکلا ہے۔"
"تم اس وقت کہاں سے بول رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "میں گارڈن روڈ سے بول رہا ہوں۔ وہ ابھی ابھی ایک تین منزلہ عمارت میں داخل ہوا ہے۔"
گارڈن روڈ کا ذکر سن کر میرا دل زور سے اچھلا۔ میں نے کہا۔
"کیا عمارت کا نمبر ۱۳/ سی ہے؟"
"جی ہاں یہی ہے۔ کیا آپ یہاں کسی کو جانتے ہیں؟"
"شاید۔ تم وہیں رہو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔"
"اور اگر وہ یہاں سے چل پڑے۔"
"تو تم اس کا پیچھا کرنا۔"
"او کے۔" جاوید نے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔
میں اسی وقت روانہ ہو گیا۔ پندرہ منٹ بعد میں ۱۳/ سی کی بلڈنگ سے کچھ فاصلے پر اتر گیا۔ اس عمارت میں راجندر کی تلاش میں یہاں آ چکا تھا۔
میں نے سیٹی سگنل دیا۔ فوراً ہی سگنل کا جواب ملا۔ اس کا مطلب تھا جاوید ابھی وہیں تھا۔ میں نے سیٹی بجا کر دوسرا سگنل دیا جس کا مطلب تھا کہ اس کو میرے قریب آنے کی ضرورت نہیں۔
عمارت کے باہر ایک سیاہ پیکارڈ کھڑی تھی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ اور زینے سے اوپر چڑھنے لگا۔ ابھی میں دوسری منزل تک ہی پہنچا تھا کہ اوپر سے ایک عورت اترتی نظر آئی۔
"اوہ ہیلو۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" عورت نے مجھے دیکھ کر کہا۔
وہ پرمیلا تھی۔ اس کو وہاں دیکھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا
"ارے یہ تم ہو۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"
"میں یہیں رہتی ہوں۔"
"راجندر کی بہن کے ساتھ؟"
"نہیں۔ اس کے برابر ہی میرا چھوٹا سا فلیٹ ہے کیا تم مجھ سے ملنے آئے ہو؟"
"ہاں۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"
"مگر تمہیں میرا پتہ کیسے معلوم ہوا؟"
"مدن نے مجھے تمہارا پتہ بتایا تھا۔" میں نے جواب دیا
"کیا تمہیں معلوم ہے کہ مدن قتل ہو چکا ہے؟"
"اسی لیے اس وقت میں یہاں ہوں۔ کلب بند ہو گیا ہے۔"
"راجندر کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں۔"
"بس تو مجھے اپنے فلیٹ میں لے چلو۔ میں تمہارے وقت کی پوری پوری قیمت دوں گا۔"
وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی۔ پھر بولی۔
"آل رائٹ۔ آ جاؤ۔"
میں اس کے ساتھ اس فلیٹ میں داخل ہوا۔ یہ صرف ایک کمرے کا فلیٹ تھا۔ باہر کی طرف بالکونی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد پوچھا۔
"کیا راجندر کی بہن کا فلیٹ بھی اتنا ہی بڑا ہے؟"
"نہیں اس کے پاس تین کمروں کا فلیٹ ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہے۔"
"وہ کیا کرتی ہے؟"
"کچھ بھی نہیں۔"
"پھر فلیٹ کا کرایہ کہاں سے دیتی ہے۔ کھاتی کہاں سے ہے؟"
"اس سے ایک دولت مند اور با عزت آدمی محبت کرتا ہے وہ اس کا خرچ چلاتا ہے۔"

میں نے جیب سے سو سو کے دو نوٹ نکال کر اس کو دیتے ہوئے کہا۔
"یہ تمہارے وقت کی قیمت ہے پرمیلا۔ میں تمہاری بالکونی سے ہو کر راجندر کی بہن کے فلیٹ میں داخل ہونا چاہتا ہوں"
"کیوں۔ کیا تم چوری کرو گے ؟" اس نے سہم کر کہا۔
"نہیں۔ میں پولیس افسر ہوں۔ اگر تمہیں یقین نہ آئے تو تم انسپکٹر قریشی کو فون کر کے معلوم کر سکتی ہو۔ میرا اصل نام ناہد ہے۔ ہمیں ایک ملک کے دشمن جاسوسوں کی تلاش ہے۔ اس وقت میری مدد کر کے تم اپنے ملک کی خدمت کرو گی۔"
"اوہ گاڈ ۔۔۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ "کیا یہ سچ ہے ۔۔ ؟"
"سو فی صدی۔"
"تو کیا کامنی دشمن ہے ؟"
"کیا کامنی راجندر کی بہن کا نام ہے۔" میں نے پوچھا۔
"ہاں۔"
"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم مجھے اس کے فلیٹ میں جانے دو ۔۔ اور اگر تم چاہو تو انسپکٹر قریشی کو اپنے کمرے میں بٹھا لو۔"
"وہ مجھے کچھ دیر حیرانی سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی
"کیا تم اس آدمی پر شبہ کر رہے ہو جو کامنی کا عاشق ہے۔"
"میں نے کہا نا کہ ابھی میں کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے جواب دیا۔
"کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کون ہے ؟"
"ہاں ۔۔"
"تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ابھی ابھی کامنی سے ملنے آیا تھا ۔۔ ؟"
"اوہ ۔۔ مگر یہ ناممکن ہے۔ یہ بالکل ناممکن ہے۔"
"میں جانتا ہوں تم یہ بات کیوں کہہ رہی ہو۔ لیکن تمہیں ابھی تجربہ نہیں۔ غیر ملکی جاسوس عام جرائم پیشہ لوگوں کی طرح نہیں ہوتے ۔۔۔ وہ بہت ذہین اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ ان کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو ہر قسم کے شکوک سے دور رکھتے ہیں۔ عام طور پر ایسے جاسوس اعلیٰ عہدوں پر ہوتے ہیں یا نامور غنڈوں کی شکل میں رہتے ہیں تاکہ ان کی اصلی شخصیت چھپی رہے۔"
"میرے لئے یہ ساری باتیں عجیب ہیں۔" پرمیلا نے جواب دیا۔ "لیکن تمہاری باتوں میں مجھے سچائی نظر آتی ہے اس لئے تم جس طرح چاہو میرا فلیٹ استعمال کر سکتے ہو۔"

"تھینکس ۔۔ میں نے اس کا شانہ تھپک کر کہا
"یقین رکھو تمہیں پچھتانا نہیں پڑے گا ۔۔ کیا تم میرے لئے ایک کام اور کر سکتی ہو ؟"
"بولو کیا ہے ؟"
میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ جاوید سامنے والی عمارت کے سائے میں کسی جگہ چھپا ہوا تھا۔

میں نے پرمیلا سے کہا
"دیکھو۔ وہاں سامنے والی عمارت کے نیچے جا کر بلند آواز سے کہنا "ریڈ فلاور"۔
یہ نام سن کر ہی ایک آدمی آڑ سے نکل کر تمہارے سامنے آجائے گا۔ اور تم سے پوچھے گا۔ گلاب کہاں ہے۔ تم اس سے کہنا گلاب اوپر تمہارا انتظار کر رہا ہے ۔۔۔ یہ سن کر وہ تمہارے ساتھ آجائے گا۔ اس کو تم یہاں لا کر بٹھا دینا اور یہ بتا دینا کہ میں برابر والے فلیٹ میں ہوں"۔
"وہ کون آدمی ہے؟" پرمیلا نے پوچھا۔
"وہ میرا ساتھی ہے"۔
اور یہ جملے جو تم نے مجھے بتائے ہیں "کوڈ الفاظ ہیں۔ میں نے کئی فلموں میں جاسوسوں کو اسی طرح کے بے معنی کوڈ استعمال کرتے دیکھا ہے"۔
"ہاں یہ کوڈ تھے"۔
"بس اب تو مجھے یقین آگیا کہ تم واقعی جاسوس ہو"۔
"اب تم جاؤ۔ اس کا نام جاوید ہے"۔
وہ جاوید کو بلانے چلی گئی اور میں بالکونی کے جنگلے پر چڑھ کر کامنی کے فلیٹ کی بالکونی میں کود گیا۔
خوش قسمتی سے اس کا دروازہ کھلا تھا۔ اور اس کمرے میں کوئی نہیں تھا لیکن اندر سے کسی کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے لیا اور دبے قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے باہر والے دروازے کے پاس جا کر میں رک گیا۔
وہ دونوں برابر والے کمرے میں تھے۔ یہاں سے میں ان کی باتیں بھی سن سکتا تھا اور چابی کے سوراخ سے جھانک بھی سکتا تھا۔
پہلی آواز جو میں نے سنی وہ کامنی کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی
"۔۔۔ مجھ سے محبت کرتے تھے اور تم نے میرے بھائی کو قتل ہونے دیا۔ تم اسے نہیں بچا سکے۔ جبکہ تم جانتے تھے کہ میرا ایک ہی بھائی ہے"
"سوری کامنی ۔۔۔ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا"۔ یہ شہر کے نئے، رحم دل، نیک اور ایمان دار میئر راہل کٹاریہ کی آواز تھی۔
میں نے چابی کے سوراخ سے جھانک کر دیکھا۔ وہ دونوں کمرے کے بیچ ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔
"میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا"۔ کامنی نے اس کو منہ چڑا کر غصے سے کہا "جب کہ میں آج تک تمہارے جرائم چھپاتی چلی آرہی تھی۔ اور تم میرے بھائی کو نہیں بچا سکے۔ تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟ کیونکہ میں تمہاری داشتہ ہوں۔ تمہارے ٹکڑوں پر پل رہی ہوں۔ لیکن راہل میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں، میں چاہوں تو ایک منٹ میں تمہیں گرفتار کرا سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں فون پر پراسرار پیغام ملتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم گلاس فیکٹری میں کوئی سازش کر رہے ہو"۔
"کامنی ۔۔۔!" اس بار راہل کی آواز میں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی۔
"اب تم میری زبان نہیں روک سکتے۔ تمہیں یہ ضرور حیرت ہوگی کہ مجھے تمہارا یہ راز کیسے معلوم ہوا۔ تم نے میرے فلیٹ پر فون اسی لئے لگوایا تھا کہ تم اپنے گھر کے فون پر اس طرح کی باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ ایک روز میں نہانے گئی تھی۔ اچانک مجھے کچھ یاد آگیا اور میں نہائے بغیر ہی آگئی۔ یہاں کمرے میں تم کسی کو فون کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے
"اس کو راستے سے ہٹا دیا گیا ہے۔ فیکٹری میں اگلے ہفتے ہڑتال شروع ہو جائے گی"۔
اس وقت میں نے فیکٹری میں ایک آدمی کے قتل ہونے کی خبر پڑھی اور ایک ہفتے بعد ہی ہڑتال ہو گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم فیکٹری کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہو۔ اس کے بعد میں جب کبھی تمہیں اکیلا چھوڑ کر جاتی تو بیچ میں آکر دیکھتی تھی کہ تم فون کر رہے ہو یا نہیں ۔۔۔ تین چار بار تمہاری باتیں سننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ تم کسی دشمن ملک کے جاسوس کے ساتھی ہو جو فون پر تمہیں ہدایت دیتا ہے اور کسی وجہ سے فیکٹری کو بند کرانا چاہتا ہے۔
ایک طرف تو تم اپنے ملک سے غداری کر رہے تھے اور دوسری طرف مجھ سے اور میرے بھائی سے کھیل رہے تھے۔ راجندر کو تم نے مدن سے ملوایا تھا۔ راجندر نے تمہارے لئے وہ پستول چرایا تھا جس سے تم نے للت مہتہ کو قتل کیا تھا ۔۔۔ اور راجندر قتل ہونے لگا تو تم خاموش بیٹھے رہے۔ تم نے میرے گھر کو اپنی جاسوسی کا اڈہ بنا یا ۔۔۔ اگر تم کسی وقت پکڑے جاؤ تو میں بھی تمہاری ساتھی ہونے کے جرم میں پھانسی پر چڑھا دی جاؤں۔ کان کھول کر سن نواب ایسا نہیں ہو گا ۔۔۔"
"آل رائٹ کامنی اب ایسا نہیں ہو گا"۔ راہل کی گمبھیر آواز سنائی دی۔ یہ بات اس نے جیب سے پستول نکال کر کامنی کو نشانہ بناتے ہوئے کہی تھی۔ "تم واقعی احمق ہو کامنی۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے کہ بلی کا تجسس ہی اس کی موت کا سبب بنتا ہے تمہارا تجسس تمہاری موت کا سبب بن رہا ہے"۔
کامنی کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔ اس نے

ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"قاتل۔ اب تو مجھے بھی مار ڈالنا چاہتا ہے۔"

"مجبوری ہے — اپنی موت تم نے خود بلائی ہے۔ مجھے راجندر کی موت کا افسوس ہے۔ لیکن اس کا مرنا ہی اچھا تھا۔ کیونکہ وہ بزدل تھا اور کسی وقت بھی زبان کھول کر مجھے پھنسوا سکتا تھا۔ مدن بے وقوف تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے مجھے مٹھی میں لے رکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ہارڈی کے ذریعے اس کو استعمال کر رہا تھا۔ اس کا مصرف ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کو میں نے خود قتل کر دیا ہے۔ ہارڈی بھی ضرورت سے زیادہ حالات جان چکا تھا، اس لئے اس کی موت بھی ضروری تھی اور اب تم نے خود ہی تسلیم کر لیا ہے کہ تم میرا اسرار جانتی ہو جو مجھے پھانسی چڑھوا سکتا ہے۔ اس لئے اپنی زندگی کے لئے تمہاری موت ضروری ہے۔ تمہیں قتل کرنے کا مجھے واقعی افسوس ہوگا کیونکہ مجھے تمہارا جسم پسند تھا۔ تمہاری موت کے بعد کوئی ایسا شخص نہیں رہے گا جس کی جانب سے مجھے کسی قسم کا خطرہ ہو۔"

یہ کہہ کر اس کے پستول والے ہاتھ کو جنبش ہوئی۔ کامنی خوف زدہ ہو کر چلائی۔

راہل کی آنکھوں میں اس وقت موت ناچ رہی تھی۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول دیا اور جیسے ہی اس کا ہاتھ فائر کرنے کے لئے آگے بڑھا میں نے فائر کر دیا۔ میری گولی اس کے ہاتھ میں لگی۔ اس کے ہاتھ سے پستول دور جا پڑا۔ منہ سے ایک چیخ نکلی گھبرا کر اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ کامنی بھی مجھے حیرت سے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"تم —" راہل نے کہا۔

"میں تمہاری ساری باتیں سن چکا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تمہاری اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ میں سنیل مہتہ نہیں ہوں بلکہ میرا نام کرنل زاہد ہے۔ میں محکمہ انٹیلی جنس سے تعلق رکھتا ہوں۔ تم جانتے ہو گلاس فیکٹری میں اہم ریسرچ ہو رہی ہے جب فیکٹری میں ہمارے دس ایجنٹ ایک ایک کر کے قتل ہو گئے اور بے وجہ ہڑتالیں ہونے لگیں تو ہمیں یقین ہو گیا کہ دشمن ملک کے کچھ جاسوس سازشیں کر رہے ہیں۔ میں اسی جاسوس کی تلاش میں سنیل مہتہ بن کر یہاں آیا تھا۔

اتفاق سے اس شہر میں میری پہلی ملاقات ایک بوڑھے سے ہوئی اس نے مجھے بتایا کہ اس شہر کے ذمہ دار لوگوں میں سے ایک تم ہی ایماندار ہو۔ اسی لئے کل رات میں تمہارے پاس گیا تھا مجھے یقین ہے کہ میرا فون کا پیغام بھی تمہیں مل گیا ہوگا لیکن تم جان بوجھ کر نہیں آئے کیونکہ تم چاہتے تھے کہ مدن راجندر اور توشی کو قتل کر دے۔ پھر جب میں دوبارہ تم سے ملا اور میں نے تمہیں بتایا کہ راجندر اور توشی قتل ہو چکے ہیں۔ تم فوراً مدن، ہارڈی اور گارگی کو گرفتار کر لیتے تو تمہیں ہارڈی کو قتل کرنے کا ایک اور موقع مل گیا۔ [illegible] فوراً چل دیئے۔ بوٹ ہاؤس تم پولیس کو لے کر نہیں گئے بلکہ اکیلے گئے تاکہ بے موت ہارڈی اور گارگی کو قتل کر دو۔ تم وہاں پہنچے تو صرف ہارڈی تھا جسے تم نے قتل کر دیا۔ گارگی کو شاید پہلے ہوش آ گیا تھا اور وہ اٹھ کر بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد تم پولیس اسٹیشن گئے اور انسپکٹر قریشی کو لے کر دوسری بار بوٹ ہاؤس گئے تاکہ انسپکٹر اس کی لاش دیکھ کر یہ سمجھ لے کہ دراصل ہارڈی اور راجندر کو میں نے قتل کیا تھا اور اپنا الزام مدن پر ڈالنا چاہتا تھا۔ تم دراصل مجھ پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں تمہارے

اجنبی تھا۔ اس لیے مدن ہارڈی، راجندر کے ساتھ میرا ہٹایا جانا ضروری تھا۔ تم جانتے تھے کہ دس آدمیوں کے قتل کے بعد حکومت چین سے نہیں بیٹھے گی۔ کوئی جاسوس ضرور بھیجے گی۔ تم کسی اجنبی کی آمد کے منتظر تھے، اس لئے تم مجھ پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے ـــ مختصر یہ کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ بوٹ ہاؤس سے ہارڈی کی لاش ملی ہے، مجھے پہلی بار شبہ ہوا کہ تم نے ہارڈی کو قتل کیا ہے اور تم کوئی بڑا کھیل کھیل رہے ہو۔ اپنے اس شک کی تصدیق کے لئے میں نے ایک داؤ کھیلا۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا کہ مدن کی تجوری میں تمہارے نام کا بھی ایک لفافہ ہے تم فوراً مدان کو جا کر گرفتار کرا دو۔

تمہیں اپنے نام کا لفافہ کا سن کر حیرت ہوئی ہو گی۔ کیونکہ ہارڈی کے ذریعے تم مدن کو استعمال کر رہے تھے۔ پھر بھی تم کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ دوسرے مدن کا مصرف ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے پہلے تم نے جا کر مدن کو قتل کر دیا۔ مدن کے ساتھ ایک پولیس مین بھی تھا، اس لیے اس کو بھی قتل کرنا پڑا۔ پھر لفافوں کو دیکھ کر اطمینان کرنے کے بعد تم پولیس سپرنٹنڈنٹ کو لے کر پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ بھلا مدن کی لاش ملنے کے بعد کون سوچ سکتا تھا کہ شہر کا میئر ایک جرائم پیشہ کو قتل کرنے لگا۔

جب میں نے مدن کی لاش دیکھی تو مجھے یقین ہو گیا کہ جس آدمی کی مجھے تلاش ہے وہ تم ہی ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے اسسٹنٹ کو تمہاری نگرانی پر لگا دیا۔ دن بھر وہ تمہاری نگرانی کرتا رہا۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے اس نے مجھے فون کیا کہ تم یہاں ہو۔ میرے ساتھی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اس مکان میں کون رہتا ہے۔ میں راجندر کی تلاش میں یہاں آ چکا تھا۔ اور جانتا تھا کہ راجندر کی بہن یہاں رہتی ہے۔ میرے ساتھی نے جب یہاں کا پتہ مجھے بتایا تو میں سمجھ گیا کہ تم راجندر کی بہن سے ملنے آئے ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اتنے قتل کرنے کے بعد تم کوئی خاص قدم ضرور اٹھاؤ گے۔ چنانچہ میں فوراً یہاں چلا آیا۔ اتفاق سے راجندر کی پہلی محبوبہ پرمیلا سے میرا تعارف ہو چکا تھا۔ وہ مجھے زینے پر مل گئی۔ اس کے فلیٹ سے ہو کر میں یہاں داخل ہوا تو مجھے تمہاری باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ...."

راہل نے اچانک چھلانگ لگائی اور وہ کامنی کے پیچھے چلا گیا۔ اس نے کامنی کو آڑ بناتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اس عورت کی زندگی چاہتے ہو تو پستول نیچے ڈال دو۔"

یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ میں بھی بے بس ہو گیا۔

"تم اس طرح بچ نہیں سکتے۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"فی الحال تو میں بچ کر جا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کامنی کو اپنے سامنے کئے پیچھے ہٹنے لگا۔ میں اس وقت کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے ایک ہاتھ سے کامنی کو تھاما اور دوسرے ہاتھ سے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ کامنی اس قدر خوف زدہ ہو گئی تھی کہ وہ بت کی مانند ہو گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی اور ہپناٹائز کئے انسان کی طرح راہل کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹ رہی تھی۔

راہل نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا۔

دروازہ کھلتے ہی ایک ہاتھ پستول لئے اندر آیا اور پستول کا دستہ راہل کے سر پر پڑا۔ راہل کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑا۔

یہ جاوید تھا۔ جاوید نے اندر داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بھی بالکونی سے اندر آ گیا تھا اور آپ کی باتیں سن لی تھیں۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ شخص عورت کو آڑ بنا کر فرار ہونا چاہتا ہے تو میں بالکونی سے پھر دوسرے دروازے میں گیا۔ باہر آ کر دروازے پر کھڑا ہو گیا کیونکہ اس کو فرار ہو کر اسی طرف جانا تھا۔"

"شاباش جاوید ـــ تم واقعی کھوٹے سکوں کی طرح وقت پر کام آ جاتے ہو۔ اب ذرا پولیس ہیڈ کوارٹر میں انسپکٹر قریشی کو فون کر دو۔"

جاوید فون کرنے لگا اور میں رسی تلاش کرنے لگا۔ تاکہ راہل کے ہاتھ پاؤں باندھ سکوں۔